CERTIFICATE

Certified that Miss Nasim Ara Saeed D/o Mr. Saeed Ahmed has carried out research on the topic: "اردو صرف و نحو کے تجزیات" under my supervision and that her work is original and distinct, and that her ~~work~~ dissertation is worthy of presentation to the University of Sind for the award of the Degree of Doctor of Philosophy in Urdu.

[signature]

(Dr. Najmul Islam)
Associate Professor,
Dept. of Urdu, S.U.

Supervisor.

اردو صرف و نحو کے تغیّرات

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی

۲۰ جون ۱۹۸۵ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر نجم الاسلام ایم اے پی ایچ ڈی
الیسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی

مقالہ نگار

نسیم آرا سعید

قلمی نام

سعدیہ نسیم

شعبۂ اردو۔ سندھ یونیورسٹی۔ جام شورو

فہرست

مقدمہ

باب اول: اسم ۱

اسم خاص ۱

اسم کیفیت ۷

اسم فاعل ۱۲

اسم موصول ۱۶

اسم اشارہ قریب ۲۴

اسم اشارہ بعید ۲۹

باب دوم: ضمیر ۳۴

ضمیر شخصی واحد و جمع غائب ۳۴

ضمیر واحد و جمع حاضر ۵۰

ضمیر واحد و جمع متکلم ۷۱

ضمیر واحد غائب کی غیر فاعلی صورتیں ۸۰

ضمیر واحد متکلم کی مفعولی صورت ۸۵

ضمیر جمع متکلم کی مفعولی صورت ۹۳

ضمیر واحد و جمع متکلم کی اضافی حالت ۹۹

ضمیر واحد غائب کی مغیرہ صورت ۱۰۴

باب سوم: فعل ۱۰۸

ماضی مطلق ۱۰۸
ماضی معطوفہ ۱۱۶
فعلِ امر ۱۳۳
فعلِ مضارع ۱۴۷
فعلِ حال تا
فعلِ مستقبل ۱۸۳
فعلِ معاون ۱۸۴

باب چہارم: حرف ۱۹۳

علامتِ فاعل 'نے' کا مطالعہ ۱۹۳
مجروری 'سے' کا مطالعہ ۲۲۱
علامتِ مفعول 'کو' کا مطالعہ ۲۴۶
ظرفی 'میں' کا مطالعہ ۲۶۲
حرفِ ربط 'تک' کا استعمال ۲۸۳
ظرفی 'پر' کا استعمال ۳۰۱
حروفِ اضافت ۳۱۱

باب پنجم: متفرق نحوی قاعدے ۳۲۱

'نے' کے نحوی استعمالات ۳۲۱

فعل اور فاعل کی مطابقت ۳۴۴

مضاف اور مضاف الیہ کی مطابقت ۳۵۷

صفت اور موصوف کی مطابقت ۳۷۱

جمع کا قاعدہ ۳۷۴

مباحث کا خلاصہ ۳۹۳

کتابیات ۴۱۹

مقدمہ

اس مقالے کا مقصد اردو کے صرفی و نحوی ارتقا یعنی صرف و نحو میں عہد بعہد ہونے والے تغیرات کا ایک تحقیقی جائزہ ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ گردشِ لیل و نہار نے مختلف ادوار میں اردو کے صرفی و نحوی اصولوں میں کیا کیا تغیرات کیے۔ نیز یہ تغیرات اپنے اپنے زمانوں میں بہتری کی طرف قدم تھے یا تنزل کی طرف۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان کبھی ایک حالت پر قایم نہیں رہتی۔ یہ انسانوں کے عادات و اطوار، ماحول اور سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ برابر بدلتی رہتی ہے۔ کبھی یہ تبدیلی تیزی کے ساتھ رونما ہوتی ہے اور کبھی تغیرات کی رفتار نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ زبان اپنی فطرت میں تغیر پذیر ہے۔ اس تغیر کی زد میں صوتی تبدیلیاں بھی آتی ہیں۔ ترکیب الفاظ پر بھی زمانے کی رو اپنا اثر ڈالتی ہے اور صرف و نحو میں بھی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ صوتی تبدیلیوں کا تفصیلی جائزہ سر دست ہمارا مقصد نہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ صرف و نحو میں رونما ہونے والے عہد بعہد تغیرات کا تاریخی ترتیب کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے۔

کسی زبان کے صرفی و نحوی نشوونما یا ارتقا کا باقاعدہ یا سائنٹی فِک مطالعہ ماہرینِ لسانیات کے نزدیک ایک اہم لسانی موضوع رہا ہے۔ زبان ایک نامیاتی شے ہے۔ تغیر پذیری اس کی فطرت ہے۔ ماہرینِ لسانیات یہ دیکھتے ہیں کہ اس تبدیلی کی نوعیت کیا ہے؟ آیا اس کو ترقی کہیں یا تنزل۔ نیز اس نوع کے مطالعے سے کسی زبان کے آغاز و ارتقا پر یا اس زبان کے مزاج و منہاج پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ مزید برآں، اس سے کسی زبان کی خصوصیات کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے۔ یہ سوالات تشفی بخش طور پر کسی زبان کے صرفی و نحوی ارتقا کے تحقیقی جائزے کے بعد ہی حل کیے جا سکتے ہیں۔

لسانیات کے مشہور عالم اوٹو یسپرسن نے اپنی کتاب "Language, its Nature, Development and Origin" میں اس سلسلے میں مفید بحثیں کی ہیں جن کی روشنی میں کسی زبان کے صرفی و نحوی ارتقا یا عہد بعہد تغیرات کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے۔

اردو کے ماہرینِ لسانیات میں اس موضوع پر سب سے پہلے شوکت سبزواری صاحب نے قلم اٹھایا۔ ضمنی طور سے انھوں نے اپنی کتاب "داستانِ زبانِ اردو" میں اور نسبتاً تفصیلی انداز میں

II

اپنے تحقیقی مقالے "اردو زبان کا ارتقا" میں بحث کی ہے۔ شوکت صاحب نے جدید ماہرین لسانیات کی تحقیقات کی روشنی میں اردو کے صرفی و نحوی نشو و نما سے متعلق بعض نہایت مفید تصریحات کی ہیں۔ لیکن چونکہ صرفی و نحوی نشو و نما ان کے مطالعے کا بنیادی مقصد نہیں تھا لہٰذا اس موضوع پر تفصیلی تحقیقی جائزے کی ضرورت تھی۔

اردو کے صرفی و نحوی اصول و قواعد میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوئیں۔ شیرانی اسے زبان کے قواعد میں ابتری و برہمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن زبانوں میں اس قسم کی ترمیمات و تغیرات کے بارے میں، جدید دبستان لسانیات کا امام اوٹو یسپرسن اسے زبان کی برتری، تفوق اور اصلاح کی ایک اچھی اور صحت مند علامت قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل سوال جس کی کوئی اہمیت ہے یہ ہے کہ زبان میں تغیر کا رخ ترقی کی طرف ہے یا تنزل کی طرف؟ زبان روپ بدل کر آگے بڑھتی ہے یا پیچھے ہٹتی ہے؟ اس میں ابتری و برہمی رونما ہوتی ہے یا برتری و ہمواری؟ یسپرسن کہتا ہے کہ مختلف زبانوں کے تاریخی ارتقا کے جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صرفی و نحوی اصول کے لحاظ سے زبان کا عام و فطری میلان ہے کہ وہ ابتری سے برتری کی طرف قدم بڑھائے اور ناہمواری (chaos) سے ہمواری (cosmos) کی طرف۔ یسپرسن کے نزدیک قریب قریب ہر زبان میں تبدیلی کا رخ سادگی اور آسانی کی طرف ہے۔ چنانچہ آریائی زبانوں کے قدیم ادوار کا جدید ادوار سے مقابلہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ زبان کے جدید ادوار کی صرفی شکلیں مختصر، کم تر، سادہ، باقاعدہ اور کسی قدر عام ہیں۔ موجودہ مقالے میں اردو کے صرفی و نحوی تغیرات کا تاریخی ترتیب کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے لسانی شواہد حاصل کیے گئے تو یسپرسن کی رائے کی تصدیق ہوئی۔

اس مقالے کا مقصد یہی جائزہ لینا ہے کہ جس وقت سے اردو ادب دستیاب ہوتا ہے اس کی قواعد صرف و نحو میں وقتاً فوقتاً کیا تغیرات واقع ہوئے ہیں اور ان کا رخ تنزل کی طرف رہا ہے یا ترقی کی طرف۔ ان اصولوں میں ابتری و برہمی پیدا ہوگئی ہے یا برتری، تفوق، اصلاح اور انضباط۔ اس کے اصول طویل، پیچیدہ اور بے قاعدہ ہوئے ہیں یا مختصر، سادہ، کم تر اور آسان سے آسان تر۔ البتہ ان تغیرات کے اسباب و علل، ان کی اصل اور ماخذ کا پتہ لگانا ہمارے موضوع میں شامل نہ تھا۔ تاہم اصل و ماخذ کے تعین کے بغیر چونکہ یہ بحثیں تشنہ محسوس ہوئیں لہٰذا اس سلسلے میں دوسرے لسانیین کی آرا کا اندراج مناسب سمجھا گیا۔

تاکہ اردو کے جن صرفی و نحوی تغیرات سے بحث کی گئی ہے ان کی ایک مکمل تاریخ سامنے آسکے۔

اردو قواعد پر اس سے پیشتر بہت سی کتابیں تصنیف یا تالیف کی گئیں۔ ان کتابوں کا مقصد بالعموم اردو قواعد کے اصولوں کا مطالعہ، ان کا عملی استعمال اور ان اصولوں کا انضباط تھا۔ گویا یہ وضاحت کرنا پیشِ نظر ہوتا تھا کہ اردو زبان کی قواعد کن اصولوں پر مبنی ہے۔ اس میں اسم، فعل، حرف، ضمیر، صفت وغیرہ کسے کہتے ہیں اور ان کے استعمال کا کیا طریقہ ہے۔ جملوں میں ان کی ترتیب کس اصول کے تحت کی جاتی ہے۔ ان کی تقدیم و تاخیر سے کیا ردوبدل یا تغیر عمل میں آتا ہے۔ پھر یہ کہ اگر کوئی لفظ اسم ہے تو کس قسم کا اسم ہے۔ نکرہ یا معرفہ؟ اگر معرفہ ہے تو معرفہ کی کون سی قسم سے اس کا تعلق ہے یعنی خطاب، کنیت، عرف یا لقب وغیرہ۔ اگر فعل ہے تو لازم ہے یا متعدی۔ یا متعدی المتعدی؟ اور یہ کہ زمانے کے اعتبار سے اسے کس زمانے کے تحت شمار کیا جائے گا؟ اگر حرف ہے تو اسے حرف کی کس قسم میں رکھا جائے؟ آیا حرفِ ربط، عطف، تخصیص یا فجائیہ؟ اگر ضمیر ہے تو اسے ضمیر کی کس قسم میں شمار کیا جائے؟ ضمیر موصولہ، ضمیر شخصی، استفہامیہ، اشارہ یا تنکیر؟ اگر صفت ہے تو صفتِ ذاتی ہے یا نسبتی؟ عددی یا مقداری؟ الغرض اسی قسم کی بحثیں اور توضیحات، اردو قواعد نویسوں کا موضوع رہا ہے۔ بعض قواعد نویسوں نے اس زبان کی قواعد کے بعض اصولوں کے رواج و انضباط کے زمانے کا تعین بھی کیا ہے۔ بعض نے ان کے ماخذ سے کہیں سرسری اور کہیں تفصیلی اور تحقیقی انداز میں بحث کی ہے۔

ہمارا موضوع ان سے مختلف نوعیت کا حامل ہے۔ یہ "اردو قواعد نویسی کی تاریخ" نہیں بلکہ "اردو صرف و نحو" کے عہد بعہد تغیرات کا جائزہ ہے۔ لہٰذا اس میں صرف ان امور کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کسی اسم، فعل، حرف یا ضمیر وغیرہ کی صورت اردو ادب کی دستیاب ابتدائی تحریروں میں کیا تھی اور اس میں عہد بعہد کیا تغیرات رونما ہوئے؟ یا مثلاً کسی حرف یا لفظ کی ایک سے زاید لغات مستعمل رہیں۔ یہ استعمال کب سے کب تک نظر آتا ہے؟ کس دور میں جا کر ان میں سے کوئی ایک صورت برقرار رکھی جاتی ہے اور باقی کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تائیدی لسانی شہادتوں کا اندراج کیا گیا ہے۔

اس مطالعے کو دکنی اور شمالی ہند کے اردو ادب تک محدود رکھا گیا ہے۔ شمالی ہند کے اردو ادب کا جائزہ بھی صرف اس دور تک لیا گیا ہے جب کسی لفظ یا حرف کی صورت یا استعمال، واضح طور پر متعین ہو گئی اور اس کے بعد

شعرا اور اُدبا حضرات اس کی پابندی کرنے لگے ہوں۔

اردو پاس پڑوس کی بولیوں میں سے ہریانی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی سے بہت مشابہہ ہے۔ ان کے الفاظ کا بیشتر سرمایہ ایک جیسا ہے۔ صرفی نحوی قاعدوں میں بڑی حد تک یکسانی ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی، راجستھانی اور اودھی سے بھی اردو بہت کچھ ملتی ہے۔ اردو کو ان بولیوں اور زبانوں سے جن لفظی، صوتی، صرفی اصول و سرمائے کی بنا پر ممتاز و مختلف زبان سمجھا جاتا ہے وہ اردو کی لسانی خصوصیات ہیں۔ اردو کے آغاز کی دریافت اور زبان و ادب کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے اردو کی ان لسانی خصوصیات کا علم بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اردو کی حسبِ ذیل خصوصیات شمار کرائی ہیں:-

۱۔ کا۔ کی۔	اضافت کے لیے	جیسے	حامد کا گھوڑا۔ محمود کی کتاب۔
۲۔ سے۔	علامتِ جر و آلہ	جیسے	لاٹھی سے مارا۔ گھر سے روانہ ہوا۔
۳۔ میں۔ پر۔	ظروف کے لیے	جیسے	گھر میں - کوٹھے پر۔
۴۔ نا۔	علامتِ مصدر	جیسے	کرنا - پڑھنا۔
۵۔ تا۔	علامتِ حالیہ ناتمام) و فعلِ حال	جیسے	چلتا پرزہ۔ وہ دوڑتا ہے۔
۶۔ ے ا۔	علامتِ حالیہ تمام و فعلِ ماضی	جیسے	کھلا (کھلا ہوا)۔ جلا۔ رہا وغیرہ۔
۷۔ گا۔	علامتِ استقبال	جیسے	جائے گا۔ پڑھے گا۔
۸۔ س۔	اسمائے عامہ میں غیر فاعلی حالت کی علامت	جیسے	اُس (وہ)۔ جس (جو) کس (کون) اِس (یہ)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس میں ذیل کی خصوصیات کا اور اضافہ کیا ہے:-

۹۔ کو۔	علامتِ مفعول	جیسے	حامد نے محمود کو مارا۔
۱۰۔ نے۔	علامتِ فاعل		
۱۱۔ تک۔	علامتِ جر و آلہ	جیسے	گھر تک۔
۱۲۔ وں۔	اسمائے مطلقہ میں غیر فاعلی حالت کی جمع۔	جیسے	بچوں نے لڑکے کو مارا۔

موجودہ مقالے میں اردو کی ان لسانی خصوصیات کے عہد بعہد تغیرات کا تاریخی ترتیب و توضیح کے ساتھ

جائزہ لیا گیا ہے۔ جب سے اردو میں یہ خصوصیات پیدا ہوئیں اس نے دوسری بولیوں سے الگ ایک زبان کی حیثیت حاصل کی۔ اس سے پہلے اردو دوسری بولیوں سے ممتاز نہ تھی۔ اس میں اور دوسری بولیوں میں خطِ فاصل نہیں کھینچا جا سکتا تھا۔ ان خصوصیات کا ابھرنا اور نمایاں ہونا اردو کی ابتدا یا اس کا آغاز ہے۔

زبانوں کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ جن میں سے ایک زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے۔ گرد و پیش اور خاص طبعی حالات کے زیرِ اثر زبان کے صوتی اور صرفی و نحوی سرمائے میں تراش خراش ہوتی رہتی ہے۔ لسانیات کی اصطلاح میں اسے بحتِ صوتی (Phonetic Decay) کہتے ہیں۔ اردو علامتِ اضافت 'کا' اور 'را' کو لیجیے۔ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے اس کی کسی قدیم ترین شکل (اپ بھرنش) میں 'کار' اور 'کیر' (سنسکرت کاریہ) علامتِ اضافت کے طور پر مستعمل تھے۔ چند بردائی کی پرتھی راج راسو کی زبان قدیم کھڑی بولی یا قدیم اردو کی معاصر زبان ہے۔ اس میں 'کیرا' اور 'کیری' (کا اور کی کے معنے میں) عام طور سے استعمال ہوئے ہیں۔ ہیم چندر نے "کیر" کا ذکر کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر بھنڈارکر یہ لفظ اپ بھرنش میں ملکیت یا تعلق ظاہر کرتا تھا۔ کبیر داس اور تلسی داس کے یہاں "کیر" کی جگہ "کر" اور "کیری" ہے۔ 'کیر' اور 'کیری' کا سراغ دکنی اردو میں بھی ملتا ہے۔ دکنی میں 'کیرا' بھی استعمال ہوا ہے جو جمع کی صورت میں 'کیرے' ہو جاتا ہے وہاں یہ لغات ایک تسلسل کے ساتھ 'کا' اور 'کی' کے پہلو بہ پہلو استعمال ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری 'کا' اور 'را' کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو 'کا' اور 'را' قدیم "کار" اور "کیر" سے بحتِ صوتی کے زیرِ اثر بنے اور اب یہ اردو کے ہیں۔ اردو کے مخصوص سرمائے میں شمار ہوتے ہیں اور اردو کو اس کی ہمسر بولیوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ یہ کلمے 'کار' اور 'کیر' کی شکل میں پہلے بھی موجود تھے اور قدیم اردو کے ساتھ اس کی معاصر بولیوں قدیم برج اور گجراتی وغیرہ میں مستعمل تھے۔ جب اردو کا روپ نکھرا اور اس کے خط و خال ابھر کر نمایاں ہوئے تو 'کار' 'کیر' وغیرہ قدیم الفاظ زبان کی خراد پر چڑھ کر 'کا' اور 'را' کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ آج 'کا' اور 'را' وغیرہ صورت بدلے ہوئے الفاظ کو دیکھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ 'کار' اور 'کیر' سے ڈھلے ہیں۔

اردو میں حروفِ اضافت کے تغیرات کا لسانی قواعد کی روشنی میں جائزہ لیا گیا تو یہ حقیقت واضح

ہوئی کہ اردو کے قدیم ترین دستیاب نمونوں میں کیرے، کیرا، کیری اور کیرے کے پہلو بہ پہلو 'کا' اور 'کی' کا وجود بھی ملتا ہے گویا دستیاب نمونوں کے اعتبار سے 'کا' اور 'کی' اور یہ دوسری لغات ہم زمانہ ہیں۔ اگر یہ ایک دوسرے سے ماخوذ ہوتیں تو کسی ایک کا وجود (یعنی ماخذ کا) مٹ چکا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ عرصۂ دراز تک دونوں قسم کی لغات ساتھ ساتھ استعمال ہوتی رہیں حتیٰ کہ اردو میں کیرا، کیری، کیرے وغیرہ کو متروک کر دیا گیا اور 'کا' اور 'کی' کو برقرار رکھا گیا۔ جس سے یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ دونوں قسم کی لغات کے ماخذ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح 'را' کا وجود بھی دستیاب نمونوں میں زمانۂ قدیم سے کیرا اور کیری کے ساتھ ساتھ موجود رہا ہے چنانچہ میرا، میری، ہمارا، ہماری، تمہارا، تمہاری کا استعمال ان نمونوں میں موجود ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ 'کیرا اور کیری' سے کسی قدیم دور میں (جس کے نمونے ہمیں دستیاب نہیں ہیں) 'را' اور 'ری' کو الگ کر لیا گیا جو اضافی حالت میں ضمائر پر بطور لاحقہ اضافہ کر کے استعمال کیا گیا چنانچہ میرا، میری، تیرا، تیری، تمہارا، تمہاری، ہمارا، اور ہماری، وجود میں آئے۔ دوسرے یہ کہ اردو 'کا' کا ماخذ سنسکرت 'کا' क ہے جو تانیث کی صورت میں یائے تانیث کے اضافے سے 'کی' ہو جاتا ہے اور چونکہ قدیم دکنی جمع بنانے کے سلسلے میں بے قاعدگی کا اظہار کرتی ہے چنانچہ وہاں دوسرے اسما و حروف کے علاوہ حرفِ اضافت برائے مونث کی جمع بھی "اں" کے اضافے سے بنائی گئی۔ یہ صورت کسی ایک آدھ جگہ نہیں بلکہ دکنی میں نہایت تسلسل کے ساتھ 'کی' کی جمع "کیاں" استعمال کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ "حروفِ اضافت" کی ذیل میں نہ صرف ان تمام استعمالات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں بلکہ ان کے ماخذ سے بھی بحث کی گئی ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ زبان کے مخصوص سرمائے کا، جس کی بنا پر زبان کی انفرادیت اور اس کی آزاد جداگانہ شخصیت کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے ٹھیک اسی طرح تجزیہ کرنے کے بعد اس کے اصل و ماخذ نیز آغاز کی بابت کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا فیصلہ علمی ہوگا اور اسے لسانیاتی اور حکمیاتی بنیادوں پر استوار کیا جائے گا۔ یہی ہمارا موضوع ہے یعنی اس مخصوص سرمائے کے تغیرات کا لسانی شواہد کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے ماہرینِ لسانیات نے ان کے ماخذ کے سلسلے میں جو بحثیں کی ہیں ان کا حسبِ ضرورت مختصر یا تفصیلی طور پر احاطہ کر لیا جائے تاکہ اردو کے آغاز کی ایک صحیح اور مکمل صورت سامنے آ سکے اور ارتقا واضح ہو جائے۔

زبان بحث صوتی کے زیر اثر برابر ترشتی تراشتی رہی۔ اس کا میلان تخفیف، تسہیل، سادگی اور اختصار کی جانب رہا۔ قواعد میں بھی اختصار اور انضباط آ تا گیا۔ لیکن جہاں تخفیف کا عمل نہ ہوا وہاں ابدال کا عمل ہوا۔ یعنی ایک آواز کا دوسری آواز سے بدل جانا۔ مثلاً "د" کا "ب"، ہو جانا (توُ - تب) یا "ک" کا "گ"، اور "گ" کا "ک"، سے بدل جانا جیسے لک۔ لگ۔ تلک۔ تلگ۔ چنانچہ جہاں جدا جدا دو مختلف کلمے دو زبانوں میں مستعمل ہوں وہاں یہ فیصلہ کہ ان میں سے کونسا کلمہ قدیم ہے اور کونسا جدید، ابدال کے قاعدوں کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ ابدال کے خاص خاص قاعدے ہیں جو ابدال کے رخ اور اس کے میلان کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ قاعدے مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اہل علم نے وضع کیے۔ ان قاعدوں کی مدد سے یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ دو مختلف کلمات میں سے اصل کون ہے اور کس نے کس کو جنم دیا۔ موجودہ مقالے میں جہاں ضرورت سمجھی گئی اس کا ذکر کر دیا گیا ہے

صوتی تغیرات اور ان کے اسباب و علل سے اردو میں محی الدین زور نے "ہندوستانی لسانیات" میں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "اردو زبان کا ارتقا" میں بحث کی ہے۔ انگریزی میں اوٹو یسپرسن نے اپنی تصنیف "Language, its Nature, Development & Origin" میں (دیکھئے صفحہ ۱۹۰ تا صفحہ ۲۴۷) اور لیونارڈ بلوم فیلڈ نے اپنی تصنیف "Language" (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹۲ تا صفحہ ۴۷۶) میں نہایت تفصیلی انداز میں صوتی تبدیلیوں کی نوعیتوں اور اسباب سے بحث کی ہے۔ صوتی تبدیلیوں اور ان کے اسباب و علل کا جائزہ ہمارے مقالے کا بنیادی مقصد نہیں تھا البتہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی ان کتب کی معلومات مدنظر رکھی گئیں۔

اردو زبان کے صرفی و نحوی تغیرات سے البتہ تفصیلاً بحث کی گئی ہے اور ماخذ کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر بھنڈارکر، ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی، ڈاکٹر زور، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے علاوہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جارج گریرسن، جان ٹی پلیٹس اور آر ایل ٹرنر وغیرہ کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مزید بحث و تمحیص کی اس سلسلے میں ضرورت اس لیے نہیں سمجھی گئی کہ ماخذ کا پتہ لگانا ہمارا موضوع نہ تھا، صرف بحثوں کی ایک زیادہ مکمل اور متعین صورت سامنے لانے کے لیے اس کا اضافہ کیا گیا۔ تغیرات کا جہاں تک سوال ہے یہ چونکہ بنیادی موضوع تھا لہٰذا اس پر زیادہ محنت صرف کی گئی ہے اور مستند لسانی شواہد کی روشنی میں بحثوں کو نتیجہ خیز بنایا گیا ہے۔ چند تغیرات کا یہاں اختصار سے اندراج کیا جاتا ہے

علامتِ فاعل "نے" کے سلسلے میں علمائے لسانیات نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ کسی کا کہنا تھا کہ "نے" علامتِ فاعل قدیم اردو ادب میں موجود نہیں تھا۔ کسی کا کہنا تھا کہ اردو ادب تو کیا قدیم ہندی میں بھی "نے" کا وجود نہیں۔ کسی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ "نے" "بطورِ علامتِ فاعل" کے قواعد سب سے پہلے ۱۷۷۸ء میں متعین ہوئے۔ جب کہ کسی کی رائے میں "نے" کے استعمال میں دکنی بہت بے قاعدہ تھی اور "نے" دکنی میں فاعل اور مفعول دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اردو ادب کے قدیم نمونوں کا جب ان آرا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا گیا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ "نے" فاعلی علامت کے طور پر اس وقت سے تسلسل کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے جب سے ہمیں نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ مفعولی علامت کے طور پر اس کا استعمال دکنی میں نہیں ہوا ہے۔ البتہ یہ تغیر ضرور سامنے آیا کہ بعض اوقات جہاں "نے" کا ذکر ضروری ہوتا تھا وہاں اسے حذف بھی کر دیا جاتا تھا جب کہ بعض ایسے موقعوں پر جہاں "نے" کے استعمال کی ضرورت نہیں ہوتی "نے" استعمال کیا گیا ہے۔ "نے" کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کے حذف کیے جانے کی مثالیں میر و مرزا کے عہد تک مل جاتی ہیں۔

حروفِ ربط میں سے ظرفی "میں" کو لیجیے۔ قدیم اردو میں اس سلسلے میں یہ تغیر دیکھنے میں آیا کہ "میں" کے ساتھ ساتھ اس کی مترادف لغات بھی مستعمل تھیں۔ مثلاً دکنی و گجراتی اردو میں "میں" کے علاوہ ماں، مانہہ، منہ، موں، مانیں، ماہیں، منے، مینں، مجہ، مجھار اور مجار وغیرہ استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض لغات شمالی ہند کی ابتدائی دور کی تحریروں میں بھی موجود رہیں۔ مثلاً اسمٰعیل امروہوی، فائز، تاباں اور فضلی وغیرہ کے یہاں ان میں سے چند لغات کا استعمال ہوا ہے۔ شمالی ہند میں ان کا استعمال دکنی اثرات کا نتیجہ تھا اور دکنی اردو میں یہ لغات آس پڑوس کی بولیوں سے راہ پاگئے تھے۔ شمالی ہند میں بھی کچھ عرصے ان میں سے چند لغات کا استعمال ہوتا رہا بالآخر یہ لغات متروک ہوگئیں اور اردو نے صرف "میں" کو برقرار رکھا جو اردو کی اپنی چیز تھی۔ لسانیین کے نزدیک یہ مختلف لغات ایک دوسرے سے ڈھلتے ہوئے بالآخر "میں" کی صورت اختیار کر گئیں لیکن لسانی شواہد اس کی تردید کرتے ہیں۔ مقالے میں ان لغات اور تغیرات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو ان کے اصل و ماخذ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

حروفِ ربط "تک" کو لیجیے۔ اس کی بھی مختلف لغات سامنے آئی ہیں۔ مثلاً تگ (بتشدید) تک (بلا تشدید)، لگن، لگوں اور سابقوں کے ساتھ تلک، جلگ، تلگ، جو لگن۔ تو لگن وغیرہ۔ اس سلسلے میں بھی بعض لسانیین کا خیال تھا کہ ایک دوسرے سے ارتقا پا کر بالآخر "تک" وجود میں آگیا۔ لیکن جب ان تغیرات کا تاریخی ترتیب کے ساتھ جائزہ لیا گیا

تو واضح ہوا کہ یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں۔ کیونکہ مترادف لغات کے ساتھ ساتھ تک اور تلک کا استعمال بھی موجود رہا ہے۔ جو آج بھی بالکل اسی طرح استعمال ہو رہا ہے جب کہ دیگر لغات متروک ہو گئیں۔

ضمائر میں، واحد غائب کے لیے "وو" (وہ) اور جمع غائب کے لیے "وے" دیکھنے میں آیا۔ یہ استعمال دکن اور شمالی ہند میں ایک عرصے تک رہا چنانچہ غالب تک کے یہاں اس کی مثال مل سکتی ہے۔ لیکن ایک دور میں ان میں سے صرف ایک کا استعمال متعین ہو گیا اور واحد و جمع غائب دونوں صورتوں میں "وہ" استعمال ہونے لگا۔ ضمیر جمع متکلم میں "ہم" کے علاوہ ہموں، ہمناں، ہموں وغیرہ دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ بھی ایک دوسرے سے ڈھل کر ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے "ہم" نہیں بنے بلکہ "ہم" کا وجود دستیاب ادب میں بالکل ابتدا ہی سے ہے اور اب تک اسی طرح استعمال ہو رہا ہے جب کہ دوسری لغات جو پاس پڑوس کی بولیوں سے در آئی تھیں متروک ہو گئیں۔ "تم" کے ساتھ تمن، تمنا اور تموں وغیرہ مستعمل رہیں اور بعد میں صرف "تم" برقرار رہا جو آج بھی استعمال ہو رہا ہے دوسری لغات متروک ہو گئیں۔ اضافی صورت میں میرا، میری، ہمارا، ہماری۔ تمہارا، تمہاری۔ قدیم نمونوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ایک تغیر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جس طرح قدیم اردو میں (بالخصوص دکنی میں) حرفِ اضافت برائے مونث کی جمع بھی استعمال ہوئی ہے اسی طرح ایک آدھ مقام پر "میری" کی جمع "میریاں" بھی استعمال ہوئی ہے۔ شمالی ہند میں بھی یہ قاعدہ منقود نہ تھا چنانچہ میر کے یہاں "ہماری" کی جمع "ہماریاں" بنائی گئی ہے۔ بعد میں ضمیر کی جمع بنانے کا یہ طریقہ متروک ہو گیا۔

اس قسم کے تغیرات زیادہ تر دکنی و گجراتی اردو میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ شمالی ہند کی اردو میں یہ صورت نہیں۔ جو تھوڑے بہت تغیرات ہوئے بھی وہ بھی دکنی اثرات کا نتیجہ تھے۔ کیونکہ شمالی ہند میں شاعری کی ابتدا دکنی اثرات کے تحت ہوئی لہٰذا تقلید و تتبع کے سبب دکنی کی بعض خصوصیات بھی یہاں کی ابتدائی دور کی اردو شاعری میں راہ پا گئیں جب کہ نثر میں یہ تغیرات اور بھی کم ہوئے۔ بحیثیت مجموعی شمالی ہند کی اردو اپنی اصل سے قریب رہی اور جو تھوڑے بہت دکنی اثرات اس میں در آئے تھے وہ بھی "تحریکِ اصلاحِ زبان" کے تحت دور کر دیے گئے۔

زبان میں اصلاح کا جہاں تک تعلق ہے یہ احساس بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا کہ زبانِ دکن، زبانِ دہلی سے بعض خصوصیات میں مختلف ہے چنانچہ جب ولی دکن سے دہلی آئے تو سعد اللہ گلشن نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی شاعری میں زبانِ دہلوی کی پیروی کریں۔ اصلاحِ زبان کے سلسلے میں جو کوششیں شروع ہوئیں ان میں خان آرزو،

مرزا مظہر جانِ جاناں اور حاتم کا ذکر سر فہرست ہے۔ ان حضرات نے دہلی کی مروج اردو زبان کو دکنی اثرات سے پاک کیا اور اسے روزمرۂ دہلی سے قریب لے آئے۔ حاتم نے ذیل کے الفاظ متروک قرار دیے:۔

(۱) در، بر، از، و دیگر الفاظ و افعالِ فارسی۔

(۲) الفاظِ ہندی مثلاً نین و جگ و بنت و بسر۔

(۳) سیتی و ستی۔

(۴) اودھر۔ کیدھر۔ ایدھر۔

(۵) یاں۔ واں۔

حاتم نے سیتی و ستی کی جگہ "سے" اختیار کیا، اودھر، ایدھر اور کیدھر میں ایک حرف زائد محسوس کرتے ہوئے انہیں اِدھر، اُدھر، کدھر لکھنے پر زور دیا۔ یاں اور واں کی جگہ یہاں اور وہاں کو ترجیح دی۔ تبی کو تبھی، جمی کو صحیح، بگانہ کو بیگانہ، دوانہ کو دیوانہ، مرض بسکونِ اوسط کو مَرَض (بفتح اوسط) لکھا۔ (مقدمہ دیوان زادہ صفحہ ۱۰)۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

"... و بعضے از معاصران شاہ مبارک آبرو و شرف الدین مضمون و مرزا جانِ جاناں مظہر و شیخ احسن اللہ و میر شاکر ناجی و غلام مصطفٰے یکرنگ است و لفظ "در" و "بر" و "از" کہ فعل و حرف باشد، بقول شاہ مبارک آبرو:

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے ۔۔۔ اُن ستی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف ۔۔۔ لغو ہیں گے فعل اس کے، ریختے میں حرف ہے

بندہ در دیوانِ خود تقیید دارد در ہیں دہ دوازدہ و دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ۔ لسانِ عربی و زبانِ فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ دہلی کہ مرزایانِ ہند و فصحایِ رند در محاورہ دارند منظور داشتہ۔ زبانِ ہر دیار تابہ ہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف کردہ، محض روزمرۂ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمودہ۔ شمۂ ازاں الفاظ کہ تقیید دارد بہ بیان می آرد: چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تقیع را تبی و صحیح را صحی، و بیگانہ را بگانہ، و دیوانہ را دوانہ و مانند آں بطورِ عامہ، یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک: چنانچہ مَرَض را مرض، و غَرَض را غرض، و مانند آں، یا الفاظِ ہندی کہ نین و جگ و بیت و بسر وغیرہ آنچہ باشد با لفظ مارو موا و ازیں قبیل کہ ہر خود قباحت لازم آید یا بجائے سے ستی (یا سیتی) یا اُدھر را اودھر و کدھر را کیدھر کہ

درآں زیادتی حرف باشد یا بجائے "سپر" "سپہ" یا "یہاں" "رایاں" و "وہاں" "راواں" (و ہر ایک را ہر یک) کہ در نخج

تنگ بود یا کسرہ و فتح و ضم در ثانیہ ..... الخ"

تقریباً یہی حال میر و مرزا کی اصلاحات کا ہے۔ مصحفی و انشا نے بھی اس جانب توجہ کی۔ انشا نے نہ صرف محاورہ و الفاظِ فصیح و غیر فصیح کی تشریح و تفصیل بیان کی ہے بلکہ اس کے اصولوں کو بھی صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک اگرچہ شاہجہاں آباد کی اردو، مستند اور فصیح ہے لیکن یہاں بھی بڑا نازک فرق ہے مثلاً دہلی میں ہی مغلپورہ کے رہنے والے "باتیں" کے بجائے "باتاں"، "تلواریں" کے بجائے "تلواراں"، "ٹھائیں" کے بجائے "ٹھائیاں"، "مٹھیں" کے بجائے "مٹھیاں"، "میرے تئیں" (کہ فصیح اس کو "مجھے" بولتے ہیں) کے بجائے "مجھ کنے" (تئیں)، "تجھ تئیں" بجائے "تیرے تئیں" (کہ فصیح اس کو "تجھے" بولتے ہیں)، "ہم تئیں" بجائے "ہمارے تئیں" (کہ فصیح اس موقع پر "ہمیں" بولتے ہیں) استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح "اس طرف"، "مجھ طرف"، "آپ طرف" بجائے "اس کی طرف"، "میری طرف"، "آپ کی طرف"، کے استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح یہ لوگ "دل" "کہ" علامتِ اضافت ہے ہمیشہ حذف کر دیتے ہیں۔ انشا کے اس بیان سے واضح ہوا کہ جلوۂ خضر میں صفیر بلگرامی نے متروکات کی جو فہرست دی ہے ان میں سے اکثر الفاظ و محاورے جن کا ترک ہونا ناسخ کے دور سے منسوب کیا جاتا ہے، ان سے پہلے خود دہلی میں ٹکسال باہر سمجھے جانے لگے تھے اور ان کے استعمال کرنے والے غیر ثقہ محلہ کے لوگ تھے۔

مصلحین شعرا کی اصلاح کا دائرہ الفاظ و مرکبات تک محدود رہا۔ چنانچہ میر و مرزا نے عربی و فارسی کے ان الفاظ کو ترک کیا جن میں شعری ضرورت کی بنا پر کسی قسم کا ناجائز یا مستعمل زبان کے خلاف کوئی تصرف ہوا تھا۔ مثلاً متحرک کو ساکن یا ساکن کو متحرک، مشدد کو مخفف، مخفف کو مشدد، مذکر کو مونث، مونث کو مذکر باندھا گیا تھا۔ یا ان کا تلفظ اصلی زبان کے تلفظ کے مطابق نہ تھا۔ ان میں کوئی حرف کم یا زیادہ کر لیا گیا تھا۔ یا وہ الفاظ پنجابی، یا دکنی یا پوربی سے اردو میں آئے تھے اور اردو نہ بنے تھے۔ یا ان کی شکل اور تلفظ اس سے مختلف تھا جس شکل اور تلفظ کے ساتھ وہ دہلی کی زبان میں رائج تھے۔ ان اصلاحات میں مزید اضافہ ناسخ کے دور میں ہوا۔ البتہ ادب اردو کے تاریخی ترتیب کے ساتھ مطالعے سے یہ امر واضح ہوا کہ یہ متروکات بالکل اسی وقت سے ترک نہیں ہو گئیں جب مصلحین شعرا نے ان کے ترک کی تاکید کی بلکہ کچھ عرصے بعد تک ان کا چلن جاری رہا اور بتدریج متروک ہوا۔

اسی طرح لسانیین کے بعض ایسے نظریات مثلاً قدیم اردو میں "نے" علامتِ فاعلی کا وجود نہ تھا، جس کا ذ

پہلے کیا جا چکا ہے یا مثلاً یہ نظریہ کہ ماضی معطوفہ اول اول ناسخ نے "کر" لگا کر بنائی، لسانی شواہد ان نظریات کی تائید نہیں کرتے۔ ماضی معطوفہ ہی کو لیجیے۔ زبان میں یہ قاعدہ پہلے سے موجود تھا اردو کے قدیم ترین دستیاب نمونوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی "کر" استعمال کیا گیا اور کبھی حذف کر دیا گیا۔ جیسا کہ بعض دوسرے حروف کے سلسلے میں بھی ہوا۔ البتہ ناسخ نے پہلے پہل اس کے استعمال پر تاکید ضرور کی۔ یعنی انہوں نے یہ تعین کر دیا کہ اب ماضی معطوفہ "کر" لگا کر ہی بنائی جائے۔ تاہم اس کے بعد بھی عدم استعمال کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح ماخذ کے سلسلے میں بعض لسانیین کے نظریات کی دستیاب ادب سے تصدیق کے بجائے تردید ہوئی اور بعض مقامات پر بالکل نئی بات سامنے آئی۔ مثلاً کسی حرف یا لفظ کی مستعمل لغات ایک دوسرے سے ماخوذ ہونے کے بجائے اپنے الگ الگ ماخذ کی نشاندہی کرتی نظر آئیں۔ موجودہ مقالے میں اس قسم کی کئی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور لسانی شواہد و دلائل پیش کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض مسائل کے سلجھانے میں تقابلی لسانیات کا طریقہ اپنایا گیا۔ چنانچہ کسی لفظ، حرف یا قاعدے کا استعمال بعض دوسری ہم رشتہ یا معاصر یا مختلف زبانوں میں دیکھ کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔

صرفی تغیرات کے مقابلے میں زبان کے نحوی قاعدوں میں تغیر کم ہوا۔ مثلاً فعل و فاعل میں کوئی خاص ترتیب نہ تھی، فعل کہیں مقدم ہوتا اور کہیں موخر۔ اس سلسلے میں اگرچہ موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ فاعل، فعل سے پہلے ہو لیکن بعض اوقات فعل مقدم بھی لے آیا جاتا ہے۔ دکنی میں ایک تغیر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ فاعل و فعل میں مطابقت قایم رہتی ہے خواہ فعل لازم ہو یا متعدی۔ چنانچہ ایسے جملوں میں جن میں فاعل پر "نے" داخل کیا جاتا ہے موجودہ قاعدے کے مطابق، فعل کا تعلق فاعل سے منقطع ہو جاتا ہے اور مفعول کے ساتھ قایم ہو جاتا ہے۔ دکنی میں ایسا نہیں۔ اس کے برعکس فعل اپنے فاعل ہی کا تابع رہتا ہے۔ اسی طرح مغیر فاعلی حالت میں فاعل پر حروف میں سے کوئی حرف داخل ہو جانے کے باوجود بعض اوقات دکنی میں جملے کی ترتیب پر کوئی اثر نہیں واقع ہوتا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً اہل دکن کو (دکن کے اردو شعراء و اُدباء کو) اس بات کا احساس نہ تھا کہ بعض حروف عاملہ ہیں اور ترتیبِ جملے پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً نے، کو، سے وغیرہ۔

مضاف و مضاف الیہ کی تقدیم و تاخیر بھی روا تھی لیکن اس معاملے میں سب بے قاعدگی نہ تھی زیادہ

مثالیں قاعدے کے مطابق یا یوں کہنا چاہئے کہ اردو کی اصل قدیم پراکرت کے مزاج کے مطابق ہیں اور یہی قاعدہ عام رائج ہے کہ مضاف الیہ، مضاف پر مقدم ہوتا ہے۔ صفت موصوف کے سلسلے میں یہ تغیر نظر سے گزرا کہ موصوف اگر جمع مونث ہو تو صفت بھی اس کی مطابقت میں جمع مونث استعمال کی جائے گی۔ جس طرح کسی جملے میں اگر فاعل جمع مونث آئے تو اس کی مطابقت میں فعل امدادی کے ساتھ ساتھ فعلِ اصلی کو بھی جمع مونث لے آتے تھے۔ جب کہ موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ فاعل جمع مونث ہو تو فعل اصلی واحد رہتا ہے اور اس پر فعل امدادی جمع لایا جاتا ہے۔ اسی طرح صفت موصوف کا موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ موصوف جمع مونث ہو تو صفت واحد ہی آتی ہے۔ صفت موصوف میں جو تغیر دیکھنے میں آیا اس کی مثالیں میر و سودا کے دور تک مل جاتی ہیں۔

جمع کے سلسلے میں جو قاعدے قدیم اردو میں دیکھنے میں آتے ہیں ان میں کہیں فارسی کی طرح اسم پر "ان" کے اضافے سے جمع بنائی گئی ہے، کہیں "وں" کے اضافے سے اور کہیں "یں" کے اضافے سے۔ اردو میں آج بھی انہی لاحقوں کی مدد سے جمع بنائی جاتی ہے مثلاً گواہی سے گواہیاں، مچھلی سے مچھلیاں۔ لڑکی سے لڑکیاں۔ عورتیں آتی ہیں۔ بطخیں تیرتی ہیں۔ عورتوں نے کہا۔ مردوں نے لکھا وغیرہ۔ لیکن اس سلسلے میں دکنی میں تغیر اس لیے نظر آتا ہے کہ دکنی بعض ایسے اسما کی جمع بھی "ان" کے اضافے سے بنا لیتی تھی جو اب روا نہیں۔ مثلاً بات کی جمع باتاں (بجائے باتیں) عورت کی جمع عورتاں (بجائے عورتیں) مرد کی جمع مرداں۔ یہی نہیں بلکہ دکنی اس سلسلے میں اتنی بے قاعدہ ہے کہ وہاں ہر قسم کے اسم و حروف حتی کہ فعل کی بھی جمع بنالی جاتی تھی۔ چنانچہ حرفِ تشبیہ سی کی جمع سیاں، ایسی کی جمع ایسیاں، حرفِ اضافت برائے مونث واحد 'کی' کی جمع کیاں، فعل کی جمع کہتیاں، کرتیاں، پھرتیاں، چلتیاں وغیرہ۔ فعل امدادی تھی اور رہتی کی جمع تھیاں اور رہتیاں۔ 'گی' کی جمع گیاں۔ اس کے علاوہ اپنی کی جمع اپنیاں، کتنی کی کتنیاں، جیسی کی جیسیاں، سندری کی سندریاں وغیرہ دکنی میں عام طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ شمالی ہند کی اردو بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ میر و مرزا کے عہد تک بھی اس قسم کی بے قاعدگی کی مثالیں مل جاتی ہیں تاہم شمالی ہند کی اردو جمع کے قواعد میں دکنی کی طرح بہت زیادہ بے قاعدہ نہیں رہی۔ دکنی اثرات کے تحت جو بے قاعدگی اس میں راہ پا گئی تھی بعد میں متروک ہو گئی اور زبان زیادہ شستہ و رفتہ ہو گئی۔

قدیم اردو کے سلسلے میں لسانی شواہد کے حصول کا جہاں تک تعلق ہے بہت سے قدیم ماخذ کو دیکھا گیا

ان میں اگرچہ قدیم اردو الفاظ کے نمونے دستیاب ہوئے لیکن یہ بحث لغت سے تعلق رکھتی ہے اور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ تغیرات کے جائزے کے لیے اس مقالے میں جس قدیم اردو ادب کو بنیاد بنایا گیا وہ کچھ تو بزرگانِ دین کے قدیم اقوال و کلام پر مبنی ہے اور زیادہ تر اردو کی قدیم ترین مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اور اس کے بعد کی اردو تصانیف ہیں۔

صوفیوں اور بزرگوں کے اقوال کے سلسلے میں بالخصوص مولوی عبدالحق کی "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"، شمس اللہ قادری کی اردوئے قدیم، مولوی عبدالحق کی اردوئے قدیم، محی الدین زورؔ کی دکنی ادب کی تاریخ، عبادالله گیانی کی گرو گرنتھ اور اردو، سہیل بخاری کی اردو کی کہانی، وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم اردو کے نمونے شعرائے قدیم کے دواوین، کلیات اور قدیم نثری کتب سے لیے گئے ہیں جن کی فہرست کتابیات کے ذیل میں درج کر دی گئی ہے۔ تجزیاتی مواد کے حصول کے سلسلے میں جہاں تک ہو سکا اولین ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے اس سلسلے میں جہاں ممکن ہوا انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے سے بھی استفادہ کیا گیا۔ جس کے لیے میں جناب شبیر علی کاظمی (مرحوم) کی ممنون ہوں۔ اس کے علاوہ مخطوطات سے بھی مفید مطلب مواد اخذ کیا گیا جس کے لیے میں نیشنل میوزیم کراچی کے جناب مرزا نظام بیگ کی شکرگزار ہوں جو اس وقت مخطوطات سیکشن کے انچارج تھے اور جنہوں نے متعلقہ مخطوطات فراہم کرنے میں بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا۔

لسانی نتائج اخذ کرنے کے لیے قدیم متنوں کی ضرورت تھی جن میں اس دور کا املا بھی محفوظ رہ گیا ہو۔ مخطوطات سے اس سلسلے میں بڑی مدد ملی۔ مطبوعہ کتب میں املا محفوظ رکھنے کی کوشش ہمارے یہاں عام طور پر نہیں کی جاتی بلکہ بعض کتابیں جو ایڈٹ کی جاتی ہیں ان میں املا کی تصحیح کر دی جاتی ہے۔ جس سے بعض اہم لسانی شواہد ضایع ہو جاتے ہیں۔ البتہ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اس اعتبار سے بہترین انداز میں ایڈٹ کی گئی ہے کہ اس میں مطبوعہ متن کے ساتھ ساتھ مخطوطے کا عکس بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا یہ کام لائقِ تحسین ہے اور اس سے لسانی موضوعات پر کام کرنے والوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ خود مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ بعض موقعوں پر جب مطبوعہ متن سے صحیح نتیجہ یا دلایل و شواہد کی روشنی میں متوقع نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو اصل عکس میں املا دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جس سے بعض عقدے کھل گئے۔ اگر ہمارے یہاں کی قدیم

کتب اسی انداز پر ایڈٹ کی جائیں کہ ان کی عکسی نقول بھی ساتھ شامل ہوں تاکہ حتی الامکان املا محفوظ رہ سکے تو آئندہ لسانی موضوعات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک بہترین عطیہ ہوگیا۔ دہلی یونیورسٹی، دہلی کے شعبۂ اردو سے شائع ہونے والے ششماہی رسالے "اردوئے معلیٰ" کے "اردوئے قدیم نمبر" میں بھی اس قسم کی ایک کوشش نظر آتی ہے۔ اس کا مرتبہ ہیں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اس میں قدیم متنوں کو شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں "اردو کا قدیم نام ہوز" کے زیر عنوان جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں وہی قدیم املا دیا گیا ہے جو اس زمانے میں رائج رہا ہوگا۔ اس سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ کسی زمانے میں حروفِ علت کی جگہ صرف اعراب (زیر، زبر، پیش) سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً "دینے" کو دِن (نون مکسور) لکھا ہے۔ "بے" کو ب (ب مکسور)۔ اسی طرح قریب المخرج الفاظ املا میں ایک دوسرے سے بدل جاتے تھے جیسے "اِسی" کو "اِث" لکھا ہے۔

موجودہ مقالے میں جہاں تک ہوسکا اور دستیاب ادب نے جہاں تک رہنمائی کی، اسی کی روشنی میں املا کو اصل سے قریب تر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً بعض مقامات پر دیسے، کی ایک مترادف لغت "تھے" بھی مستعمل رہی لیکن کہیں اس کے بجائے "تھی" لکھا ہوا ملتا ہے لہٰذا اس میں کسی تصحیح کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ اسی طرح یہ املا نقل کر دیا گیا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس دور میں یائے معروف و مجہول میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ تصحیح کی ضرورت اس لیے نہ تھی کہ قدیم املا کو اصل صورت میں محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ کیونکہ تحقیق کے سلسلے میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ نئی نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں ممکن ہے املا کے ان نمونوں کے محفوظ رہ جانے کے باعث ان سے کچھ اور نتائج کا استخراج عمل میں آئے۔ اس تعلق سے جن مخطوطات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں املا کی صورت آج کے مروج املا سے مختلف نظر آئی۔ اس سلسلے میں "املا کے تغیرات" کے عنوان سے ایک باب شاملِ مقالہ کیا جا سکتا تھا جو اپنی جگہ ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہوتا لیکن اول تو یہ چیز ہمارے موضوع میں شامل نہ تھی دوسرے اس موضوع پر محترم و مکرم جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہٗ نے اپنی کتاب "علمی نقوش" میں "املا کی تاریخ" کے تحت تفصیل سے بحث کی ہے بعض دوسروں نے بھی اس موضوع کو اٹھایا تھا مثلاً عبدالستار صدیقی، مرزا غالب وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب نے ان بحثوں کا احاطہ کرتے ہوئے نہایت مفید اضافے کیے جن سے قدیم املا کی صحیح صورت سامنے آتی ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں جن مراحل سے گزرنا پڑا ان میں اولین مرحلہ خاکے کی تیاری کا تھا۔ ابتدائی خاکے کے سلسلے میں ڈاکٹر حبیب ضیاء کی "دکنی زبان کی قواعد" (مقالہ برائے پی ایچ ڈی)، حافظ محمود شیرانی کا مضمون جس میں انہوں نے "سب رس" کا لسانی تجزیہ کیا ہے (مقالات شیرانی جلد اول)، ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مطبوعہ مقالہ "اردو زبان کا ارتقا" مولوی عبدالحق کی "قواعد اردو"، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی "جامع القواعد" حصہ صرف، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی "جامع القواعد" حصہ نحو، اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے "کدم راؤ پدم راؤ" کے لسانی تجزیے کو پیش نظر رکھا گیا۔ لیکن کوئی مکمل صورت جس کے مطابق کام کیا جاتا تکمیل نہ پا سکی۔ تاہم ان سے جو معلومات حاصل ہوئی ان کے تحت قدیم اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا گیا تو مطالعہ سے حاصل ہونے والے لسانی شواہد اور ذہن میں ابتدا سے موجود خاکے کے نقوش ابھرنے شروع ہو گئے تا آنکہ ایک نقشہ ترتیب دیا جا سکا۔ مزید مطالعے کے بعد نقشے میں ترامیم اور اضافے ہوتے رہے۔ کام جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا خاکے کی صورت مزید متعین ہوتی گئی حتیٰ کہ جب کام تکمیل پا گیا تو خاکہ اپنی موجودہ صورت میں قرار پا گیا کہ اس میں نگراں کی حسب خواہش جامعیت اور اختصار پیدا ہو گیا۔ حشو و زوائد کاٹ چھانٹ کر ضروری معلومات کو مجتمع کر دیا گیا۔ اپنی موجودہ صورت میں یہ اردو صرف و نحو میں دور بہ دور ہونے والے تغیرات کی ایک تصویر ہے۔

مقالے کی ترتیب و تکمیل کے سلسلے میں بنیادی مشکل یہ تھی کہ مواد بکھری ہوئی صورت میں تھا جسے "صرف و نحو کے تغیرات" کے تحت ترتیب دینا تھا۔ چنانچہ کام کا دوسرا مرحلہ اس منتشر مواد کو سمیٹنا اور اس طور پر اس کا مطالعہ کرنا تھا کہ صرف و نحو کے اعتبار سے جو تغیرات عہد بعہد ہوتے رہے انہیں اول ہر کتاب، دیوان اور مخطوطے سے علیحدہ علیحدہ نقل کر لیا جائے تاکہ ذیلی موضوعات کے تحت ابواب تیار کرتے ہوئے ان سے لسانی شواہد حاصل کر کے ایک مخصوص تاریخی ترتیب کے ساتھ یکجا کیا جا سکے۔ چنانچہ تیسرا مرحلہ اس طرح طے کیا گیا کہ اس جمع شدہ مواد کو صرف و نحو کے اعتبار سے تقسیم کرنے کے بعد مزید ذیلی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس سے صرف و نحو کے تغیرات کی صورت مزید واضح ہو گئی۔ اس سے اگلا مرحلہ اس منقسم مواد کو لکھنے اور ترتیب دینے کا تھا۔ اس کے لیے مختلف انداز اختیار کیے گئے اور بالآخر موجودہ صورت میں اس کی ترتیب قائم کی گئی۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو صرف و نحو میں اسم، فعل، ضمیر، حرف سبھی میں تغیرات ہوئے، نحوی حصے میں کم عنوانات نظر آئیں گے جن سے بخوبی واضح ہے کہ "نحو" کے اعتبار سے تغیرات کم ہوئے ہیں زیادہ تغیرات "صرف" میں ہوئے۔ اس طرح اپنی موجودہ صورت میں یہ اردو صرف و نحو میں عہد بعہد ہونے والے تغیرات کا ایک مطالعہ ہے جو اردو صرف و نحو کے موضوع پر موجود دیگر کتب سے ایک بالکل مختلف اور منفرد اہمیت کا حامل ہے اور جو قدیم اردو کے ایک بڑے دور کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دکن اور شمالی ہند کے

قدیم اردو ادب کا صرف و نحو کے اعتبار سے اس قسم کا مطالعہ اس سے قبل نہیں کیا گیا ہے۔ اس مطالعے سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہے کہ اردو زبان میں عہد بعہد مختلف النوع تغیرات رونما ہوتے رہے۔ ان میں ایک عہد ایسا ہے جب یہ تغیرات زیادہ تیزی سے اور زیادہ تعداد میں ہوئے۔ یہ اردو کا دکنی دور ہے۔ دہلوی اردو نہ صرف اپنی اصل سے قریب تر رہی بلکہ دکنی اثرات سے جو تھوڑی بہت بے قاعدگی اس میں راہ پا گئی تھی اس کی طرف بھی بہت جلد توجہ کی گئی اور زبان کو ان اثرات سے پاک کرکے اصل سے قریب رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خود دہلی میں ایک وہ اردو تھی کہ فصحاء بولتے اور لکھتے تھے دوسری بول چال کی زبان تھی جو مختلف محلوں میں مختلف لب ولہجہ اور روزمرّہ کے ساتھ بولی جاتی تھی، چنانچہ ہندوؤں کا لب ولہجہ مختلف تھا اور مسلمانوں کا مختلف۔ اسی طرح مغلپورہ والوں کی بول چال دہلی کے فصحاء سے مختلف تھی۔ انشا نے دریائے لطافت میں اس پر بحث کی ہے اور مثالیں دی ہیں۔ موجودہ مقالے میں جہاں ضرورت سمجھی گئی اس کا اظہار کر دیا گیا ہے۔

میرے مقالے کا موضوع "اردو صرف و نحو کے تغیرات" میرے بزرگ، استاد، مشفق و مکرم جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب مدظلہٗ کا تجویز کردہ تھا۔ اس وقت آپ شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ ایم اے میں، میں باقاعدہ دو سال تک ان سے علمی طور پر فیضیاب ہوئی۔ پھر انھوں نے میرے لیے پی ایچ ڈی کا موضوع تجویز کر دیا۔ نہیں معلوم کہ آپ نے اس موضوع کو میرے لیے مناسب سمجھا یا مجھے اس موضوع کے لیے۔ بہرحال اس موضوع سے نبرد آزمائی میں مجھے جس قدر دشواریاں جھیلنا پڑیں جس قدر دقتیں اٹھانی پڑیں، میں نہیں کہہ سکتی کہ کتنی بار میرے حوصلوں نے جواب دیا اور میں تھک کر بیٹھ رہی۔ یہ موضوع مجھ جیسی بے مایہ و کم استعداد کے لیے سنگلاخ پہاڑ کھودنے کے مترادف تھا، خشک، بے کیف، ٹھوس اور خالص علمی۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا فیض تھا کہ کسی نہ کسی طور میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکی۔ میں بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے قیمتی وقت سے مجھے وقتاً فوقتاً حصہ دیا۔ وہ بچیوں پر ہمیشہ شفقت فرماتے ہیں اور اسی اعتبار سے میں بھی سزاوار شفقت ٹھہری۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً ان کے مشورے اور تجاویز، ایک سخت اور بے کیف کام کو آسان اور سہل بناتے رہے۔ جب بھی میری ہمت جواب دے جاتی وہ مختلف مثالوں سے مجھ میں نئی تازگی اور حوصلہ پیدا فرماتے۔ میں اپنی اس عمر میں سخت محنت و جانفشانی کے ساتھ علمی و تحقیقی کاموں میں مشغول دیکھتی تو اپنی بے حوصلگی اور کم ہمتی پر سخت شرمندگی ہوتی۔ پھر میرے کام کو دیکھتے ہوئے ان کے حوصلہ افزا جملے اور میرے کام کی

اہمیت کا احساس دلانا مجھ میں نئے سرے سے کام کرنے کی لگن پیدا کر دیتا۔ ان کا فیض ہمیشہ مجھے پہنچتا رہا۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائیوں سے بھی فائدہ اٹھایا، لائبریری سے بھی استفادہ کیا، مشوروں اور تجاویز سے بھی مستفید ہوئی۔ ان کی کرم گستری اور فیض رسانی کے مقابلے میں میرے ممنونیت اور شکر گزاری کے الفاظ بہت کم تر محسوس ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انہی کا حوصلہ تھا کہ مجھ جیسی کندۂ ناتراش کو اس قابل بنایا۔ خدا ان کے سایۂ رحمت اور فیض کو مجھ پر دائم و قائم رکھے۔

مقالے کے سلسلے میں اپنے نگراں جناب ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کی شکر گزاری بھی مجھ پر واجب ہے۔ قدم قدم پر مجھے ان کی رہنمائی اور مدد درکار ہوئی اور ہر موقع پر انہوں نے کمال مہربانی کا ثبوت دیا۔ کتابوں کی فراہمی سے لے کر ترتیب و تزئین کے مرحلے تک، ہر سعی و کاوش میں ان کی محنت و جانفشانی، ان کی بہترین تجاویز اور ان کے ماہرانہ مشوروں کے سبب میں ناچیز اس قابل ہو سکی کہ ایک ایسے موضوع پر نہ صرف قلم اٹھایا بلکہ پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جس کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ یہ موضوع عورتوں کے لائق نہیں۔ مجھے اپنی کم علمی اور ناتجربے کاری کا اعتراف ہے اور یہ بھی بخوبی جانتی ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتی لیکن اس امر کی خوشی ہے کہ اپنے رہنما کے ساتھ کام کرتے ہوئے، ان کے عرصۂ دراز کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے میرے علم و شعور اور استعداد نے نشو و نما اور بالیدگی حاصل کی، میرے ذہنی اور علمی تناظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ صحیح معنوں میں یہ دراصل میری تربیت کا عرصہ تھا جو ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کی نگرانی میں اپنا مقالہ لکھتے ہوئے میں نے گزارا۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی، دقتِ نظر اور باریک بینی کے ساتھ مجھے ان مراحل سے گزارا۔ اکثر اوقات مجھے یہ کام اس قدر دشوار محسوس ہوا کہ اس کی تکمیل کا حوصلہ اپنے اندر موجود نہ پاتی، اس میں دخل اس بات کا بھی تھا کہ وہ کسی بھی تحریری و علمی کام کے سلسلے میں آسانی سے مطمئن نہیں ہوتے۔ اسی دشوار پسندی نے کبھی کبھی مشکلات پیدا کیں لیکن ایسے موقعوں پر انہوں نے نہایت محبت و شفقت کے ساتھ ان دشواریوں سے نبرد آزمائی کا حوصلہ بخشا اور میں ان کی عنایات، ان کے فنی تعاون و تجربات کے تحت اپنے کام کو آگے بڑھاتی رہی۔ اس دوران بعض وقفے ایسے بھی آئے کہ میں نے کام کو مشکلات اور بے کیفی کے باعث کچھ عرصہ ملتوی کیے رکھا۔ ایسے موقعوں پر انہوں نے میری مشکلات محسوس کرتے ہوئے نئے سرے سے مجھ میں شوق اور دلچسپی کو ابھارا اور میں پھر سے کام کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

میں ان کی مزید ممنون اس لیے بھی ہوں کہ انہوں نے مجھے مخطوطات کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے متعلقہ شعبوں تک میری رہنمائی فرمائی۔ جس کی وجہ سے میں انجمن ترقیٔ اردو کراچی کے کتب خانے اور نیشنل میوزیم کراچی

کے شعبۂ مخطوطات سے مستفید ہو سکی۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے استاد کا حق کبھی ادا ہو ہی نہیں سکتا جو ایک ذرۂ ناچیز کو نہ صرف اس کی صلاحیتوں سے روشناس کرائے، اس میں کام کا حوصلہ، لگن اور ذوق و شوق کو بیدار کرے، اس کے سامنے ایک لائحۂ عمل واضح کر دے اور اس کے پوشیدہ جوہروں کو تراش خراش کرے، نکھارے سنوارے اور تجربات کی دشوار گزار راہوں سے گزار کر، تربیت کرتے ہوئے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھانے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل کر دے جس سے طبائع عام طور پر گھبراتی ہیں۔

میں اس بات کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتی ہوں کہ ایک طویل عرصے تک میں ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کے زیر تربیت رہی۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد، اسی شعبے میں بحیثیت استاد میرا تقرر ہوا اور اب پی ایچ ڈی کا کام مکمل ہونے تک، قریب بارہ برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں بدستور ایک ادنیٰ طالب علم کی طرح ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے ہوں۔ مستقل طور پر مجھے ان سے سیکھنے کے مواقع حاصل رہے۔ میں نے ہمیشہ ہر قدم پر ان سے سیکھنے کی کوشش اور خواہش کی۔ اس کے طفیل میں ایک ایسے موضوع پر کام کر سکی جو لسانیات میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں میں اپنے فرائض سے کس حد تک عہدہ برآ ہو سکی ہوں یہ بتانا تو اس فن کے ماہرین کا کام ہے لیکن یہ صرف ایک طالب علمانہ سعی ہے۔ اس میں جو خوبیاں پیدا ہوئی ہیں وہ میرے رہنما کے تحقیقی میدان کے تجربات، مفید مشوروں اور ماہرانہ تجربات کا ثمر ہیں اور جو خامیاں اور کوتاہیاں ہیں وہ مجھ ناچیز کی لاعلمی اور ناتجربہ کاری کے سبب ہیں کیونکہ موضوع میرے علم و استعداد سے کہیں زیادہ ٹھوس علمی معلومات کا متقاضی تھا۔

آخر میں یہ بھی ذکر کر دوں کہ اپنے رہنما کے مشورے کے مطابق مجھے موجودہ مقالے کی نقل کا کام بھی خود ہی کرنا پڑا کیونکہ اس طرح ان کے نزدیک مقالہ ان عیوب و نقائص سے پاک رہا جو کتابت اور ٹائپ کے باعث پیدا ہو جاتے ہیں۔ نقل کا کام بھی میرے لیے بڑا صبر آزما ثابت ہوا کیونکہ لفظ بہ لفظ نقل کرتے ہوئے مقالے پر گویا نئے سرے سے نظر ثانی ہوگی اس طرح جو خامیاں رہ گئی تھیں انہیں دور کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات نئی معلومات اضافہ کرنے کا بھی۔ اس طرح اس کام میں اندازے سے زیادہ وقت صرف ہوا۔ لیکن اپنے رہنما کو مطمئن کرنے کے مقابلے میں مجھے یہ محنت اور دقت زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ کام اختتام کو پہنچا جس کو سمیٹ کر تکمیل تک پہنچانا مجھے اپنی ہمت سے بعید لگتا تھا۔

جس وقت میں نے یہ موضوع اپنایا اور کام کی ابتدا کی تو نیا نیا شوق تھا۔ ایم اے میں مقالہ لکھنے کا تجربہ ہو چکا تھا خیال تھا کام کچھ بہت زیادہ مشکل ثابت نہ ہوگا اور جلد تکمیل پا جائے گا۔ لیکن جوں جوں مطالعہ بڑھا، نوٹس اکٹھے ہوئے، کام پھیلتا گیا اور اسے منتشر حالت سے شیرازہ بند کرنا اور اس کے اصول و قواعد کو سمیٹ کر منضبط کرنا نہایت دشوار نظر آیا اور اب کہ یہ کام مکمل ہو چکا ہے تو محسوس ہوا ہے کہ تحقیق کا کام کوئی ایسا سہل کام نہیں۔ اس میں صرف شوق اور دلچسپی ہی کافی نہیں، محنت و جگر کاوی، پتہ ماری اور دماغ سوزی اور حوصلہ شکن مراحل سے نبرد آزمائی کی امنگ بھی ضروری ہے اور تمام تر صلاحیتوں کی یکسوئی اور ارتکاز بھی۔

مقالے میں "اردو صرف و نحو کے تغیرات" کا جن پہلوؤں سے مطالعہ کیا گیا ہے اور جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان سب کا نچوڑ، مقالے کے آخر میں "مباحث کا خلاصہ" کے عنوان سے شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ مقالے کا ایک Abstract بھی ساتھ ہی داخل کیا جا رہا ہے۔

نسیم آرا سعید
شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی
۳۰؍ جون ۱۹۸۵ء

اِسم خاص

اسم خاص، کسی خاص شخص، شے یا مقام کے نام کو کہتے ہیں جیسے حامد، اسلم، حیدرآباد، کراچی، یا جیسے رخش، کو رستم کے گھوڑے کا نام تھا۔ اسم خاص کی کئی قسمیں ہیں۔ خطاب۔ لقب۔ کنیت۔ تخلص۔ عرف۔

خطاب:۔ کسی شخص کا وہ مخصوص نام جو عزت افزائی کے طور پر یا اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر عطا کیا جائے مثلاً نجم الدولہ دبیر الملک (مرزا اسد اللہ غالب کے خطابات)، سر راس مسعود، اعتماد الدولہ، آصف جاہ وغیرہ۔ اسی طرح علمی کاموں کے سلسلے میں، مثلاً شمس العلماء کا خطاب۔ قومی خدمات کے صلے میں خان بہادر اور رائے بہادر کا خطاب وغیرہ۔ تمغۂ جرأت، ستارۂ جرأت وغیرہ اعزازات ہیں، لیکن چونکہ یہ نام کے ساتھ ملا کر عام طور پر بولے نہیں جاتے (خواہ تحریر میں لکھے جاتے ہوں) لہذا انہیں خطاب نہ کہیں گے۔ اسی طرح تعلیمی ڈگریاں بھی خطابات میں شامل نہیں۔

لقب:۔ کسی خاص وصف کے باعث کسی خاص شخص کا کوئی نام مشہور ہو جانا جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب صادق۔ امین رحمۃ للعالمین۔ حضرت موسیٰؑ کا کلیم اللہ اور حضرت ابراہیمؑ کا خلیل اللہ۔ مرزا غالب کا لقب مرزا نوشہ۔ اسی طرح فرید الدین کا لقب عطار (یعنی خاص جن کا پیشہ عطاری کا)۔

کنیت:۔ کسی کا اپنے باپ یا اولاد کی نسبت سے نام لیا جانا مثلاً ابو القاسم۔ ابو الاسود۔ ابو عبیدہ۔ ابو عبد اللہ (بیٹے کی نسبت سے)۔ اور ابنِ خلدون، ابنِ بطوطہ، ابنِ اثیر (باپ کی نسبت سے)۔

تخلص:۔ وہ مختصر نام جو شعراء شاعری میں اپنے نام کے بجائے نظم کرتے ہیں مثلاً غالب، عرفی، حالی، بسمل، آزاد وغیرہ۔

عرف :۔ وہ مختصر نام جو محبت یا حقارت کی وجہ سے پڑ جائے مثلاً اچھے میاں۔ چُنّو۔ کلّن۔ چُھٹّو وغیرہ

حالی کہتے ہیں :۔

حمیدو والوں کا ہے اگر پٹھا

شیخو والوں میں جا نہیں سکتا

اسم خاص کے سلسلے میں بہت زیادہ تغیرات دیکھنے میں نہیں آتے۔ عرف اور لقب کچھ اس قسم کے نظر آتے ہیں جیسے نواب شجاع الدولہ بہادر کے بیٹے کا نام، نواب امین الدولہ معین الملک تھا لیکن وہ مرزا منیڈھو کے نام سے مشہور تھے۔

سعادت یار خاں ناصر نے اپنے تذکرے "خوش معرکۂ زیبا" میں ایک شاعر مرزا حکیم فضل اللہ کا ذکر کیا ہے۔ جن کا عرف "مرزا مینا" [۲] تھا۔ ایک اور شاعر احمد حسین خاں جو شکس کا بھی ذکر ملتا ہے ان کا عرف "اچھے میاں" تھا۔

اسی طرح میر تقی میر کے صاحب زادے عسکری کا عرف "میر کلو" تھا [۳]

تذکرۂ "سراپا سخن" میں سید ابو تراب (خلفِ سید اکرام علی) کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان کا عرف "منجو صاحب" تھا [۴]

اسی طرح کچھ اور تخلص اور عرف بھی ملتے ہیں مثلاً: "خواجہ ہنگا" اور "بھچو" وغیرہ [۵]

۱۔ سید محسن علی محسن۔ تذکرہ سراپا سخن ص ۲۳۔ مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن۔ مطبع عالیہ۔ لاہور۔

۲۔ سعادت یار خاں ناصر۔ خوش معرکۂ زیبا۔ جلد دوم ص ۵۵۷ مرتبہ مشفق خواجہ۔ مطبع عالیہ لاہور۔ سنہ ۱۹۷۲ء

۳۔ ایضاً۔ ص ۶۰

۴۔ سید محسن علی محسن۔ تذکرہ سراپا سخن۔ ص ۲۳۔ مطبع عالیہ۔ لاہور۔

۵۔ مفتی صدر الدین آزردہ۔ تذکرۂ آزردہ۔ ص ۶۱۔ ۵۲

اس سے قطع نظر یہاں کچھ ایسے ناموں کی طرف خصوصیت سے توجہ مبذول کرانی مناسب معلوم ہوتی ہیں جن میں ہندیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً منشی ننھّن [6] ان کا تعلق ٹونک سے تھا، پورا نام منشی ننھّن لال اور تخلص "بہجت" تھا۔ "کیں شیرن مار" اور "لکھ بخش" جیسے عرف ولقب بھی نظر سے گزرتے ہیں [6] میر نے ایک شاعر کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا نام میاں صلاح الدین تھا تخلص "پاک باز" اور عرف "ملّھن" [7]

دکن کے صوفی بزرگوں میں بھی اس قسم کے لقب اور عرف مل جاتے ہیں مثلاً محبوب عالم عرف "شیخ جیون"، شیخ بہاء الدین "باجن"۔ باجن ان کا تخلص بھی ہے۔

فارسی وعربی انداز مثلاً شیخ عین الدین "گنج العلم"، شاہ میرانجی "شمس العشاق"، شیخ بہاء الدین برناوی "خاتم التارکین"، ملک خوشنود۔ قطبِ عالم۔ شاہ عالم۔ وغیرہ سے ہٹ کر، مندرجہ بالا نام ہندیت لیے ہوئے ہیں اور اس رجحان کے مظہر ہیں کہ کسی زمانے میں ہندی اسماء کے آخر میں نون کا لاحقہ (ن) اضافہ کیا جاتا تھا جیسے ننھن، باجن، جیون وغیرہ۔ یہ رجحان اس حد تک نظر آتا ہے کہ بعض عربی فارسی ناموں پر بھی نون کا لاحقہ اضافہ کر دیا جاتا تھا جیسے قطبن [8] بھاشا کے سربرآوردہ شاعر تھے۔

---

[6] تذکرہ بہارِ سخن۔ ص۱۱۔ مرتبہ محمد شرف الدین یکتا جودھپوری / [6] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ۔ اردو نثر کا آغاز وارتقا

[7] میر تقی میر۔ نکات الشعراء۔ ص۷۹

[8] حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ ص۲۰۹۔

کچھ لقب اور تخلص اس قسم کے بھی نظر سے گزرتے ہیں مثلاً سیوا ۹ سیوک - الک داس (الکوداس)

وغیرہ یہ بھی ہندیت کے اثرات کے مظہر ہیں۔

عام طور پر تخلص فارسی عربی انداز کے رکھے جاتے تھے جیسے ایاغی (محمد امین)، شغلی، ابنِ نشاطی،

حقیقی، داؤدی، وجہی وغیرہ۔ بعد میں اس قسم کے اسما تخلص کے طور پر اپنائے گئے جن پر یائے نسبتی ملحق

کی گئی تھی۔ مثلاً حالی، حسرتی وغیرہ۔ البتہ بعض شعراء نے کسی خاص صفت کو تخلص کے طور پر اپنایا مثلاً

مومن، آزاد، غالب، ذوق، شیفتہ وغیرہ۔

دورِ قدیم میں جہاں "نون" کے لاحقے کے ساتھ تخلص اور عرف نظر آتے ہیں وہاں ایسے تخلص اور عرف بھی نظر

آتے ہیں کہ فارسیت لیے ہوئے ہیں مثلاً جانم (شاہ برہان الدین جانم) - ایاغی (ایاغ سے) - بعد میں اضافت کے

ساتھ ایسے القاب نظر آتے ہیں مثلاً جانِ جاناں (مرزا مظہر) - خان خاناں (ابراہیم) - وغیرہ -

عرفیت میں ایک رجحان "و" کے اضافے سے مختصر نام بنانے کا ملتا ہے مثلاً بھجو - میندھو - اس طرح سید محمد

حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد، "شاہ راجو" کہلاتے تھے - بعد کے زمانے میں، اسی طور پر واو ملحق کر کے

عرفیت بنائی جانے لگی اور یہ رجحان اب بھی باقی ہے - مثلاً چھٹو، دھنو، کلو، کلو، ملو، شیخو وغیرہ - اس سلسلہ

میں اکبر کے صاحبزادے سلیم کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے مذکورہ بالا رجحان ہی کا اثر تھا کہ شہزادے کو پیار سے شیخو

---

۹ محی الدین قادری زور - دکنی ادب کی تاریخ - نشاط پریس کراچی جون ۱۹۶۰ء

(شیخ+و) پکارا جاتا تھا۔ گویا اردو میں عربی فارسی الفاظ پر بھی ہندی طریقے اور اصول استعمال کیے جاتے تھے

قدیم اردو میں اِکا دُکا مثالیں ایسی بھی مل جاتی ہیں جن پر پنجابی کا اثر نظر آتا ہے مثلاً فخر دین (مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا مصنف فخر دین نظامی)۔ اسی طرح نام لینے کا دستور پنجاب میں عام ہے۔ اہلِ پنجاب ایسے ناموں کو، جن پر "ال" داخل کیا جاتا ہے، "ال" گرا کر بولتے ہیں۔ جیسے صدرالدین کو صدر دین، سراج الدین کو سراج دین، علم الدین کو علم دین وغیرہ۔ دکن میں یہی صورت نظامی کی مثنوی میں دیکھنے میں آتی ہے وہ ہر جگہ اپنا نام، "فخر دین" ہی لکھتا ہے۔

موجودہ دور میں اسم خاص کے سلسلے میں چند اور رجحانات بھی دیکھنے میں آئے ہیں مثال کے طور پر ایسے نام رکھنے کا دستور، جس کا ایک جزو فارسی یا عربی اور دوسرا ہندی ہو۔ جیسے شمسہ کنول (مونث) اور شمس کنول (مذکر نام)۔ ان میں پہلا جزو عربی اور دوسرا ہندی ہے۔ ایسے مرکب نام لکھنے اور بولنے میں عربی قاعدہ نہیں برتا گیا ہے جو دو لفظوں کو ملانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے شمس الحق، شمس الدین، شمس التبریز (شمس تبریز) وغیرہ۔ البتہ آریائی زبانوں میں مرکب الفاظ بنانے کا ایک اصول یہاں لاگو کیا گیا ہے وہ اصول یہ ہے کہ دو لفظوں کو پاس پاس رکھ دیا جاتا ہے۔ کسی ایسے لفظ کو درمیان میں لائے بغیر جو رشتہ و تعلق ظاہر کرے۔ اسی طرح کے ناموں میں مذکر و مونث کی پہچان کی کوئی علامت بعض اوقات رکھ دی جاتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا نام سے ظاہر ہے کہ تانیث کے لیے عربی علامتِ تانیث "ۃ" ہوتی ہے جو "ہ" کی صورت میں آخر میں رہتی ہے۔ جیسے شمس سے شمسہ۔ عارف، عارفہ، طاہر، طاہرہ وغیرہ

کلّو (واو معروف) مذکر کے لیے اور واو مجہول، مؤنث کے لیے

اس کے ساتھ ساتھ ایک رجحان یہ بھی ہے کہ مذکر و مونث ناموں کے درمیان پہچان یا تفریق باقی نہیں ہے بلکہ ایسے نام رکھے جانے لگے ہیں جو اصلاً خواہ مونث ہوں یا مذکر، دونوں صنفوں کے لیے رکھ لیے جاتے ہیں مثلاً شمیم، نسیم، قمر، تبسم، کوکب، اختر، شمس وغیرہ۔

انگریزی کے اثر سے تازہ رجحان یہ بھی آگیا ہے کہ ناموں کے ساتھ باپ کا نام ملا کر لیا جانے لگا ہے اور اسی طرح لکھا بھی جاتا ہے مثلاً شمیم سعید، قمر وحید الدین، کوکب اختر وغیرہ۔ ایسے ناموں میں کبھی کبھی اشتباہ ہو جاتا ہے کیونکہ بعض اوقات مذکر مونث کی شناخت کی کوئی علامت نہیں ہوتی۔

مرکب ناموں کا ایک رجحان یہ بھی ہے کہ عربی فارسی ناموں کے ساتھ ہندی لاحقے لگا دیے جائیں مثال کے طور پر مالک رام (مالک، عربی) رام (ہندی)۔ صاحب سنگھ (صاحب، عربی)۔ سنگھ (ہندی)۔

ایک طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ لڑکیوں کے نام کے ساتھ باپ کا نام ملا کر بولنے اور لکھنے کی صورت میں "آنسہ" بھی استعمال کر لیا جاتا ہے جو انگریزی Miss اور عربی "بنت" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح خواتین کے ناموں کے ساتھ شوہر کا پورا نام یا نام کا اول جزو لگا کر بولا اور لکھا جاتا ہے اور سابقے کے طور پر مسز اور بیگم (ترکی لفظ)، کا اضافہ کر لیا جاتا ہے جیسے بیگم تنزیلہ زبیری۔ بیگم حمید ملک۔ لیکن "بیگم" کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقوں میں آنسہ اور بیگم کی جگہ "مس" اور "مسز" کا استعمال عام ہے۔

اسم کیفیت

موجودہ قاعدے کے مطابق اسم کیفیت، فعل، اسم، صفت، اور بعض اوقات دو لفظوں کے مرکب سے بنا لیا جاتا ہے ① فعل سے مثلاً چلنا سے چال چلن۔ گھبرانا سے گھبراہٹ۔ ② اسم سے مثلاً دوست سے دوستی۔ دشمن سے دشمنی۔ ③ صفت سے مثلاً نرم سے نرمی۔ گرم سے گرمی۔ کڑوا سے کڑواہٹ۔ ④ دو لفظوں کے مرکب سے مثلاً چھاننا بیننا سے چھان بین۔ جاننا پہچاننا سے جان پہچان۔ ⑤ کبھی ایک ہی لفظ کی تکرار سے مثلاً بک بک۔ جھل جھل۔ کُڑ کُڑ۔ اکثر عربی فارسی الفاظ اردو میں بطور اسم کیفیت استعمال ہوتے ہیں یہاں ان سے بحث نہیں۔

اردوئے قدیم میں فعل سے اسم کیفیت بنانے کی یہ صورت تھی: کرنا سے کرت۔ پھرنا سے پھرت۔ دھرنا سے دھرت۔ چلنا سے چلنت۔ کرنا سے کرن بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ نیز بچارنا سے بچارن۔ گمنا سے گمن۔ تیرنا سے تیرن۔ اُڑنا سے اُڑن۔ مرنا سے مرن۔ دھرنا سے دھرن۔ وغیرہ۔

"کدم راؤ پدم راؤ" کے چند مصرعے دیکھیے: [1]

۱۔ پری پنکھ کا ہوئے کت گن مرن۔

۲۔ نہ مرجاؤ توں چھوڑ اوگن کمرن۔

---

[1] فخر دین نظامی دکنی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۷۷۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۳ء۔

اسم کیفیت ۲

۳۔ کنک لے چلیا سات راوان دھرن۔

۴۔ بچارن جتے رائے ایسا بچار۔

اسی مثنوی میں دوسری صورت یہ بھی ہے مثلاً ؂۲

۱۔ دھرت سیس اچاون نہ دے ایک روپ۔ ...

۲۔ کرت کارتوں نپرس جیوں سانپ لہر

وجہی نے چلنا سے اسم کیفیت "چلنت" لکھا ہے "سب رس" کا یہ جملہ دیکھیے : ؂۳

جکوئی لو چلنت چلتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔

حسن شوقی کا مصرع ہے : ؂۴ شرف مرد کا ہے چلنت خوب خاص۔

ہاشمی کے یہاں بسرنا سے بسراٹ اور کھکیانا سے کھکھیاٹ (جیسے گھبرانا سے گھبراہٹ) دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً

ہاشمی کے درج ذیل مصرعے : ؂۵ ۱۔ توں سب کیتاں کی خوں کھنی ہوئی یوں طبع بسراٹ کی۔

۲۔ دیکھنگیاں سب سہیلیاں کر کھکیاٹ کہنگیاں

؂۲ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۷۵ تا ۷۶ تا ۷۷۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۳ء

؂۳ ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۱۵۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۷ء

؂۴ حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۱ء

؂۵ ہاشمی۔ دیوانِ ہاشمی ص ۱۔ (حبیب ضیاء۔ دکنی زبان کی قواعد ص ۱۹۔ مخزونہ انجمن ترقی اردو کراچی)۔

صفت سے اسم کیفیت بنانے کے سلسلے میں ایسے تغیرات دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً کڑوا سے کڑوائی یا کڑواس۔

نرم سے نرمائی۔ غرور سے غروری اور مغروری۔ نھنا سے نھن پن۔ بڑا سے بڑپن۔

وجہی کی سب رس کا جملہ ہے: ۶ اس کڑوائی میں کون رکھے مٹھائی۔

ہاشمی کے چند مصرعے بھی درج ذیل ہیں ۷

۱۔ باتاں میٹھیاں کرکے چلے جو دل میں لو کڑواس تھا۔

۲۔ دل لاکے دل چرانا، چوری ستی نھن پن۔

۳۔ اسی تے یافت نئی موں ہیر ذرا نرمائی کا پانی۔

"معراج العاشقین" کے چند جملے بھی یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۸

۱۔ مغروری کی شہوت کی ن عنیر جاگر نہ دوڑانا سو۔

۲۔ اڑتے خوشبوئی لائی سو خوشبوئی، ان نے کھائی سو گولی۔

۳۔ حسد نک سوں لبرلوئی نہ لینا سو۔

---

۶ ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۵۲۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۶ء

۷ ہاشمی۔ دیوانِ ہاشمی۔ ص ۲۶۱۔ ۸۔ ۹

۸ معراج العاشقین۔ ص ۱۱ ۔ ص ۲۴۔ ۱۸۔ منسوب بہ گیسو دراز۔ دکن دارالاشاعت کراچی۔ ۱۹۶۱ء

اسمائے کیفیت کے آگے ہمزہ اور یائے معروف (ی) کا استعمال، دکنی کا رجحان ہے۔

اسم سے آج کی اردو میں اس طرح اسم کیفیت بناتے ہیں مثلاً دوست سے دوستی اور دشمن سے دشمنی وغیرہ۔ اردوئے قدیم میں جو صورت دیکھنے میں آتی ہے اس کی چند مثالیں دیکھیے:۔

وجہی کی "سب رس" کے جملے ہیں: [9]

۱۔ یو وقت بھائی پنے اور یاری کا وقت ہے۔

۲۔ دل داشتی اور دوست داری کا وقت ہے۔

ہاشمی کا مصرع ہے [10] دشمن کی دشمنائی مجھ کام یوں کیتی جیوں۔

اسم پر "لاحقہ گی" بڑھا کر اسم کیفیت بنانے کی یہ مثالیں عام ہیں۔ قاضی محمود بحری کا شعر ہے [11]

نفس کوں جس باج ہے حیرانگی + روح کوں اور دل کوں پریشانگی

دکن کے علاوہ یہ رجحان شمالی ہند کی اردو میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ حاتم کے کلام سے چند مثالیں یہاں نقل ہیں [12]

۱۔ محتاجگی سے مجھ کو نہیں ایک دم فراغ۔

---

[9] سب رس۔ ص ۱۳ ۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

[10] ہاشمی۔ دیوانِ ہاشمی۔ ص ۲۷۶

[11] قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری۔ ص ۲۷۵۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

[12] "شاہ حاتم، حالات و کلام"۔ ص ۱۷ مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۷ء

۲۔ کہ سب اہلِ چمن ہنستے ہیں تیری احمقائی پر۔

۳۔ کیا مری بستی خوش آتی ہے تجھے ویرانگی۔ [۱۳]

اب "گی" ہٹا کر اس کی جگہ یائے وصفی کا اضافہ کرتے ہیں مثلاً پریشان سے پریشانی۔ حیران سے حیرانی۔

ویران سے ویرانی۔ وغیرہ۔

---

[۱۳] شاہ حاتم، حالاتِ شاہ وکلام، ص ۱۹۵ تا ۹۷ - جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۷ء

اسم فاعل
حد ۱

اسم فاعل بنانے کا قاعدہ

اسم فاعل اردو میں، مصدر یا حاصل مصدر[۱] سے پر لاحقہ "والا" اضافہ کرنے سے بنتا ہے۔ جیسے
چلنے والا۔ پڑھنے والا۔ اردوئے قدیم میں اس کی جگہ "ھار" اور "ھارا" کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ جیسے بھونہار،
پالن ہار۔ کھیون ہار وغیرہ۔ "کدم راؤ پدم راؤ" کا شعر ہے:[۲]

نظامی کہن ہار جیں یا رہوئے ¤ سنن ہار سن، نغز گفتار ہوئے

شاہ میراںجی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ) سے ایک رسالہ "مرغوب القلوب" نثر میں ہے۔ اس کا ایک جملہ ہے[۳]
سرانا نوازنا خدا کوں بہوت کر او پالنہارا ہے عالم کا۔
شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ، شاہ برہان الدین جانم کا ایک مصرع ہے: ستتا دیکھتا بولنہار سکے[۴]
انہی کا ایک رسالہ "کلمۃ الحقایق" نثر میں ہے۔ اس کا جملہ ہے:[۵]
قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرنہار، سبھ سبھ سو تیر اٹھار وسبھ ہوا بھی توج تھی بار۔

۱۔ حاصل مصدر اور مادہ، اردو میں دونوں کی شکل ایک جیسی ہے۔ علامت مصدر گرانے سے حاصل مصدر وجود میں آتا ہے!
مادہ بھی۔ جیسے مار۔ دوڑ۔ کھیل وغیرہ۔
۲۔ فخر دین نظامی دکنی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۶۹ - مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۳ء
۳۔ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵۵ بحوالہ شمس العشاق۔ "مرغوب القلوب"۔
۴۔ ایضاً ص ۵۷ بحوالہ شاہ برہان الدین جانم۔
۵۔ ایضاً۔ بحوالہ شاہ برہان الدین جانم۔ رسالہ "کلمۃ الحقایق"۔

(حاصل مصدر)

اسم فاعل
مد ۲

"سب رس" میں بھی یہی صورت ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں ؎۶

منا کرنے ہارا - بڑے کوں نفنا (نفع) کرن ہارا - کام آن ہارا۔

کمال خان رستمی کے "خاورنامہ" کا ایک شعر ہے ؎۷

کھولن ہارے ہیں بندے (بندھے) کام کا + بندن ہارے ہیں پردہ بدنام کا

سید میراں حسینی شاہ (جو برہان الدین جانم کے صاحبزادے شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے) سنہ وصال ۱۱۰۷ھ

ان کی سب سے مشہور اور ضخیم کتاب "شرح تمہیدات" ہے جو "تمہیدات عین القضاۃ" کا ترجمہ ہے۔ سب رس کے بعد یہ کتاب

اردو کی قدیم نثری کتابوں میں خاص درجہ رکھتی ہے۔ اس کے چند جملے یہاں نقل ہیں ؎۸

سو اے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نوازنہارا ہے

اس کا اجالا، جالنہارا ہے۔

یعنی دوست سو نوازنہارا ہور خوبیاں دینہارا۔

ملا نصرتی کے دو مصرعے دیکھیے: ؎۹

۶؎ ملا وجہی۔ سب رس (۱۰۴۵ھ) ص ۱۵۱-۱۵۰ - انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

۷؎ کمال خان رستمی - خاورنامہ (مترجمہ ۱۰۵۹ھ) ص ۱ مرتبہ شیخ چاند ابن حسین - ایجوکیشنل پریس کراچی - سنہ ۱۹۶۹ء

۸؎ مولوی عبدالحق - اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۶۶ بحوالہ سید میراں حسینی شاہ - شرح تمہیدا

۹؎ ملا نصرتی - دیوان نصرتی - مرتبہ جمیل جالبی - مطبع قوسین لاہور - سنہ ۱۹۷۲ء

مثال ۱ : بہن ہارے جس زمین پر جوڑوں

۲ : کہن ہار یو تاریخ اسکندری

یہ تمام مثالیں قدیم دکنی اردو کی ہیں۔ شمالی ہند کی اردو میں یہ صورت نہیں ملتی۔ "والا" لگا کر اسم فاعل بنایا جاتا ہے مثلاً کربل کتھا کا یہ جملہ : ۱۰

جان اپنا جان دینے والے کو سونپا۔

یہی صورت آج تک رائج ہے۔

محمود شیرانی صاحب کے نزدیک "والا" لگا کر اسم فاعل بنانا نسبتاً بعد کی پیداوار ہے۔ "ہار" زیادہ قدیم ہے۔ یہ نتیجہ انہوں نے "سب رس" کے تجزیے سے نکالا ہے۔ لکھتے ہیں : ۱۱

"سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اردو اور پنجابی اسم فاعل کی نہایت عام علامت "والا" قطعاً نظر نہیں آتی۔ بولنے والا، چلنے والا قسم کے اسم فاعل نہیں ملتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "والا" قدیم نہیں ہے"

اردوئے قدیم کے مطالعے سے بھی یہی واضح ہوتا ہے۔

---

۱۰ فضل علی فضلی۔ کربل کتھا صفحہ ۱۴۷۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دہلی۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۶۵ء

۱۱ حافظ محمود شیرانی۔ مقالات محمود شیرانی۔ جلد اول صفحہ ۲۳۶ شفیق پریس لاہور۔ طبع اول سنہ ۱۹۶۶ء

شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ "ہار" کا عام استعمال غالباً برج اثرات کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ "ہار" "والا" سے زیادہ قدیم ہے، غلط ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں کے یہاں، جو برج کے شاعر ہیں، "والا" بھی ملتا ہے مثلاً ان کا درجِ ذیل شعر:۔

؎ یوں رحیم ینّن ہوت ہے اپکاری کے رنگ
بانٹن والے کے لگے جوں مہندی کا رنگ

شوکت سبزواری کے نزدیک "والا" سنسکرت "پالک" کا بچہ ہے۔ "گوالا" سنسکرت میں "گوپالک" تھا "پ" کا تبادل واؤ سے بہت عام ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ "والا" اول اول "گووالا" سے تراش گیا۔ بعد میں بطور لاحقہ دوسرے اسما اور مصادر سے بھی جوڑا جانے لگا۔

"ہار" کو سنسکرت "دھارک" سے (رکھنے والا سے) مشتق بتاتے ہیں۔ کیلاگ کا کہنا ہے کہ بردائی کی نظم "راسو" کی پہلی سطر میں استعمال ہونے والا "دھارن دھاریم" کی ہندی "دھارن ہارا" ہے۔

ڈاکٹر ہرمپ نے "ہار" کو سنسکرت "کار" سے نکالا ہے۔ کار۔ کھار۔ ہار۔ لیکن شوکت صاحب کے نزدیک اس میں دقت یہ ہے کہ "ک" کو بغیر کسی معقول وجہ کے "کھ" بنا دیا گیا۔ بہتر یہ ہے کہ "ہار" کو فارسی "تا" سنسکرت "تر" سے ماخوذ مانا جائے اس لیے کہ "ت" کا "تھ" سے بدل جانا آسان ہے اور پھر "تھ" کا "ہ" ہو جانا معمولی بات ہے۔ ہندی کے "تار" بھی "تار" لگا کر بنایا گیا تھا۔[۱۲]

---

[۱۲] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۰۲۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

اسم موصول

اردو میں اسم موصول 'جو' ہے۔ فاعلی حالت میں واحد و جمع دونوں کے لیے 'جو' استعمال ہوتا ہے۔ غیر فاعلی صورت میں واحد کے لیے 'جس' اور جمع کے لیے 'جن' استعمال ہوتا ہے۔ مفعولی صورت میں یہ بدل کر واحد کے لیے 'جسے' اور جنھیں ہو جاتا ہے۔

'جو' کے مطالعے کے سلسلے میں اول دکنی کو لیں۔ وہاں 'جو' کے پہلو بہ پہلو 'جے' بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" کے دو مصرعے دیکھیے:۔

۱۔ کہ جے راؤ مجہ (مجھ) کوں کہے کھول کر

۲۔ جو سیر نار دکھیت کہے مائی بہن [۱]

شیخ بہاء الدین باجن کا مصرع ہے:۔

جو رہے اسی تھی (سے) نارے [۲]

شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ) کا ایک شعر حسب ذیل ہے:۔

جے کوئی اچھیں خاصے
اس بیان کرے بیاسے [۳]

شاہ برہان الدین جانم (م ۹۹۰ھ) شاہ میراں جی شمس العشاق کے صاحب زادے ہیں۔ انہوں نے بھی 'جے' استعمال کیا ہے۔ ان کا ایک مصرع ہے:۔

جے آپ کو کھوجیں ہیوے پاش [۴]

۱۔ فخر دین نظامی ۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۸۱-۹۱ ۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء

۲۔ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۳۳ ۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۷ء

۳۔ ایضاً ص ۴۸

۴۔ ایضاً ص ۶۰۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا ایک مصرع ہے:۔

جے ہے سو ہے نہیں نہیں [5]

قطب مشتری کے دو مصرعے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ جکیچ ہے سو تیری چھپی حکمتاں

۲۔ جو تج حکم نہ تا نہ ماہی اچھے [6]

مخدوم سید حسینی شہباز کے "شکار نامے" کا ایک جملہ ہے:۔

جولو باپاں ہور سات ماواں کی چھار فرزند تیں (تھے) [7]

گفتار حضرت پیر برہان الدین شاہ، موسومہ بہ "رموز الواصلین" کے دو مصرعے یہاں نقل ہیں:۔

۱۔ نور وہی جی (جے) مطلق نور۔

۲۔ جس میں سراب ہوی ظہور [8]

ملا وجہی کی نثری تصنیف "سب رس" کے بعض چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ جو لگن تو سب تے بے طمع نا ہوسی، عشق میں آئے بغیر خاطر جمع نا ہوسی۔

۲۔ جکوئی خوب ہے اسے اپنی خوبی چھپانے نہیں بھاتا۔

۳۔ جس کوٹ کوٹ کہیا جائے سو لوکوٹ ہے۔

۴۔ جن عورت نے اتنی چھلی کھائی، ان نے آخر مردکوں گنوائی

۵۔ جنوں (جنھوں) کے دل میں دانش نے کیا تھا گھر۔ [9]

---

[5] مولوی عبدالحق۔ (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص۷۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

[6] ملا وجہی۔ قطب مشتری ص۶ تا ۳۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

[7] مخدوم سید حسینی شہباز۔ "شکار نامہ" ص۱ مخطوطہ نمبر ۱/۹۶۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

[8] پیر برہان الدین شاہ۔ رموز الواصلین۔ ص۲۲ تا ۳۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۲۵ نیشنل میوزیم کراچی۔

[9] ملا وجہی۔ سب رس۔ ص۱۲-۱۵۸-۱۵۳-۸۳-۲۲۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

جو ۳

باقر آگاہ کی تصنیف "عقاید مذہبِ امامیہ" کا جملہ ہے :۔

هور مومناں کوں هور مومنہ عورتاں کوں یو جو کچھ میں دکنی زبان سوں لکھیا هوں نفع پون جا (پہنچا) ۱۰

شیخ داؤد دھنیفی کی "ہدایاتِ ہندی" کا ایک شعر یہاں نقل ہے اس میں بھی 'جو' استعمال ہوا ہے :۔

کہ جوں حق تعالیٰ نے بولیا اہے

جو قرآن کے بیچ لکھ لیا اہے ۱۱

شاہ محمد حق نما کی "خزانۂ معرفت" کا شعر ہے :۔

خدا کوں جو سجدہ کرے گا اگر

کہتے اوس کوں صاحب او باطن نگر ۱۲

یقینؔ دکھنی کی "فتح المبین" کے دو مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ ہر یک (ہر ایک) جو اس رسالہ کوں ہو شایق

۲۔ جیسے توفیق ہووے حق دیں سوں ۱۳

کمال خاں رستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" میں 'جو' اور 'جے' پہلو بہ پہلو دکھنے میں آتے ہیں ملاحظہ ہو

۱۔ جو صاحب ہے او عقل ہور جان کا

۲۔ جکوئی باٹ میں تجھ نشانی دیے ۱۴

ابنِ نشاطی کی مثنوی "پھولبن" کا شعر ہے :۔

---

۱۰ باقر آگاہ۔ عقاید مذہبِ امامیہ۔ ص ۲۳۹ مخطوطہ نمبر م ۸۹/۱ ۔ نیشنل میوزیم کراچی۔

۱۱ شیخ داؤد دھنیفی۔ ہدایاتِ ہندی۔ ص ۲۰۶ ۔ مخطوطہ نمبر م ۹۲/۱ ۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

۱۲ شاہ محمد حق نما۔ خزانۂ معرفت۔ ص ۶۹ ۔ مخطوطہ نمبر م ۱۲۵/۱ ۔ نیشنل میوزیم کراچی۔

۱۳ یقینؔ دکھنی۔ فتح المبین۔ ص ۱ ۔ مخطوطہ نمبر م ۹۲/۱ ۔ نیشنل میوزیم کراچی۔

۱۴ کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ۔ ص ۱ ۔ مرتبہ شیخ چاند ابنِ حسین۔ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۸ء

جو کچھ مطلب سو تیرا ہے خدا کے پاس منگ جم جم

سکل مقصود عالم جو کہ ہے موجود رحمانی ۱۵

ملا نصرتی کے دو مصرعے دیکھیے :-

۱۔ جو ہر کار لڑنے کون عازم ہوا۔

۲۔ جے کوئی غرض کیتا اپس مدعا ۱۶

بحری، ولی کے معاصر ہیں ان کے دو مصرعے درج ذیل ہیں :-

۱۔ تجھ دل میں جے لبے سو ہے سنج دل کھل آگہی

۲۔ اے جو تج تے جلوہ گر لیو جیو سور لوتن ہوا ۱۷

ولی کا ایک مصرع ہے :-

جو کنٹھا ہیرہ کی پہنے اسے گھر بار کرنا کیا ۱۸

"معراج العاشقین" منسوب بہ گیسو دراز کا جملہ ہے :-

ہور جے کوئی پہنک روح ہیں اُنو (وہ) بی (بھی) نماز کرتے اپنے اپے ۱۹

شمالی ہند میں اسمٰعیل امروہوی نے "جو" استعمال کیا ہے۔ ان کا مصرع ہے :-

جو سکرات کا وقت مشکل بہت ۲۰

---

۱۵ ابن نشاطی۔ پھولبن ص ۱۴۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان کراچی۔ سنہ ۱۹۵۵ء

۱۶ ملا نصرتی۔ دیوان نصرتی۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مطبع قوسین لاہور سنہ ۱۹۷۲ء

۱۷ بحری۔ کلیات بحری۔ ص ۱۳۴۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ۔ مطبع نول کشور لکھنؤ سنہ ۱۹۳۹ء

۱۸ ولی دکنی۔ علمی نقوش (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان) ص ۳۹۔ نشاط پریس کراچی۔

۱۹ منسوب بہ گیسو دراز۔ معراج العاشقین ص ۳۰۔ دکن دار الاشاعت کراچی۔ سنہ ۱۹۴۴ء

۲۰ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۱۷ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور سنہ ۱۹۶۹ء

فائز دہلوی کا مصرع ہے :۔

جو نیت دل مو خط عنبریں ہے [۲۱]

فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" کا جملہ ہے :۔

اور جو کوئی بیٹھے اوس مجلس میں کہ جس میں احوال ہمارے اور مناقب اور احادیثیں ہماری بیان کرتے ہوویں۔ [۲۲]

شمالی ہند میں عام طور پر 'جو' ہی استعمال ہوا ہے لہذا کثیر مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ تغیر صرف دکنی میں دیکھنے میں آتا ہے کہ وہاں 'جو' کے پہلو بہ پہلو 'جے' کا استعمال بھی ملتا ہے۔ جہاں تک اس کی غیر فاعلی اور مفعولی صورت کا تعلق ہے دکنی کی قدیم ترین دستیاب تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" میں بھی موجود ہے۔ چند مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ جنھیں مکھ دیٹھا نہ تھا باپ راج ۔

۲۔ تنھن پائے دیکھن پڑے منجہ آج ۔

۳۔ جیسے دیہہ سر بھاگ تو تس سرے

۴۔ جو پا نقر اپس کئی اٹھے تس اٹھائے۔

۵۔ کہ تس بول تیں لاب بن ہان سوئے ۔ [۲۳]

نثری مثالوں کے سلسلے میں "سب رس" سے ان استعمالات کی مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ جس، تس، جیسے، جنھیں، دکنی اور شمالی ہند میں یکساں طور پر مستعمل رہیں لہذا مزید مثالوں کی ضرورت نہیں۔

ماخذ

'جو' کے ماخذ کے سلسلے میں شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ اردو میں اسم موصول صرف ایک حرف "ج" ہے جس کی غیر فاعلی اور مفعولی صورتیں اوپر بیان ہوئیں۔ ان کے نزدیک 'جو' سنسکرت यः کا چربہ ہے۔ یہ

---

[۲۱] فائز دہلوی۔ دیوانِ فائز۔ ص ۱۸۳۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ عمدہ پریس دہلی ۱۹۴۶ء

[۲۲] فضل علی فضلی۔ کربل کتھا۔ ص ۵۱۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۵ء

[۲۳] فخر دین نظامی۔ کدم راؤ پدم راؤ۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۳ء

سنسکرت میں یئیں کہیں اور پراکرت میں عام طور سے ये بولا جاتا تھا۔ य کا 'ج' سے تبادل ایک عام بات ہے۔ "جے" 'جو' کی جمع ہے۔ جو پہلے مستعمل تھی اب متروک ہے ۲۴

"جو" کی غیر فاعلی حالت "جس" ہے۔ یہ سنسکرت کی اضافی حالت "یسیہ" سے حاصل کی گئی تھی۔ پراکرت میں اس کا روپ "جس" تھا۔ "جن" "جنھوں" کا مخفف ہے۔ "جنھوں" اصل میں "جنھونم" تھا۔ یہ صیغہ "تھونم" پر قیاس کر کے بنایا گیا تھا۔ اسم موصول 'جو' کے جواب میں جو ضمیر آتی ہے وہ "سو" اور "تو" ہے۔ یہ سنسکرت त یا तः سے ماخوذ ہے۔ "تو" کی غیر فاعلی حالت "تس" ہے۔ شوکت صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے تمام تغیرات اور ان کی تاریخ بالکل 'جو' کی طرح ہے۔ تو۔ تس۔ تن۔ تنھی۔ تنھوں ۲۵ تس۔ تنھیں اور تنھوں کی مثالیں دیکھیے :۔

"کدم راؤ پدم راؤ" سے کچھ مثالیں پہلے پیش کی گئیں۔ دو مصرعے مزید درج ذیل ہیں :۔

۱۔ رہیں سیو تے جرم تس پائے لگ۔

۲۔ کہ ہوں نہ تنھوں میں تجھے لیکھیا ۲۶

انہوں نے 'جنھوں' کے ساتھ ساتھ بغیر نون غنہ کے صرف 'جنھے' بھی استعمال کیا ہے۔ ایک مصرع دیکھیے :۔

جنھے مکھ اپنے پدارت بچن ۲۷

شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا ایک مصرع ہے :۔

تنھوں کا لوجہ سب کھا گما ۲۸

---

۲۴ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۵۸ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء۔

۲۵ ایضاً ص ۲۵۹۔

۲۶ فخر دین نظامی۔ کدم راؤ پدم راؤ ص ۷۲۔۷۳۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۳ء

۲۷ ایضاً۔ ص ۷۶۔

۲۸ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۲۱۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۶ء

شیخ خوب محمد چشتی گجراتی کا مصرع ہے:۔

جگ کہے یہ لیس لیس ڈھنگ [۲۹]

ابن نشاطی کی مثنوی "پھولبن" کا مصرع ہے:۔

محبت کا جو دیکھوں لیس میں دیدار [۳۰]

"جس" کے جواب میں "لس" آتا ہے اور "جو" کے جواب میں "تو"۔ لیکن دکنی میں کہیں "تو" کی جگہ "تے" بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ "معراج العاشقین" کا جملہ ہے:۔

پھرتے (تو) تو جانے گا۔ [۳۱]

"لس" شمالی ہند میں بھی عام طور پر استعمال ہوا ہے۔ شاہ حاتم کا مصرع ہے:۔

خط لیس اوپر سورۂ والشمس کی اسناد ہے [۳۲]

میر کا ایک مصرع دیکھیے:۔

جہاں کی سیر تمام حیرت نہیں ہے لیس پر نگہ کی فرصت [۳۳]

تاباں کا شعر ہے:۔

کس طرح رک کے نہ مر جائے کوئی مل تجھ سے
ایک تو تنگ دہاں لیس کے اوپر کم سخنی [۳۴]

---

۲۹ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص۴۹۔ نول کشور پریس۔ لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۳۰ ابنِ نشاطی۔ مثنوی پھولبن ص۲۔ انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کراچی۔ سنہ ۱۹۵۵ء

۳۱ منسوب بہ گیسو دراز۔ معراج العاشقین ص۲۷۔ دکن دارالاشاعت کراچی۔ سنہ ۱۹۶۱ء

۳۲ شاہ ظہور الدین حاتم۔ شاہ حاتم، حالات و کلام ص۶۷۔ مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۴ء

۳۳ میر تقی میر۔ کلیاتِ میر۔ ص۲۰۵۔ مطبع نول کشور۔ لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۷۱ء

۳۴ عبدالحیٔ تاباں۔ دیوانِ تاباں۔ ص۱۹۷۔ انجمن ترقیٔ اردو ہند۔ دکن۔ سنہ ۱۹۳۵ء

خواجہ میر دردؔ کہتے ہیں:-

تنھن پر بھی جو کچھ بنی سو دیکھی تم نے [۳۵]

میرامن کی "باغ و بہار" کا ایک جملہ ہے:-

تنھن پر بھی اپنی راستی پر، گریبان مونڈھے تلک چیر کر دکھایا [۳۶]

"جامع الحکایاتِ ہندی" کا جملہ ہے:-

تنھن پر احیاناً نا بہ مقتضائے بشریت سہو یا خطا یا نامربوطی عبارت کی پائی جاوے تو اصلاح دیں [۳۷]

شمالی ہند میں تنھن، تنھیں اور تنھوں کا استعمال نہیں ملتا۔ دکنی میں بھی بعد کو یہ استعمال متروک ہو گیا۔

---

[۳۵] خواجہ میر دردؔ - دیوانِ دردؔ ص ۱۵۲ - زرین آرٹ پریس لاہور - سنہ ۱۹۶۲ء

[۳۶] میرامن - باغ و بہار - ص ۱۳۶ - حمایت الاسلام پریس لاہور - سنہ ۱۹۶۸ء

[۳۷] شیخ صالح محمد عثمانی (مترجم) - جامع الحکایاتِ ہندی ص ۳ - زرین آرٹ پریس - لاہور -

اسم اشارہ قریب

اردو میں اسم اشارہ قریب کے لیے "یہ" اور بعید کے لیے "وہ" استعمال ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم اردو میں جو تغیرات دیکھنے میں آتے ہیں، درج ذیل ہیں۔

اردو کی قدیم ترین دستیاب مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں 'ایہہ' اور 'یہ' استعمال ہوئے ہیں جیسے درج ذیل مصرعے[1]

ع تیرا کر ذکر ایہہ کدم رائے آئے۔

ع کہ یہ کوڑ بانی دھرے بھت گن۔

شاہ میراں جی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ) کے یہاں اشارہ قریب کے لیے 'یو' استعمال ہوا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے[2]

یو دیکھت ہندی بول + پن معنی ہے پنتول

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م ۹۷۳ھ) کے یہاں 'ایہہ' دیکھنے میں آتا ہے جیسے یہ مصرع:[3]

ع ایہہ جو مانگیں ہوویں دمالی

مثنوی "قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) میں 'یو' اور 'یے' استعمال ہوئے ہیں۔ دو مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں[4]

---

1. فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۸۱-۱۱۷، مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء
2. مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۴۸۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء
3. ایضاً۔ ص ۵۷
4. ملا وجہی۔ قطب مشتری ص ۵ ص ۲۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سنہ ۱۹۵۳ء

ع خدا ہے توں یو کام تجکوں سنبھالے

ع تہیں ایک اچنا اہے پے مینے

"سب رس" (تصنیف ۱۰۴۵ھ) میں بھی یو کا استعمال ملتا ہے۔ ایک جملہ دیکھیے [۵]

دانش کے نیشے سوں پہاڑاں الثایا تو یو شیریں پایا، تو یو لوکاں بانٹے پیدا ہوئی۔

قلی قطب شاہ کے یہاں "پے" بھی دیکھنے میں آتا ہے مثال کے طور پر درج ذیل مصرع: [۶]

ع پے علم پور ریے کتاب پور کس سے بوجھیا جائے نا

"خاور نامہ" (سنہ ترجمہ ۱۰۵۹ھ) کا ایک مصرع ہے: [۷] ع اول جب کیا یو کتاب ابتدا۔

شاہ برہان الدین جانم کے فرزند اور خلیفہ، شاہ امین الدین اعلیٰ (م ۱۰۸۶ھ) کے دو جملے یہاں نقل ہیں [۸]

۱۔ یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔

۲۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں

شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید، سید میراں حسینی شاہ (م ۱۰۷۶ھ)، سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔

---

[۵] ملا وجہی۔ سب رس ص ۹۳۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

[۶] قلی قطب شاہ۔ کلیات قلی قطب شاہ۔ ص۔ مرتبہ سید محی الدین قادری زور۔ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۴۰ء

[۷] کمال خان رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ ص۱۔ ایجوکیشنل پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۸ء

[۸] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۶۶۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

اسم اشارہ
ص ۳۱

ان کی سب سے مشہور اور ضخیم کتاب "شرح تمہیدات ہمدانی" ہے جو "تمہیدات عین القضاۃ" کا ترجمہ ہے۔ اس کا سنہ کتابت بقول مولوی عبدالحق ۱۰۶۷ھ ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اردو کی قدیم نثری کتابوں میں خاص درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ علاوہ چند رسالوں کے، اس سے قبل نثر میں صرف وجہی کی "سب رس" پائی جاتی ہے۔ اس میں اسم اشارہ قریب کے لیے "اے" کا استعمال ملتا ہے مثلاً یہ جملہ: ۹ اے بات نہیں سُنیاں۔

معراج العاشقین، گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے درمیانی زمانے کی تصنیف ہے اور خواجہ گیسو دراز سے منسوب کی جاتی رہی ہے، لیکن درحقیقت مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ہے ۱۰ خواجہ گیسو دراز اس کی تصنیف سے تقریباً پونے تین سو سال قبل ۸۲۵ھ میں وفات پا چکے تھے۔ معراج العاشقین میں "اے" اور "یو" دونوں کا استعمال ملتا ہے مثلاً یہ جملے: ۱۱

۱۔ نا بوجھے تو اے آیت سُن۔

۲۔ یو پانچ عناصراں کا واحد الوجود بوجیا تو توحید تمام کا روح اسے کہتے ہیں۔

ولی نے بھی "یو" استعمال کیا ہے۔ جیسے یہ مصرع ۱۲ یو بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا۔

۹۔ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۶۶۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۵۳ء۔
۱۰۔ جمیل جالبی۔ مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۲۵ تا ۳۰۔
۱۱۔ مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری۔ معراج العاشقین ص ۲۱ تا ۲۵۔ مرتبہ مع تصحیح و فرہنگ تحسین سروری ۱۹۶۱ء دکن دارالاشاعت کراچی۔
۱۲۔ ولی۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۵۴ء
مزید امثال دیکھیے:۔ حسن شوقی کا مصرع ہے: آیا ہاتفِ غیب تے یو جواب۔

غواصی کا مصرع ہے:۔ سورے تھے یو موتی پرو رویا (پرویا) ہوں توں (شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۶۵)

جُنیدی، سلطان عبداللہ قطب شاہ کا معاصر، اسکی مثنوی "ماہ پیکر" کا مصرع ہے جس کی سو ہجرت کا یو تھا قرار۔ (ایضاً ص ۶۹)

اسم اشارہ
حصہ ۴

شمالی ہند میں اسم اشارہ قریب کے لیے "یہ" استعمال ہوا ہے لیکن "یو" کے استعمال کی مثالیں بھی کہیں کہیں مل جاتی ہیں مثال کے طور پر اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" (تصنیف ۱۱۰۵ھ) کے درج ذیل مصرعے [۱۳]

۱۔ یہ رہ توں جو عاقل یو دل میں پچھان

۲۔ ایہہ سوال کر کر جو منکر نکیر۔

فائز کے دو مصرعے بھی یہاں نقل کیے جاتے ہیں [۱۴]

۱۔ سانجھ آئی و (اور) یو دن بھی ہوا نکر میں آخر

۲۔ مارتی مجھ کوں اے کماں ابرو۔

فضلی کی "کربل کتھا" کا ایک مصرع ہے [۱۵] حاضراں لیں یو باخشوع وخضوع

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کے دورِ قدیم میں "یہ" کے علاوہ اشارۂ قریب کے لیے یو، اے، یے اور ایہہ بھی استعمال ہوتے رہے۔ ان میں زیادہ عمومیت "یو" کو حاصل رہی چنانچہ دکن کے اثر سے شمالی ہند کے ابتدائی دورِ شاعری میں بھی "یو" کا استعمال نظر آ جاتا ہے۔ اردو کی اپنی چیز غالباً "یہ" (یے) ہے، باقی لفظ

---

[۱۳] اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۳۸-۱۴۷۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ طبع اول دسمبر ۱۹۶۹ء

[۱۴] فائز۔ دیوانِ فائز ص ۱۱-۱۲۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی۔ عمدہ پریس دہلی سنہ ۱۹۴۶ء

[۱۵] فضل علی فضلی۔ کربل کتھا ص ۲۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس۔ دہلی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۶۵ء

اسم اشارہ قریب ۵

دوسری زبانوں کے اثرات کا نتیجہ تھیں چنانچہ شمالی ہند میں ان کا استعمال شاذونادر ہی ملتا ہے۔ بعد میں یہ دوسری لغات متروک ہوگئیں، صرف "یہ" برقرار رہا اور اشارۂ قریب واحد و جمع، دونوں کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ اس کی غیر فاعلی صورتوں میں تغیرات نہ ہونے کے سبب ان کی مثالیں درج کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

"یہ" کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ یہ مرکب حرکتِ اشارہ ए سے ماخوذ ہے۔ اس کی "ہ" "ش" کا بدل ہے۔ سنسکرت میں یہ صیغہ एष تھا۔ اردو کا عام رجحان ہے کہ کلمات کے شروع میں جو ए اور ओ آتے ہیں (جو بالترتیب अ - इ اور अ - उ سے مرکب ہیں) ان کا अ گر جاتا ہے اور इ کی جگہ "ی" اور उ کی جگہ "و" رہ جاتا ہے۔ مشرقی زبانوں میں گریرسن کے بقول अ کبھی نہیں گرتا۔ بہاری اور مشرقی ہندی میں "وہ"، کو "اوہ" اور "یہ" "ایہہ" کہتے ہیں۔ اس رجحان میں راجستھانی، "برج"، اردو کے ساتھ ہیں۔ مشرقی زبانوں کے ساتھ پنجابی ہے۔ غالباً اردو کے اثر سے اودھی میں "یو" اور "وینی" ملتے ہیں۔[16]

شوکت سبزواری کی رائے ہمارے اس خیال کی مؤید ہے جس کا اظہار ما قبل کیا جا چکا ہے کہ "یہ" کے علاوہ دوسری لغات غیر زبانوں کے اثرات سے اردو میں راہ پا گئی تھیں لہٰذا بعد میں متروک ہوگئیں ۔

---

[16] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۵۷۔ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ جولائی ۱۹۵۶ء

اسم اشارہ بعید

اسم اشارہ بعید کے لیے 'وہ'، استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم اردو میں بھی اس کا استعمال موجود تھا۔ تینر مرف اس قدر دیکھنے میں آیا کہ قدیم اردو میں 'وہ'، کے علاوہ "او" بھی مستعمل رہا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ" کے دو مصرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں [1]

۱۔ جو بہو لیین تی (سے) ڈرے وَہْ نڈان

۲۔ آو دوانت لگ راؤ ایس راؤ بل

شاہ میراں جی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ) کے یہاں وہ اور آو دونوں کا استعمال ملتا ہے۔ ان کے دو مصرے دیکھیے: [2]

۱۔ع: وہ مغز میئے لیو۔ ۲۔ع: وہ راکھے سمیٹ آن

ان کی مشہور کتاب "شرح مرغوب القلوب" نثر میں ہے اس کے دو جملے بھی یہاں نقل کیے جاتے ہیں [3]

۱۔ دیغمبر کہے جو کچھو کام کرے گا کوئی خدا کا ناؤں نالے کر تو آو کام پائمال ہوگا۔

۲۔ سرانا لو از نا خدا کوں بہت، کہ آو پالنہار رہے عالم کا۔

---

[1] محمد دین فوقی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۱۰۷-۱۰۶ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۳ء

[2] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۴۹۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

[3] محی الدین قادری زور۔ دکنی ادب کی تاریخ ص ۲۵۔ نشاط پریس کراچی۔ جون سنہ ۱۹۶۰ء

شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) کے دو مصرعے درج ذیل ہیں [۴]

مصرع ۱۔ باجن جس وہ کن کرے۔ مصرع ۲۔ وہ جائیں نہ اس تتی پارے

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م ۹۷۳ھ) کے کلام کا مجموعہ "جواہر اسرار اللہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں بھی وہ استعمال ہوا ہے۔ دو مصرعے دیکھیے [۵]

مصرع ۱: سوئے نہیں ہوناں وہ ایسا مصرع ۲: وہ ہی سمند سو لونڈو کھالے

یہی صورت شاہ برہان الدین جانم (م بعد ۹۹۰ھ) کے یہاں بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ ان کا رسالہ "کلمۃ الحقائق" نثر میں ہے۔ اس سے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں [۶]

دوسرا تن سو بھی کہ اس کا ایندریں کا بکار و چیشٹا کرنہارا سو وہ ہی تن، نہیں یو خاک و کوکھ دکھ بھوگن ہارا، جیتا بکار روپ وہ ہی دوسرا تن، تو توں نظر کر دیکھ۔

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) اور سب رس (نثری تصنیف ۱۰۴۵ھ) میں وہ اور وو استعمال ہوا ہے۔ قطب مشتری کا مصرع ہے [۷] سو وو جان بسان اپس گیان تے۔

---

[۴] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۳۲۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۵۳ء

[۵] ایضاً ص ۷۰-۶۹

[۶] ایضاً۔ ص ۶۶۔

[۷] ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص ۱۹۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

"سب رس" کا جملہ ہے [8]

بو کوٹ ہوئے تو وو کوٹ سپاوے، بو کوٹ نیں تو وہ کوٹ کیا کام آوے۔

خاور نامہ (سنہ تصنیف ۱۰۵۹ھ) میں وہ کے علاوہ آو کا استعمال بھی ہوا ہے۔ دو مصرعے درج ذیل ہیں [9]

۱۔ لگے خال وہ رات کی مثل تھے۔

۲۔ دیوے رنگ زر کا آو سیماب کوں۔

مثنوی "پھولبن" (تصنیف ۱۰۷۶ھ) میں آو کا استعمال عام ہے۔ اس کے دو مصرعے دیکھیے [10]

۱۔ دسیا سو حال آو معراج کی رات۔

۲۔ ہے گوشہ ایک آو تیرے کماں کا

بحری کے یہاں آو اور وہ دونوں نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ مصرعے [11]

۱۔ تو ترا شا پر سو آو باقی ہے سو کھوٹ سنگاسے

۲۔ یارب وہ سب کماں ہے کہ جیوں آرزو من میں

---

[8] ملا وجہی۔ سب رس ص ۱۵۳۔ مرتبہ مولوی عبد الحق (مع مقدمہ)۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

[9] کمال خان رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ ص ۱۶ ق ۱۔ مرتبہ شیخ چاند ابن حسین۔ ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

[10] ابن نشاطی۔ مثنوی پھولبن۔ ص ۷ ق ۶۔ مرتبہ شیخ چاند ابن حسین۔ انجمن ترقی اردو کراچی سنہ ۱۹۵۵ء

[11] قاضی محمود بحری۔ کلیات بحری ص ۴ ق ۱۲۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حنیظ۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

شمالی ہند میں او کا استعمال عام طور پر نہیں ملتا۔ صرف ایک آدھ جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر،
اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" میں وہ کے علاوہ او بھی مل جاتا ہے۔ دو مصرعے دیکھیے [۱۲]

۱۔ نہائے اتی وہ عجب خوب تر

۲۔ نجانوں او کیا مجھ پوچھنے آئے ہے

ان کے بعد او کا استعمال دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اردو کی اپنی چیز ہے لہٰذا برقرار رہا، او
متروک قرار پایا۔ وہ اردو میں شروع ہی سے موجود رہا ہے اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے مل جاتا ہے کہ اردو کی
قدیم ترین دستیاب مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں وہ کا استعمال ملتا ہے۔

اسم اشارہ بعید "وہ" کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ "وہ" کی تاریخ ذرا الجھی
ہوئی ہے۔ قدیم ہند آریائی یا ہند ایرانی میں اسم اشارہ بعید اور ضمیر غائب کے لیے الگ الگ صیغے تھے۔ اشارے کے لیے
"ے"، "دے"، "دو"، اور ضمیر کے لیے "ش" "س" اور "ت"۔ یہ صیغے کچھ عرصے تک ایک دوسرے سے ممتاز رہے
اور جدا جدا اپنے معنے دیتے رہے۔ اس بعد یہ خلط ملط ہوئے اور گھل مل کر ایک ہو گئے۔ ضمیر اور اشارہ کے درمیان اشتباہ
ان کے گھل مل جانے کی وجہ سے ہوا۔ ترکیب کے بعد ان کی جداگانہ ہستی بالکل فنا نہ ہوئی۔ وہ الگ الگ بھی استعمال ہوتے
رہے اور ترکیب پا کر بھی لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے ان میں جو فرق تھا وہ ہند و ایران کی ادبی اور بول چال کی زبان میں

۱۲؎ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۱۷۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور سنہ ۱۹۶۹ء

نہ رہا۔ پہلوی میں "او" اور "مش" کے ساتھ "اوش" بھی استعمال ہوتا تھا اور سنسکرت میں सः (وہ)

اور अयं کے پہلو بہ پہلو एषः اور असौ بھی بولے جاتے تھے۔ "وہ" اسی عہدِ تہذیب و تمدن کی یادگار

ہے۔ اس میں دونوں کلموں کے عناصر موجود ہیں۔ "و" تو "اُو" یا "اُو" کا قائم مقام ہے اور "ہ"

"س" یا "ش" کی۔ اس کے درمیانی حلقے یہ ہیں:۔

اوش ۔ اوس ۔ اوہ ۔ وہ یا اُہ ۔ اُہ مشرقی زبانوں میں ہے[13]

ڈاکٹر چٹرجی نے "وہ" کو سنسکرت کے وضعی روپ अव سے نکالا ہے[14] اور اس کا جوڑ ایرانی

"او" سے لگایا ہے۔

ہیری اودھ اسے سنسکرت असौ پراکرت अमु اور اپ بھرنش मु سے نکالتے ہیں[15]

سکینہ نے چٹرجی کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسم اشارہ قریب "یہ" یا "یے" کی مثال پر "وے"

"وو" (اُو) بعید کے لیے وضع کر لیا گیا[16] کیلاگ "اوشہ" کو "وہ" کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ قدیم سنسکرت میں "उ" (اُ) ایک حرف تھا جو اشارۂ بعید کا کام دیتا تھا۔ زمانے نے صفحۂ زبان سے اس کو محو

کر دیا یہ حرف سنسکرت "اُت"، "اُپ"، "اُپر" کے شروع میں آج بھی موجود ہے[17]

---

[13] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۵۳ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

[14] ایضاً۔ بحوالہ چٹرجی۔ بنگالی ص ۸۳۸ ۔

[15] ایضاً۔ بحوالہ ہیری اودھ۔ ہندی بھاشا ص ۸۹

[16] ایضاً بحوالہ سکینہ۔ اودھی کا ارتقا ص ۱۸۰

[17] ایضاً بحوالہ کیلاگ۔ ہندی گرامر ص ۲۱۴۔

نوٹ:۔ ضمائر اشارہ اور ضمائر شخصی اصل میں ایک ہی ہیں لیکن جب بطور اشارہ استعمال ہوتی ہیں تو انہیں ضمائر اشارہ کہتے

ضمیر شخصی واحد و جمع غائب

اردو میں واحد و جمع غائب کے معنوں میں ضمیر 'وہ' استعمال ہوتی ہے۔ قدیم اردو میں یہ صورت نہیں تھی۔ واحد اور جمع کی ضمیروں میں تفریق کی جاتی تھی۔ چنانچہ واحد غائب کے لیے 'وہ'، اور جمع غائب کی صورت میں 'وے' مستعمل تھا۔ البتہ کبھی کبھی ضمیر جمع غائب برائے واحد غائب بھی ملتی ہے۔ دوسرے یہ کہ قدیم اردو میں، واحد غائب کے لیے کہیں "اُو" یا "اَو" اور کہیں دو واؤ کے ساتھ "او و" بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں ادبِ اردو سے مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ اردو کی قدیم ترین دستیاب مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں 'وہ' اور 'او' دونوں کا استعمال ملتا ہے۔ مثال کے طور پر درجِ ذیل مصرعے دیکھیے: ۱؎

۱۔ اَو دو اَنت تک راؤ اَپس راؤ بل

۲۔ ڈرے کیوں نہ وہ دیکھ پھاند اپڑی ع۱

جمع کے لیے 'وے'، استعمال ہوا ہے مثلاً یہ مصرعے: ۲؎

۱۔ جو وے دیس دیویں تھکن رات تھان۔

۲۔ جو وے پٹ دے منہ پر کھر مصتور ع۲

۱؎ فخر دین نظامی۔ کدم راؤ پدم راؤ ص ۷۱-۹۳ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء

۲؎ ایضاً۔ ص ۱۳۲، ۱۳۳

حضرت میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ) کا ایک رسالہ "مرغوب القلوب"

نثر میں ہے۔ اس کا ایک جملہ ہے: [۴]

سرانا تو ازنا خدا کوں بہوت کہ اوو پالنہار ہے عالم کا [۳]

شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) کے یہاں دو واؤ کے ساتھ "دو" استعمال ہوا ہے۔ مثلاً [۴]

ع باجن وو جن کوئی ناہیں سب آپ ہی بھرپور

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" ۱۰۱۸ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں "وہ" اور "وو" دونوں ملتے

ہیں۔ جیسے درج ذیل مصرعے [۵]

ع اسی دھیان میں نت وہ رہتا اچھے۔

ع سو مشہور اس عشق تی وو اہیں۔

یہ دو واؤ کے ساتھ "وو" کا استعمال ضمیر کے طور پر بھی ہوا ہے اور اسم اشارہ کے طور پر بھی مثلاً [۶]

ضمیر: ع بجا ہو کے جد وو جو دھرنے لگیا

اسم اشارہ ع توں وو کام کر جو تجے کام آئے

---

[۳] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵۶۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۶۸ء

[۴] ایضاً۔ ص ۳۲

[۵] ملا وجہی۔ قطب مشتری ص ۱۱-۱۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۵۳ء

[۶] ایضاً۔ ص ۶-۴۳

اس مثنوی میں 'وے' کا استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے درجِ ذیل مصرع سے

کہ وے باٹ میں رات کوں شمع تھا۔

وجہی کی سب رس[8] میں 'وہ' اور 'وو' دونوں مستعمل ہیں۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے:

۱۔ صاحب وہیچہ جیسے صاحبی کرنی آئی، نفر وہیچہ جوکر جانتا ہے نفرائی۔ (وہ + چ تاکیدی)

۲۔ گھر دھنی ووچہ جس کوں گھر ہے خوب، ووچہ صاحب جیسے نفر ہے خوب۔

ایک اور جملے میں یہ دونوں پہلو بہ پہلو دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً:[9]

یو کوٹ ہوئے تو وو کوٹ سہاوے، یو کوٹ نیں تو وہ کوٹ کیا کام آئے۔

قلی قطب شاہ کے کلام میں عام طور پر دو واؤ کے ساتھ 'وو' استعمال ہوا ہے۔ لیکن کہیں کہیں 'وہ'

بھی دیکھنے میں آسکتا ہے۔ دو مصرعے یہاں درج ہیں:[10]

۱۔ اگر وہ ملتفت ہو وے ہماری بات پر یک چھن

---

[7] ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص ۸۰۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

[8] ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۱۷ - ۱۳۷۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

[9] ایضاً۔ ص ۱۵۳ غالب نے بھی وو استعمال کیا ہے ---- وو آئے

[10] قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ۔ ص ۴۲۹ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد (دکن) مرتبہ زور سنہ ۱۹۴۰ء

۲- دو بزرگی دیکھ پگ پڑتا ہے خاقان عہد کا۔

قلی قطب شاہ کے کلام میں "او" کا استعمال بھی ملتا ہے لیکن کم۔ جیسے یہ مصرع: [۱۱]

نہ جانوں میں کہ او بے رحم ہے سب جگ میں آدم کا۔

کمال خاں رستمی کے "خاور نامہ" میں صرف "او" کا استعمال ملتا ہے۔ مثلاً یہ مصرعے: [۱۲]

۱۔ دلیوے رنگ زر کا او سیماب کوں

۲- جو او بدگہر نے ہوا بدلگام

نصرتی (م ۱۰۸۲ھ) کے یہاں وو اور او دونوں کا استعمال موجود ہے۔ مثلاً [۱۳]

ع ولے وو جو ہے او خبر بے تمیز

ع وو دلبر دل میں جاگا (جاگم) کرے لکھ (لکھا) امید

البتہ "وہ" کا استعمال شاذ ہے۔ ایک مصرع ہے: سنوارے گیا جب وہ آرام گاہ۔

ولی کے کلام میں عام طور پر "وہ" استعمال ہوا ہے البتہ کہیں کہیں وو بھی مل جاتا ہے لیکن بہت کم۔ ولی

---

[۱۱] قلی قطب شاہ - کلیات قلی قطب شاہ۔ ص ۴۲۹ مرتبہ زور۔ مطبعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء

[۱۲] کمال خاں رستمی بیجاپوری - خاور نامہ - ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۸ء

[۱۳] نصرتی - دیوان نصرتی - مرتبہ جمیل جالبی - مطبع قوسین۔ لاہور - ۱۹۷۲ء

کے کلام سے دو مصرعے یہاں نقل ہیں [14]

۱- رہے وہ مو کمر جیوں دیدۂ تصویر حیراں ہو

۲- تری وو انتظاری ہے کہ جس حد ہور نہایت نیں۔

"معراج العاشقین" ایک عرصے تک خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب رہی لیکن جدید تحقیق سے ثابت ہے کہ وہ بارھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے [15] اس میں صرف او کا استعمال ہوا ہے مثلاً یہ جملہ [16]

پانچواں تن واحد الوجود۔ اس کا فرشتہ ابلیس۔ او خدا کے دروازے پر رہتا ہے۔

اس کے علاوہ کوئی صورت اس میں نہیں ملی۔

---

[14] ولی۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۵۴ء

[15] جمیل جالبی نے مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ میں لکھا ہے کہ معراج العاشقین دراصل تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے۔ یہ رسالہ اور اس کا خلاصہ دونوں مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ہیں۔ مخدوم شاہ حسینی، میر الدین حسینی کے مرید و خلیفہ تھے جو میراں جی خدانما کے مرید و خلیفہ تھے۔ میراں جی خدانما کا سالِ وفات ۱۰۷۰ھ ہے۔ یہ حضرت امین الدین اعلیٰ کا سلسلہ ہے اور تلاوۃ الوجود میں جس کا خلاصہ معراج العاشقین ہے، سلسلۂ امینیہ کے مخصوص تصوف کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تصنیف گیارھویں صدی ہجری کے اواخر اور بارھویں صدی ہجری کے اوائل کی تصنیف ہے جب کہ حضرت گیسو دراز کا سالِ وفات ۸۲۵ھ یعنی تقریباً پورے تین سو سال پہلے ملتا ہے
ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۲۵-۳۰۔

[16] مخدوم شاہ حسینی۔ معراج العاشقین۔ ص ۲۰۔ مقدمہ مع تصحیح و فرہنگ، تحسین سروری ۱۹۶۲ء

محمد امین امینؔ ایک گجراتی شاعر ہیں۔ انہوں نے اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں انتقال کیا۔ یوسف زلیخا کی

داستان گوجری میں منظوم کی ہے جو بارھویں صدی ہجری کے اوائل (۱۱۰۹ھ) میں تمام ہوئی۔ اس میں "وے" کا

کا استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً درج ذیل شعر: [۱۷]

اول تعریف سن خالق کی اے یار
کہ وے دونوں جہاں کا ہے کرنہار

شمالی ہند میں ۷۲۵ھ کے قریبی زمانے کا ایک جملہ ملتا ہے جو خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی نے اخی سراج سے

کہا تھا[۱۸] جملہ یہ ہے:۔

تم اوپر، وے تلے۔

---

[۱۷] شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۵۲۔ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء

[۱۸] شیخ سراج الدین عثمان، جو اخی سراج کے لقب سے مشہور ہیں سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیا کے مرید اور خواجہ نصیر الدین

چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔ ۷۵۸ھ میں آپکا انتقال ہوا سلطان المشائخ کی وفات (جو ۷۲۵ ہجری میں ہوئی) کے بعد آپ بنگالہ

سے دہلی تشریف لائے اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا خواجہ صاحب نے بنگالہ جانے کی ترغیب دی لیکن

اخی سراج نے عرض کیا کہ وہاں پہلے سے شیخ علاؤ الدین مُل موجود ہیں اور خلایق کا رجحان انکی جانب ہے میرے وہاں جانے سے

کیا نتیجہ ہے۔ اس پر خواجہ صاحب نے ہندی زبان میں ارشاد فرمایا "تم اوپر وے تلے" شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم۔ ص ۲۳

اسمٰعیل امروہوی (۱۰۵۴ھ – ۱۱۲۳ھ)، بزمانۂ عالمگیر ایک علمی منصب پر فائز تھے۔ ان سے دو مثنویاں مشہور ہیں۔ مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" ۱۱۰۵ھ میں لکھی گئی، دوسری مثنوی "معجزۂ انار" پہلی مثنوی سے قریب پندرہ برس بعد، ۱۱۲۰ ہجری میں لکھی۔ پہلی مثنوی سے دو مثالیں درج ذیل ہیں: [19]

او ۔ ؏ حکم حق سیں او بولیا بے عدیل

وے ؏ کھاویں گے بہوت وے خوش ہوکے کر۔

اس مثنوی میں "او" کا استعمال بہت عام ہے۔ دوسری مثنوی میں اس کے علاوہ "وہ" بھی ملتا ہے مثلاً [20]

وہ ؏ کہا وہ محمدؐ مجھی کو پچھان۔

شمالی ہند میں قدیم ترین صاحبِ دیوان شاعر فائز ہیں۔ انہوں نے ۱۱۲۷ ہجری میں اپنی کلیات مرتب کر لی تھی، ولی کا دیوان اس کے کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۱۳۲ ہجری میں دہلی پہنچا تھا۔ فائز کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ضمیر واحد غائب کے طور پر "وہ" اور "وو" دونوں مستعمل تھے۔ زیادہ تر "وو" دیکھنے میں آتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو [21]

---

[19] اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۱۶-۱۳۶ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ دسمبر ۱۹۶۹ء

[20] ایضاً۔ ص ۱۵۵۔

[21] فائز۔ دیوانِ فائز۔ ص ۱۷۵۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ عمدہ پریس دہلی۔ سنہ ۱۹۴۶ء۔

وہ کے دل کے شکار میں وہ شہباز ہے سراپا

وو سے مجھ پاس کبھی وو قدِ شمشاد نہ آیا

اس گھر میں وو دلبرِ استاد نہ آیا

شاہ حاتم (م ۱۱۹۷ھ) شمالی ہند کے ایک اور قدیم شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ضمیر واحد و جمع غائب کے طور پر "وہ" اور "وے" استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے دو مصرعے یہاں نقل ہیں[22]

وہ کے صاحب دلوں کو حشر تلک ہے وہ سجدہ گہ

وے کہ وے علم عاشقی کے سپاہ کدھر گئے

عبدالحئی تاباں، شمالی ہند کے ایک اور شاعر ہیں۔ ان کا سالِ وفات ۱۱۶۱ھ یا ۱۱۶۵ھ متعین کیا جاتا ہے۔ حاتم کو ان سے متقدم رکھنے کا سبب یہ ہے کہ تذکروں میں تاباں کو کہیں حشمت کا شاگرد لکھا گیا ہے تو کہیں حاتم کا۔ البتہ داخلی شواہد سے حشمت کا شاگرد ہونا ثابت ہے۔[23] ان کے کلام میں بھی "وہ" اور "وے" دونوں کا استعمال موجود ہے۔ نمونۃً دو مصرعے درج ہیں:[24]

---

[22] شاہ حاتم۔ حالات و کلام، مرتبہ غلام حسین ذوالفقار ص ۷۳-۶۶۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور، سنہ ۱۹۶۴ء

[23] تاباں کا شعر ہے: سے کرے تو کس طرح تاباں غلط الفاظ معنی میں + کہ تیرے بیچ حشمت سا ترا استاد بیٹھا ہے۔ دیوان، ۱۶۸

[24] عبدالحئی تاباں۔ دیوانِ تاباں۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن سنہ ۱۹۳۵ء۔

وہ ےؔ اب تلک غافل ہے میرے حال سے وہ خود پسند

وے ےؔ نہ گلشن دیکھ سکتی ہیں نہ اب وے آشیاں اپنا

اس دور کی نثری تصنیف فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" ہے۔ اس میں 'وہ' اور 'وو' دونوں دیکھنے میں آتے ہیں مثال کے طور پر یہ دو مصرعے [۲۵]

وہ ےؔ وہ نبیؐ جس کے وصف میں لولاک

وو ےؔ عون لائے وو ہیں فی النّو اشتبہ

اسی کا ایک جملہ ہے:[۲۶]

اور ہاں اوس کے اختیار میں دیکھیو کہ وہ تجھے اس قوم سے باہر لے جاوے۔

خواجہ میر دردؔ کے کلام میں 'وہ' اور 'وو' کے علاوہ 'وے' بھی ملتا ہے مثلاً [۲۷]

وہ ےؔ کرتا نہیں وہ بات سوا گفتگو کے تیغ۔

وو ے مراغنچۂ دل ہے وو دل گرفتہ + کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

وے ےؔ بھول جا خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر

---

[۲۵] فضل علی فضلی۔ کربل کتھا۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس۔ دلی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۶۵ء صفحہ ۱-۳

[۲۶] ایضاً۔ صفحہ ۲۰۳

[۲۷] دردؔ۔ دیوانِ دردؔ۔ صفحہ ۶۰-۶۰ صفحہ ۸۱- مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۲ء

میر تقی میر کی کلیات میں بھی 'وہ' اور 'وے' دیکھنے میں آتا ہے لیکن آو کا استعمال ان کے یہاں بھی نہیں ہے۔ دو مصرعے درج ذیل ہیں:[28]

وہ ع بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

وے ع نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ وے جھگڑے غزالوں کے

میر امن کی "باغ و بہار" ۱۲۱۷ ہجری کی تصنیف ہے۔ ان کی نثر میں 'وہ' اور 'وے' عام مستعمل ہیں۔ "باغ و بہار" سے دو جملے یہاں لکھے جاتے ہیں:[29]

وہ:- جس نے تجھے مارا، میری آہ کا تیر اس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے۔

وے:- فقط یہ غنیمت نہیں جانتے کہ وے تمہاری قید میں ہیں۔ نہیں تو تم اور وے برابر ہو۔

سودا کے کلام میں یہ استعمال ملاحظہ ہو:[30]

وہ ع دوں نہ سمجھے وہ مجھے کہتے ہیں جو وے مجھ کو

وو ع یہ ہیں کہ ادھر دھویا، وو ہیں اُدھر آلودہ

وے ع وے مرد تھے جو اٹھ گئے رکھ نام جہاں پر

۲۸؎ میر تقی میر۔ کلیاتِ میر۔ صفحات ۲۳، ۵۷ بترتیبِ جدید مع مقدمہ و فرہنگ۔ باہتمام کیری داس مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۹۴۱ء

۲۹؎ میر امن۔ باغ و بہار۔ صفحات ۱۰۹-۱۶۹۔ حمایت الاسلام پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۸ء

۳۰؎ مرزا رفیع الدین سودا۔ کلیاتِ سودا (جلد اول) صفحات ۱۹۱-۲۰۱، ۳۴۵ مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ زرین آرٹ پریس لاہور سنہ ء

شیخ صالح محمد عثمانی نے "سیرِ عشرت" یا "جامع الحکایات" کے دس ابواب میں سے چند منتخب حکایات

کا ترجمہ "جامع الحکایاتِ ہندی" کے نام سے، ۱۲۰۰ ہجری میں کیا۔ اس میں بھی وہ اور وے استعمال

ہوئے ہیں۔ او اور وو نہیں ملے۔ دو جملے یہاں نقل ہیں: ۳۱

وہ:۔ آدمی کے مذہب میں ایسا ہی ہے جس سے کوئی نیکی کرے، وہ اس کے بدلے بدی کر دکھاوے۔

وے:۔ وے دونوں تو بزرگ ہیں۔ یہ باغ ان کی نذر ہے۔

اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردوئے قدیم میں 'وہ' کے ساتھ 'او' اور 'وو' بھی

دیکھنے میں آتے ہیں، جمع غائب کے لیے ضمیر 'وے' استعمال ہوتی رہی ہے، دکن میں بھی، شمالی ہند میں بھی۔

دکنی اردو میں "کدم راؤ پدم راؤ" ۸۲۵ھ و ۸۲۹ھ کے درمیانی زمانے کی تصنیف ہے جس میں 'وے' کا

---

۳۱ شیخ صالح محمد عثمانی۔ مترجم "جامع الحکایاتِ ہندی" صفحہ ۲۲-۲۵۔ مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر۔ زرین آرٹ پریس لاہور

نوٹ:۔ برج بھاشا (عہدِ اکبر و جہانگیر میں) میں عبد الرحیم خانِ خاناں کے دوہے مشہور رہے۔ ایک دوہا درج ذیل ہے:

بھار جھونک کے بھاڑ میں رحیمن اترے پار

وہ بوڑے منجدھار میں جن کے سر پر بھار

چاہ گئی چنتا مٹی، منوا بے پرواہ

جن کو کچھ نہ چاہیے، وے ساہن کے ساہ

استعمال ملتا ہے۔ شمالی ہند میں اس سے بھی قدیم تر مثال مل جاتی ہے یعنی خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کا جملہ، جو ۷۲۵ ہجری کے قریبی زمانے کا جملہ ہے۔ 'او' کا استعمال قدیم اردو میں زیادہ ملتا ہے حتیٰ کہ دکنی دور سے ہٹ کر شمالی ہند میں اسمٰعیل امروہوی کے یہاں بھی دیکھنے میں آتا۔ پھر بتدریج متروک ہونے لگتا ہے۔ البتہ 'وہ' کے پہلو بہ پہلو 'وو' عرصے تک دیکھنے میں آتا ہے چنانچہ غالب کے یہاں بھی اس کی مثال مل جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ بالکل متروک ہو جاتا ہے اور صرف 'وہ'، اور 'وے' باقی رہتے ہیں۔ بعد میں واحد و جمع غائب، دونوں کے لیے صرف ضمیر 'وہ' برقرار رہتی ہے جو کہ اردو کی اپنی چیز ہے۔ دیگر لغات غالباً غیر زبانوں سے اردو میں شامل ہو گئی تھیں لہٰذا ان کا چلن متروک ہو گیا۔

ماخذ ضمیر غائب کے سلسلے میں ماہرینِ لسانیات کی آراء و نظریات حسبِ ذیل ہیں۔

شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ قدیم ہند آریائی یا ہند ایرانی میں اسم اشارہ بعید اور ضمیر غائب کے لیے الگ الگ صیغے تھے۔ اشارے کے لیے یِ، ے، ےُ اور ضمیر کے لیے ش، س اور ت۔ یہ صیغے کچھ عرصے تک ایک دوسرے سے ممتاز رہے اور جدا جدا اپنے معنے دیتے رہے۔ اس کے بعد یہ خلط ملط ہو گئے اور گھل مل کر ایک ہو گئے۔ ضمیر اور اشارے کے درمیان اشتباہ ان کے گھل مل جانے کی وجہ سے ہوا۔ ترکیب کے بعد ان کی جداگانہ ہستی بالکل فنا نہ ہوئی بلکہ وہ الگ الگ بھی استعمال ہوتے رہے اور ترکیب پا کر بھی۔ لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے ان میں جو فرق تھا وہ ہند و ایران کی ادبی اور بول چال کی زبان میں نہ رہا۔ پہلوی میں 'او' اور 'ش' کے ساتھ 'اوش' بھی استعمال ہوتا تھا اور سنسکرت بھی :स (وہ) اور अय

کے پہلو بہ پہلو एष: اور असौ بھی بولے جاتے تھے۔ "وہ" اسی عہدِ تخریب و تعمیر کی یادگار ہے۔ اس میں دونوں کلموں کے عناصر موجود ہیں "و" تو "اَوَ" یا "اُو" کا قائم مقام ہے اور "ہ" "س" یا "ش" کی۔ اس کے درمیانی حلقے یہ ہیں:۔

اوش۔ اوس۔ اوہ۔ وہ۔ یا اُوہ۔ "اُوہ" مشرقی زبانوں میں ہے [۳۲]

ڈاکٹر چیٹرجی نے "وہ" کو سنسکرت کے فرضی روپ अव سے نکالا ہے۔ اور اس کا جوڑ ایرانی "اَو" سے لگایا ہے [۳۳]

ھری اودہ، سنسکرت असौ پراکرت असु اور اپ بھرنش सु سے نکالتے ہیں [۳۴]

سکسینہ نے چیٹرجی کے اشتقاق سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسم اشارہ قریب "ے" یا "رے" کی مثال پر "ۓ" یا "ۓو" (اُو) بعید کے لیے وضع کر لیا گیا [۳۵] یہ خیال شوکت سبزواری کے خیال سے قریب تر ہے۔

---

[۳۲] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۵۲-۲۵۳ سنہ ۱۹۵۶ء [۳۳] ایضاً ص ۲۵۳۔ بحوالہ بنگالی ص ۸۲۷

[۳۴] ایضاً ص ۲۵۳۔ بحوالہ ~~ڈاکٹر چیٹرجی~~۔ ہندی بھاشا ص ۸۸۔

[۳۵] ایضاً ص ۲۵۳۔ بحوالہ اودھی کا ارتقا۔ ص ۱۸۰۔

کیلاگ، "اوسثہ" کو 'وہ' کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم سنسکرت میں

उ (اُ) ایک حرف تھا جو اشارۂ بعید کا کام دیتا تھا۔ زمانے نے صفحۂ زبان سے اس کو محو کر دیا۔

یہ حرف سنسکرت "اُت" "اُپ" "اُبر" کے شروع میں آج بھی ہے اور اپنے وجود کا اظہار کر رہا ہے۔[۳۶]

دکنی اردو میں 'او' کی موجودگی اور شمالی ہند میں اسمٰعیل امروہوی کے یہاں بھی 'او' کے استعمال سے اس

کی تائید ہوتی ہے۔ اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" میں حرف 'اُ' کی موجودگی کا بھی

ثبوت ملتا ہے مثال کے طور پر ان کا یہ مصرع :[۳۷]

اُ تھا ملک خیبر بڑے بھار کا

مرتبِ مثنوی نے صراحت کی ہے کہ "اُ تھا" دراصل 'او تھا' یعنی 'وہ تھا' کے بجائے آیا ہے۔

کیلاگ نے جس قدیم سنسکرت میں جس उ (اُ) کی نشاندہی کی ہے بعض کلموں کے آخر میں بھی

اس کے آثار ملتے ہیں جیسے सउ - साउ - اور तदउ - یہ کلمے (وہ مذکر) सा (مونث) اور

तद (بے جنس) پر उ (اُ) لگا کر بنائے گئے ہیں۔

اردو میں ضمیر غائب کی اصل "وہ" ہے۔ اس لیے علامت جمع "ے" اس پر اضافہ کی گئی اور حسبِ

۳۶۔ اردو زبان کا ارتقا صفحہ ۲۵۳ ۔ بحوالہ ہندی گرامر صفحہ ۲۱۔

۳۷۔ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ۔ صفحہ ۱۲۹ ۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور دسمبر ۱۹۶۹ء

قاعدہ "وے" (صیغۂ جمع) بنالیا گیا۔ "ے" لگا کر جمع بنانے کا قاعدہ ہند یورپی زبانوں میں قدیم سے تھا۔ انگریزی میں ELK کی جمع ELKS ہے جو لفظی اور معنوی اعتبار سے سنسکرت ते (وے) کے قائمقام ہے۔[۳۸] اردو میں "وے" اب متروک ہے اس کی جگہ "وہ" ہی بولتے ہیں۔

ھورنلے "وہ" کو अवद्ध سے منحوت مانتے ہیں۔ جو ان کے نزدیک अव اور द्ध سے مرکب ہے۔[۳۹] یہ زیادہ قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ اگر "وہ" کو "اوہ" سے ماخوذ مانا جائے تو قدیم ادبِ اردو میں اول اول صرف "اوہ" ملنا چاہئے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد "وہ" کا استعمال ملنا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے برعکس "اوہ" کے بجائے صرف "او" (بغیر "ہ") ملتا ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو "وہ" بھی موجود ہے۔ امکان اس بات کا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف لغات سے ماخوذ ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو دونوں پہلو بہ پہلو نہ ملتے۔

کیلاگ نے "اوشہ" کو "وہ" کا ماخذ قرار دیا ہے یہ خیال شوکت سبزواری کے خیال سے قریب تر ہے

۳۸؎ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ص۲۵۵۔ دی سٹی پریس۔ ڈھاکہ۔ طبع اول جولائی ۱۹۵۶ء

۳۹؎ ایضاً ص۲۵۵۔ بحوالہ ھورنلے۔ تقابلی گرامر۔ پارہ ۴۸۵۔

अवद्ध (اوہ) کی مثال میرٹھ کی دیہاتی اردو (کلیاتِ دلمیر) میں ملتی ہے۔ بغیر "ہ" کے صرف "او" کا استعمال دکنی اور شمالی ہند کی اردو میں بھی مل جاتا ہے۔ صرف "ا" کے استعمال کی بھی ایک آدھ مثال مل جاتی ہے۔

ماخذ

وہ اس کا ماخذ "اوش" کو ٹھہراتے ہیں جب کہ کیلاگ نے آخر میں اس پر ایک 'ہ' کا اضافہ اور کر دیا ہے۔
کیلاگ کا خیال ہے کہ قدیم سنسکرت میں ایک (او) سے ایک حرف تھا جو اشارۂ بعید کا کام دیتا تھا جب کہ
سکسینہ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "وے" یا "وو" کو بعید کے لیے، اسم اشارہ قریب "یہ" یا "یے"
کی مثال پر وضع کر لیا گیا۔ دونوں لسانیین کے نزدیک "وے" یا "وو" کا ایک وجود ہے اور اردو کے قدیم
نمونوں میں بھی "او" کا سراغ ملتا ہے۔ یہاں ایک بار پھر شوکت صاحب کی رائے کا اعادہ ضروری معلوم
ہوتا ہے۔ وہ "اوش" سے 'وہ' کو ماخوذ مانتے ہیں اور اس کے درمیانی حلقے یہ بتاتے ہیں[۱۰]:۔

اوش ۔ اوس ۔ اوہ ۔ وہ یا اُہ ۔

ان حلقوں کو دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ ممکن ہے 'وہ' اور اُہ (یا اُو) کا ماخذ ایک ہی رہا ہو۔ دونوں
بیک وقت مستعمل رہے۔ پھر 'او' بتدریج متروک ہو گیا۔

اردو میں ضمیر غائب کی اصل 'و' ہے۔ اس لیے علامت جمع 'ے' اس پر اضافہ کی گئی اور حسبِ
قاعدہ 'وے' صیغۂ جمع بنا لیا گیا۔ 'ے' لگا کر جمع بنانے کا قاعدہ ہند یوری زبانوں میں قدیم سے تھا۔ غالباً
یہ 'وے' ایک عرصے تک اردو میں مستعمل رہا۔ بالآخر متروک ہو گیا اور ضمیر غائب واحد و جمع دونوں صورتوں میں
صرف 'وہ' کا استعمال برقرار رکھا گیا۔

۱۰۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۵۱۔ دی لٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

ضمیر واحد جمع حاضر

اردو میں واحد حاضر کے لیے اب ضمیر 'تو' استعمال ہوتی ہے اور جمع حاضر کے لیے 'تم'۔ اس سے پیشتر ان ضمائر کی کیا صورت تھی یہ دیکھنے کے لیے ادبِ اردو کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو کی قدیم ترین دستیاب تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" میں واحد حاضر کے لیے ضمیر کی درجِ ذیل صورتیں مستعمل تھیں:[1]

تیں - ؏ قلم گیان سوں تیں لکھیا بھگ جگ ص۴۵

تے ؏ کہ تے وہل بلگت کرن راج دھر ص۶۹

تُہیں ؏ گسائیں تُہیں ایک دُنہ جگ ادار ص۴۵

یہ 'تو' حرفِ حصر 'ہیں' کے ساتھ مل کر آیا ہے۔ تو + ہیں = تہیں۔

توں ؏ کہ توں بھی ہوا ایک ہیوار سوں ص۷۷

جمع حاضر کے لیے صرف 'تم' اگرچہ نہیں ملا، تاہم بعض شواہد سے ثابت ہے کہ 'تم' اس وقت موجود و مستعمل رہا ہوگا۔ مثال کے طور پر 'ن' اور 'ھن' کے لاحقے کے ساتھ 'تمن' اور 'تمھن' کا استعمال دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے یہ دو مصرعے دیکھیے:— تمن ؏ کہ کارن ہمن بھوگ رہنا تمن ص۱۲۵

؏ تمھن ہت دے پان ہت آپ کر۔ ص۱۶۹۔

---

1. فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول ۱۹۷۳ء سنِ تصنیفِ مثنوی: (۸۲۵ھ و ۸۳۹ھ/ ۱۴۲۱ء ۱۴۳۵ء)۔ مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ۔

تمن: ع کہ کارن ہمن بھوگ رہنا تمن ص ۱۲۵

تمھن ع تمھن ہت دے پان ہت آپ کر ص ۱۶۹

شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ ھ) کے یہاں 'توں' اور 'تم' دونوں استعمال ہوئے ہیں ۲

توں ع پگ دیکھے توں ان کھیرے

تم ؎ کیے منجہ سیر سہاگ اللہ کا چھتر رہیا سہاوا

اب کیوں سر سہاوے دوجا تم کو ناہیں ٹھاوا ؎۳

شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ ھ) کے یہاں بھی 'توں' کا استعمال ملتا ہے مثلاً ان کا یہ مصرع: ؎۴

گور نگن میانے توں ہین (تو ہیں) پیری بات کا سنگاتھی۔

قلی قطب شاہ کا ایک مصرع ہے :- اے قطب شہ توں دعا تجھے (سے) ہور رہیا تھا نا امید ؎۵

جمع حاضر کے لیے ضمیر 'تم' استعمال کی ہے مثلاً یہ مصرع : نبیؐ کی دعا تھے قیامت تلک تم۔ ؎۶

؎۲ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ ص ۲۹۔ ؎۳ ص ۵۔

؎۴ ایضاً۔ ص ۳۲۔

؎۵ قلی قطب شاہ۔ کلیات قلی قطب شاہ ص ۱۰۹ مرتبہ سید محی الدین قادری زور۔ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن۔ ۱۹۴۰ء

؎۶ ایضاً۔ ص ۳۸۲۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م ۹۷۳ھ) کے یہاں بھی 'تم' کا استعمال ملتا ہے مثلاً: [7]

تم ری پیا کو دیکھو جیسا — ہور جیوں بیر تھو سائیں ایسا

سوئے تمیں ہونا ں وہ ایسا

مولوی عبدالحق نے بابا شاہ حسینی کا جو کلام درج کیا ہے اس میں بھی 'تم' دیکھنے میں آتا ہے مثال کے طور پر [8]

شاہ علی جیو جگ ہیر ور، تم ہو میرے لال

نازک نہال ہے شاہ حسینی، راکھو تم سنبھال۔

ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' (تصنیف ۱۰۱۸ھ) کا ایک مصرع ہے: [9]

توں اول توں آخر توں قادر اہے۔

ملا وجہی کی 'سب رس' کا ایک جملہ ہے: [10]

تمیں (تم) دونوں بی (بھی) میرے ہیر عاشق ہیں۔

---

[7] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۶۹۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۷ء

[8] ایضاً۔ ص ۵۶۔

[9] ملا وجہی۔ 'قطب مشتری'۔ ص ۱۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۵۳ء

[10] ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۱۱۹۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۷ء

شاہی (علی عادل شاہ ثانی شاہی) (عہدِ حکومت ۱۶۵۶ء ۱۶۷۲ء) کے دو مصرعے درج ذیل ہیں: ۱۱؎

توں ہے شریعت کا یہ سطر توں حقیقت کا ہے مظہر توں

تیں ہے اسی کے عشق تیں سو نسار تیر جگ کا بھرایا ہے۔

کمال خان رستمی بیجاپوری کا مصرع ہے: ۱۲؎

توں کر بندگی جب بھی اس نانوں کو۔

ولی کے زمانے تک یہ استعمال اسی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ مصرع: ۱۳؎

توں سر سوں قدم تک جھلک میں

شمالی ہند میں امیر خسرو کے یہاں بغیر نون زائد کے، صرف 'تو' نظر آتا ہے جیسے یہ مصرع ۱۴؎

گماہ زِ خسرو تو نگفتہ کر بیٹھ

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا ایک ارشاد ہے ۱۵؎ 'تم او پیر وے تلے':

۱۱؎ علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی ص ۱۰۵۔ انجمن ترقی ہند، علی گڑھ۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی۔

۱۲؎ کمال خان رستمی بیجاپوری۔ 'خاور نامہ' ص ۷۔ (ترجمہ ۱۰۵۹ھ) ۔ ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

۱۳؎ ولی۔ دیوانِ ولی۔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۴ء

۱۴؎ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۳۱۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۱۵؎ ایضاً۔ ص ۲۳۔

اسمٰعیل امروہوی کے یہاں واحد حاضر کے لیے 'توں' اور 'تیں' استعمال ہوا ہے اور جمع حاضر کی صورت میں 'تم' نیز اس کی مغیرہ صورت 'تمن' اور 'تمنا' بھی عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر [16]

توں ع نہ رہ توں جو غافل یو دل سیں پچھان ص ۱۳۸

تیں ع تینو (تینوں) گھوڑے دیکھے تیں نوجوان ص ۱۳۲

'تم' اور اس کی مغیرہ صورتوں کا استعمال درج ذیل مثالوں سے ظاہر ہے: [17]

۔ کہا تم جگر گوشہ ہو مصطفٰے ۔ شہ تمناں امت کی کیا خدا ص ۱۱۹

۔ منافق یے طعنہ دیا تھا تمن ۔ کہ دلگیر ہوئے ہیں سب جو تمن ۔ ص ۱۱۴

اس کے علاوہ 'توں' اور 'تیں' کے ساتھ 'توہیں' بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً یہ مصرع: [18]

الٰہی توہیں غیب سیں المدد ۔

فائز کے یہاں واحد حاضر کے لیے 'توں' 'تیں' اور 'تو' (بغیر نون غنہ) استعمال ہوا ہے اور جمع حاضر کے لیے 'تم' اور 'تمن' [19]

توں ع توں جلاتا ہے جیوں سپند مجھے

۱۶-۱۷-۱۸ اسمٰعیل امروہوی۔ وفات نامہ بی بی فاطمہ رض (۱۱۰۵ھ / ۱۶۹۴ء) اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ اشاعت اول دسمبر ۱۹۶۹ء۔ ص

۱۹ فائز دہلوی۔ دیوانِ فائز ص ۱۷۸۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ عمدہ پریس دہلی ۱۹۴۶ء۔
فائز اپنا کلیات جس میں دیوان بھی شامل ہے ۱۱۲۷ھ میں مرتب کر چکے تھے اور ۱۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

۲۰؎	تیں	کے	بشر کوں تیں نے بخشی سرفرازی ص۱۹۸
	تو	کے	کہ پیدا ابی (بھی) کیا تونے عدم سے ص۱۹۷
	تم	کے	گر تم ملوگے ان ستی دیکھو گے ہم نہیں ص۱۹۱
	تمن	کے	جب تمن پاس فائز آیا تھا ص۱۷۷

فضلی کی کربل کتھا' میں 'تو'، 'توں' اور 'تم' تینوں کا استعمال ملتا ہے[21]۔ اس کا ایک مصرع ہے:۔

تونے اوس بدلے مجھ حسین کے تئیں۔ ص۶۰

'کربل کتھا' کے دو جملے بھی یہاں نقل ہیں:۔

۱۔ اب تو توں جا۔ پھر آئیو ص۱۰

۲۔ نہ جانوں کہ ظالمان امت تم سے کیا کریں۔ ص۷۷

اس کے بعد نون زاید کے ساتھ 'تو' کا استعمال نہیں ملتا اور نہ ہی تمن اور تمناں وغیرہ۔ گویا یہ استعمالات متروک ہوجاتے ہیں اور حروف 'تو' اور 'تم' باقی رہتے ہیں جو آج بھی بعینہٖ استعمال ہو رہے ہیں[22]۔

۲۰؎ فائز۔ دیوانِ فائز۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ عمدہ پریس دہلی۔ ۱۹۴۶ء

۲۱؎ فضل علی فضلی (مولف)۔ کربل کتھا۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دلی۔ طبع اول ۱۹۶۵ء

۲۲؎ شاہ حاتم کے کلام، میر امّن کی باغ و بہار اور میر درد وغیرہ کے کلام میں حرف 'تو' اور 'تم' ہی ملا۔

ماخذ کی بحث۔

"تو" کی اصل سنسکرت "توم" (त्वम्) ہے۔ آخر سے غنہ گر گیا ہے۔ مارواڑی اور قدیم اودھی میں اس کا روپ "توں" تھا۔ نون غنہ (ں) میم (م) کی یادگار ہے۔ پراکرت میں اس کی کئی شکلیں ہیں۔ شورسینی میں "تمن"۔ مہاراشٹری میں "تن"۔ اُردھ ماگدھی میں "تمے"۔ تکی میں "تہن"۔ اپ بھرنش میں "تہوں"۔ [۲۳] یہ سب فاعلی حالتیں ہیں اور سنسکرت "توم" سے حاصل کی گئی ہیں۔

کیلاگ کا کہنا ہے کہ "تو نے" میں جو "تو" ہے اس کا ماخذ (त्वया) کو مانا جائے جو اضافی حالت میں ہے۔ اور سنسکرت तव (تو) کا قائم مقام ہے [۲۴] اس میں ایک لغت "تیں" بھی ہے جو شاید مہاراشٹری "تئی" کا ایک روپ ہے۔ ञ کا تبادل ए سے اردو میں عام ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "میں" پر قیاس کر کے "تو" کو "تیں" بنا لیا گیا ہو۔ دھیریندر نے "میں" کی طرح "تیں" کو آلی حالت त्वया پراکرت तए اور اپ بھرنش तइ سے نکالا ہے۔

"تم" غالباً "تمھ" تھا۔ اس لیے کہ اس کی اصل तुष्म (تشم) ہے۔ جو ث، ضمیر واحد حاضر اور

---

[۲۳] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۴۹۔ مطبوعہ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ طبع اول جولائی ۱۹۵۶ء
بحوالہ ولنر۔ مبادی پراکرت ص ۴۲

[۲۴] ایضاً ص ۲۴۹۔ بحوالہ کیلاگ۔ ہندی گرامر۔ پارہ ۲۵۲۔

'سم' सम المعانی سے مرکب ہے۔ 'سم' متکلم میں بھی تھا وہاں 'مم' ہو گیا تھا۔ یہاں 'مَتم' ہوا۔ پراکرت میں اس کا روپ "تمھے" ہے۔ 'تم' "تمھے" سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ ہندایرانی کے کسی ایسے روپ سے لیا گیا ہے جو قدیم فارسی "تُوَم" سے ملتا جلتا تھا۔ سنسکرت "توم" اور قدیم فارسی "تُوَم" ایک اصل کی دو شاخیں ہیں۔ ژندی "توم" بھی اسی اصل سے پھوٹا ہے۔ اردو "تم" بھی اسی کی ایک شاخ ہے۔ اس لحاظ سے وہ مفرد ہے مگر جمع کے معنے دے رہا ہے[۲۵]

"تے" "مے" کی طرح اضافی ہے۔ تیرا، تیری، تیرے اور سنسکرت ते کا جانشین ہے[۲۶]۔

پلیٹس "تم" کو "تموں" سے مختصر مانتے ہیں اور اس کی اصل پراکرت "تمھانم" بتاتے ہیں جو جمع کا صیغہ ہے اور اضافی حالت میں ہے۔ "تموں" قدیم اردو میں غیر فاعلی حالت میں مستعمل تھا۔ "تمھانم" مفعولی (ثانوی) حالت میں ہے لیکن پراکرت عہد میں مفعولی ثانوی اور اضافی حالت میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس لیے اس اشتقاق میں ان کے نزدیک کوئی قباحت نہیں[۲۷]

'تے'، کا جہاں تک تعلق ہے قدیم اردو میں اس کا عام استعمال نہیں ملا۔ ایک آدھ جگہ اس کا استعمال 'تو' کے لیے ہوا ہے۔ اضافی حالت کے لیے اس کی جگہ "تُمَن" اور "تُمنا" وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بحث اضافی ضمائر کی ذیل میں آئے گی۔

---

۲۵ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۵۰-۲۴۹۔ دی ٹیچرز پریس ڈھاکہ ۱۹۵۶ء ۲۶ ایضاً ص ۲۵۰۔

۲۷ ایضاً ص ۲۵۱-۲۵۰، بحوالہ پلیٹس۔ اردو گرامر ص ۱۱۵۔

شوکت سبزواری نے ولسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ "تو" کی اصل "توم" ہے۔ آخر سے غنہ گر گیا ہے۔ مارواڑی اور قدیم اودھی میں اس کا روپ "توں" تھا۔ نون غنہ "میم" کی یادگار ہے۔ پراکرت میں اس کی کئی شکلیں ہیں۔ شورسینی میں "تمں" مہاراشٹری میں "تں" اُردھ ماگدھی میں "تمے" تکی میں "تہں" اپ بھرنش میں "تہوں" یہ سب فاعلی حالتیں ہیں اور سنسکرت "توم" سے حاصل کی گئی ہیں۔

قدیم ادبِ اردو کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا صورتوں میں سے کئی اردو میں نظر آتی ہیں لیکن قدرے مختلف مفہوم و معنی میں۔ "توں" (نون غنہ کے ساتھ) کا استعمال تو بہت عام ہے۔ نہ صرف دکنی اردو میں بلکہ شمالی ہند کی اردو کے ابتدائی دور تک بھی۔ شمالی ہند میں اس کے وجود کی توجیہہ یہ کی جا سکتی ہے کہ وہاں ہندو عام طور پر نون زائد بولنے کے عادی تھے مثلاً "سے" کو "سیں" "سیتی" کو "سیتیں" "نے" کو "نیں" اور "کو" کو نون غنہ زائد کے ساتھ "کوں" وغیرہ۔ اسی طرح "تو" کو "توں" بولتے ہوں گے۔ بعد میں اصلاحِ زبان کی تحریک کے تحت جہاں اور الفاظ کا غنہ گرا دیا گیا وہاں "تو" کا غنہ بھی گرا دیا گیا۔ شوکت سبزواری نے لکھا ہے: [۲۸]

قدیم اردو میں بہت سے کلمات کے آخر میں نون غنہ ہوا کرتا تھا جیسے نیں (نے)، سیں (سے)، کوں (کو)، کرناں (کرنا)۔ انشا کہتے ہیں کہ یہ شاہجہاں آباد کی زمین کا فیض ہے کہ کلمے کے

---

۲۸ شوکت سبزواری۔ داستانِ زبانِ اردو۔ ص ۱۴۸۔ بحوالہ انشاء اللہ خان انشا۔ دریائے لطافت۔

آخر سے نون غنہ (ں) کا دُم چھلا اڑ گیا۔ ورنہ ساداتِ بارہ کے بیتر اقم بزرگ
جو اپنے وطن میں رہے 'تو' کو 'توں' بولتے ہیں۔"

دوسرا قیاس یہ ہو سکتا ہے کہ غالباً شمالی ہند کی قدیم ترین اردو میں صرف 'تو' بغیر نون غنہ کے استعمال ہوتا ہو
بعد میں دکنی نے اپنے اردگرد کی کسی زبان کے اثر سے 'توں' نون غنہ کے ساتھ، اختیار کیا ہو۔ یہی لفظ دکنی
اثرات کے تحت شمالی ہند میں بھی راہ پا گیا۔ بعد میں تحریکِ اصلاحِ زبان کے تحت نون غنہ گرا کر 'تو' کو برقرار
رکھا گیا۔

تحریکِ اصلاحِ زبان کا خیال اول اول مرزا مظہر جانِ جاناں اور ظہور الدین حاتم کو آیا۔ انہوں نے زبان میں ترمیم
اصلاح کی جو بنا ڈالی وہ لکھنؤ میں ناسخ کے عہد تک جاری رہی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے نصف سے انیسویں صدی
کے نصف تک اردو میں تراش خراش ہوتی رہی۔ اس اصلاح کی ضرورت کیوں پیش آئی اس سلسلے میں شوکت
سبزواری لکھتے ہیں کہ[۲۶] "اردو زبان میں تراش خراش ان کا (حاتم و ناسخ) کا منصب نہ تھا۔ اس اصلاح کی ضرورت
اس لیے پیش آئی کہ دہلی میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو دہلوی شعرا کے سامنے دکن کی اردو شاعری نمونہ بنی۔
انہوں نے دکنی شعرا کی پیروی کی اور ان کی تقلید میں زبان بھی وہی اختیار کی جو دکنی شعرا کے یہاں استعمال ہوئی تھی۔ یہ
زبان دہلی کی رائج الوقت زبان سے مختلف تھی۔ مرزا مظہر اور شاہ حاتم شاعری کی اس "دکن زدہ" زبان کو دکنی عنا

---

[۲۶] شوکت سبزواری - داستانِ زبانِ اردو، ص ۱۳۹-۱۴۰ انجمن پریس کراچی، ۱۹۶۰ء

سے پاک کرکے دہلی کے روزمرہ سے قریب تر لے آئے — یا یوں کہیے کہ شعرا جانتے تھے کہ جو الفاظ وہ باندھ رہے ہیں اردو نہیں دکنی کے ہیں اور ٹکسال باہر ہیں۔ لیکن جیسا کہ میر انشاء اللہ خاں انشا نے لکھا ہے، شعری ضرورت سے مجبور ہو کر عمداً شعر میں باندھ جاتے تھے۔ نثر میں مجبوری نہ تھی اس لیے یہ غیر ٹکسالی الفاظ نظم میں جڑ پکڑ گئے۔ نثر میں راہ نہ پا سکے۔ مصلحینِ زبان نے ان الفاظ کے خلاف جہاد کر کے ریختہ کے باغ کو جو دکنی الفاظ کے خس و خاشاک سے اٹ گیا تھا، پاک کیا۔ چنانچہ حاتم کے یہاں حرف "تو" بغیر نون غنہ کے استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاتم کے زمانے میں یہ متروک قرار دیا جا چکا تھا۔ "کربل کتھا" میں نون غنہ کے ساتھ "توں" کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ شمالی ہند کی اردو نثر میں یہ موجود ضرور تھا۔ گویا بول چال کی زبان میں شامل رہا ہوگا۔ البتہ حاتم کے کلام اور ان کے بعد کی اردو نثر و نظم میں "نون غنہ زاید" نہیں ملتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا و ادبا کے ذہنوں میں یہی رجحان پرورش پا رہا تھا کہ اردو زبان کو غیر اردو الفاظ و حروف اور تلفظ سے پاک کیا جائے اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا گیا تھا

شورسینی میں ایک لفظ "تمن" ہے۔ اردو کے قدیم نمونوں میں بھی "تمن" دیکھنے میں آتا ہے مثال کے طور پر اردو کی قدیم ترین دستیاب مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں تمہن اور تمن استعمال ہوئے ہیں۔ قلی قطب شاہ، شاہی، شوقی، اسمٰعیل امروہوی سبھی کے کلام میں "تمن" کا استعمال ملتا ہے۔ اسی طرح مسعودی کاکوروی شمالی ہند کے ایک شاعر گزرے ہیں، زور نے لکھا ہے کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے میں تھے اور قلی قطب شاہ کے معاصر۔ ان کا ایک شعر تذکروں میں اس طرح منقول ہے: [30]

[30] شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل۔ ص ٦٩۔ انجمن پریس کراچی۔ ١٩٦٢ء

سجنا تمین کوں دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

اس شعر میں "تمین"، "تمن" ہی کا ایک روپ ہے اور "تم" کے معنوں میں ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو، اسی شعر میں دو جگہ لفظ "تم" استعمال ہوا ہے جس سے واضح ہے کہ اس وقت ضمیر "تم" بھی موجود و مستعمل تھی۔ "تمین" اور "تم" کی پہلو بہ پہلو موجودگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف لغات ہیں جو ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں ہوں گی۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ تمین کا استعمال بتدریج متروک ہو رہا ہو اور "تم" اس کی جگہ لے رہا ہو۔ یا "تمین"، "تم" کی صورت میں ڈھلتا جا رہا ہو۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ سعدی نے اس کا استعمال "تم" کی جگہ کیا ہے۔ جب کہ دوسرے شعرا کے یہاں "تمن" کا استعمال فاعلی کی جگہ اضافی اور مفعولی معنوں میں ہوا ہے۔ (یعنی تمہیں، تمہارا، تمہارے کے معنوں میں)۔ "تمین" "ن" کے ساتھ (کا استعمال) سعدی سے قبل شمالی ہند میں دستیاب نہیں ہوتا البتہ دکن میں موجود ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" میں "تمین" کا استعمال اس کی قدامت کا بین ثبوت ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں "تمین" "تم" کے لیے آیا ہے اور اس پر علامت مفعول اضافہ کی گئی ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" میں علامتِ مفعول موجود نہیں۔ اس کے بغیر ہی اضافی و مفعولی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

مہاراشٹری میں "تن" ہے لیکن اردو کے قدیم نمونوں میں بھی اس کا استعمال مل جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اردو میں "تن" "تو" کے لیے نہیں "اُن" اور "اُس" کے معنوں میں ہوا ہے۔ اس کا ذکر ضمائر اشارہ کے تحت کیا جائے گا۔

ڈُردو ماگدھی میں 'تمے' تھا۔ اردو کے قدیم نمونوں میں بھی کہیں کہیں 'تمے' اور نون زاید کے ساتھ
'تمیں' دیکھنے میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر حسن شوقی کا یہ مصرع: تمیں پانچ پانڈو ہمیں ماہ دیو۔
اسی طرح ملا وجہی کی مثنوی قطب مشتری کا ایک شعر درجِ ذیل ہے:۔

کہے شاہ کوں لیو بُلا کر تمیں ـ الس میں اپے مل رجھا کر تمیں ص۲۷

وجہی کی نثری تصنیف "سب رس" میں بھی اس کا استعمال ملتا ہے مثال کے طور پر درج ذیل جملہ: [31]

کھانے میں تے اڑیا لون، اتال تمیں کون ہیں کون۔

کمال خان رستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" میں بھی یہ استعمال اسی طور پر ملتا ہے جیسے یہ مصرع:۔

ع یو پوچھیا بعد ازاں جاتے کہاں ہیں تمیں ص۱۹

یعنی 'تم کہاں جاتے ہو'؟

علی عادل شاہ ثانی شاہی کی کلیات میں 'تمے' کا استعمال ملاحظہ ہو۔ ایک مصرع درج کیا جاتا ہے:

ہمارے سکھ بھرے جیو کوں تمے کی دکھ میں بھاتے ہیں۔ ص۱۵۲

یعنی ہمارے سکھ بھرے دل کو تم کیوں دکھ دیتے ہو۔

ان تمام مثالوں میں 'تمیں' اور 'تمے' کا استعمال ضمیر جمع حاضر 'تم' کے طور پر ہوا ہے۔

۳۱۔ ملا وجہی۔ سب رس (۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۷ء

نکی میں "تہن" اور اپ بھرنش میں "تہوں" کے استعمال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اردو کے قدیم نمونوں میں "تہیں" دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً فخر دین نظامی دکنی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا یہ مصرع دیکھیے :-

گنسائیں تہیں ایک ڈنہ جگ ادار صـ۱۲۵

بعینہٖ ملا وجہی کی "قطب مشتری" میں "تہیں" اور "توہیں" دیکھنے میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر :-

ع تہیں ہے ملک ہور توہیں سلام صـ۱

ع تہیں ہے بھمن توہیں نیک نام صـ۱

علی عادل شاہ ثانی شاہی کے کلام میں بھی یہ استعمال اسی طرح ملتا ہے۔ جیسے درج ذیل مصرع :-

سائیں سچا ہے تہیں سیوا تجے ہے سہی۔ کلیات صـ۱۰۲

ہو سکتا ہے کہ "نکی تہن" اور "اپ بھرنش تہوں" نے اردو میں "تہیں" اور "توہیں" کا روپ دھارا ہو۔

ولنر کا مختلف زبانوں میں موجود لغات کی نشاندہی کرنا، اور اردو میں ان کا پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان لغات کا آپس میں کچھ تعلق ضرور رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اردو "تو" اور "تم" (جو غالباً اس کی اپنی لغات ہوں گی) کے علاوہ دوسری لغات غیر زبانوں سے وقتی طور پر اردو میں در آئی ہوں گی بعد میں اس خیال کے تحت کہ یہ لغات غیر اردو ہیں، اور اردو میں ان کی متبادل لغات موجود ہیں، انہیں ترک کر دیا گیا ہو۔ اس موقع پر، شوکت سبزواری کی اس رائے کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "یہ سب فاعلی حالتیں ہیں اور سنسکرت "توم" سے حاصل کی گئی ہیں۔" انہوں نے ولنر کے حوالے سے لکھا ہے کہ "تو" کی اصل سنسکرت "توم" त्वम से۔ آخر سے غنہ گر گیا ہے۔

مارواڑی اور قدیم اودھی میں اس کا روپ "توں" تھا۔ نون غنہ، میم (م) کی یادگار ہے۔ پراکرت میں اس کی کئی شکلیں ہیں۔ شورسینی میں 'تمں' مہاراشٹری میں 'تں'، اردھ ماگدھی میں 'تمے'، تلی میں 'تہں'، اپ بھرنش میں 'تہوں'۔ اس کی تائید کرتے ہوئے شوکت صاحب نے ان سب کو فاعلی حالتیں قرار دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا اردو مثالوں سے ظاہر ہے، ان لفظوں کا استعمال ہر جگہ 'فاعلی' طور پر نہیں ہوا ہے۔ بلکہ بعض جگہ اضافی اور مفعولی طور پر بھی پایا گیا ہے۔ ممکن ہے اپنی اصل زبانوں میں یہ لفظ فاعلی حالت میں مستعمل ہوں لیکن اردو میں ایسا نہیں ہوا۔

اردو 'تو' کا ماخذ سنسکرت 'توم' त्वम् کو قرار دینا، قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ 'م' اکثر نون غنہ سے بدل جاتا رہا ہے لہذا 'توم' سے اول 'توں'، اور پھر 'تو' (نون غنہ گرا کر) بنایا گیا ہو۔ یہ قیاس اس لیے بھی وزن رکھتا ہے کہ بعض دوسرے الفاظ و حروف پر بھی قدیم اردو میں نون غنہ زائد تھا مثلاً کوں (کو)، نیں (نے)، سیں (سے)، سوں (سے)، تیں (تے بمعنی سے)، وغیرہ اور بعد میں ان سے غنہ گرا دیا گیا۔ اس کا سبب اردو کا تسہیلی رجحان ہے۔

کیلاگ کے نزدیک 'تو' کا ماخذ، پراکرت तुज्झ ہے جو اضافی حالت میں ہے اور سنسکرت तव (تو) کا قائم مقام ہے۔

کیلاگ کے اس خیال کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پراکرت دور میں ज्झ کا اضافہ کس علامت کے طور پر ہوا؟ اور نون غنہ کے اضافے کے ساتھ 'توں' کیونکر بن گیا؟ 'تو' پر نون غنہ

کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ کسی ایسے لفظ سے ماخوذ ہوگا جس کے آخر میں کوئی ایسا حرف آتا ہو جس کی تبدیلی عموماً نون کے ساتھ ہوتی ہو۔ ایسا حرف سنسکرت "م" ہے جو نون غنہ سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر ایک بات مزید غور طلب ہے وہ یہ کہ کیلاگ کے خیال میں "تو" کا ماخذ ऋ तृ ہے جو اضافی حالت میں ہے، سوال یہ ہے کہ اضافی اور مفعولی حالت میں تو کچھ نسبت ہے بھی، لیکن فاعلی حالت کو اضافی حالت سے کیونکر اخذ کیا جا سکتا ہے۔

شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ اس میں ایک لغت "تیں" بھی ہے جو شاید مہاراشٹری "تئ" کا ایک روپ ہے۔ ऋ کا تبادل ए سے اردو میں عام ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "میں" پر قیاس کر کے "تو" کو "تیں" بنا لیا گیا ہو۔

دھیریندر نے "میں" کی طرح "تیں" کو آلی حالت तया، پراکرت तए اور اپ بھرنش तइँ سے نکالا ہے۔

اردو کی قدیم ترین دستیاب مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں "تے" اور "تیں" دونوں کا استعمال ملتا ہے۔ اس کے ماخذ کے سلسلے میں دھیریندر کی رائے اس لحاظ سے قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے کہ دکنی اردو میں "تیں" کا استعمال "تو نے" کی جگہ ہوا ہے اور اس کے اثر سے شمالی ہند کے ابتدائی نمونوں میں۔ جو شوکت سبزواری کے الفاظ میں "آلی حالت" (نے کے ساتھ استعمال) کہلاتی ہے۔ مذکورہ بالا بحثوں سے اس کے درمیانی حلقے جو سامنے آتے ہیں وہ یہ ہوں گے: तया - तऋ - तए - तइँ۔ اس میں دوسرے اور تیسرے د

پر نظر ڈالیں تو کیلاگ کے نظریے کی جانب توجہ جاتی ہے۔ त्वम् کا व त ہو جانا، اس لیے ممکن
ہے کہ म् کا تبادل व کے ساتھ، عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ کیلاگ کے نزدیک سنسکرت त्वम् (تو) پراکرت
دور میں तुम् ہوا، اور پھر 'تو' بن گیا۔ तुम् اور त्वम् میں مناسبت ہے۔ 'ت' کے بعد کا
واؤ، اختصار کی نذر ہوا اور صرف اس کی علامت کے طور پر پیش کی صورت میں باقی رہ گیا، اس طرح त्वम्
سے तुम् بن سکتا ہے۔ جو بعد میں म् کے व سے بدل جانے پر तव بن گیا۔ یہی اپ بھرنش دور میں तुहुँ
ہو گیا۔ کیلاگ نے 'تو' کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے پراکرت دور میں اس کی شکل तुम् بتائی ہے۔ جو
دھیریندر کے پراکرتی دور کے तव سے قریب تر ہے۔ لیکن دونوں نے چونکہ دو مختلف لغات 'تو' اور 'تیں'
سے بحث کی ہے لہٰذا ہم دونوں کا ماخذ، قطعی طور پر کسی ایک لفظ کو قرار نہیں دے سکتے۔

کیلاگ نے 'تو' کا ماخذ سنسکرت त्वम् (تو) کو ٹھہراتے ہوئے پراکرت دور میں اس کی شکل तुम्
بتائی ہے۔ اگر اس کے ارتقائی مدارج پر غور کریں تو قیاس کہتا ہے کہ तुम् کا म्، व سے بدل کر، तुव
اور پھر व کے हुँ سے تبادل کے بعد اپ بھرنش میں तुहुँ بن سکتا ہے۔ لیکن اردو کے قدیم نمونوں میں 'تُیں'
اور 'تونیں'، دیکھنے میں آتا ہے۔ دوسری جانب 'توں'، آخر میں 'تو' کی صورت میں متعین ہو جاتا ہے۔
اس اعتبار سے 'تونیں' اور 'تُیں' کو اس ماخذ سے نہیں نکالا جا سکتا جس سے 'تو' نکلا۔ البتہ اگر 'توں'
کے بعد 'ہیں'، اور 'ہی'، کو وہ لاحقہ سمجھا جائے جو دھیریندر کے نزدیک اپ بھرنش میں 'آھو' کی صورت میں
تھا اور جس کے تین روپ ہیں हु، हि، اور हुं — یہ لاحقے اصل کلمے کے म् سے مل کر،

अहँ ، अहि اور अह بنے۔ اردو میں ह گرنے کے بعد، انہوں نے بالترتیب :—

आँ ۔ एँ ۔ اور ۔ अआँ کی شکلیں اختیار کیں[۳۲]۔ "ت" وہ بنیادی حرف ہے جو "تو"

کی تمام لغات میں اول حرف کے طور پر مشترک ہے۔ (جیسے توں، تس، تُمہیں، تہوں، تمیں، تجے، تمن، تہن،

تے وغیرہ) تو اس صورت میں اپ بھرنش دور میں درج ذیل شکلیں سامنے آئیں گی۔ یہ بات مدِنظر

رہے کہ کیلاگ نے 'تو' کی پراکرتی شکل तुअ دی ہے :—

۱۔ तुअ — پر हँ کے اضافے سے तुअहँ

۲۔ तुअ پر हिं کے اضافے سے तुअहि

۳۔ तुअ پر अह کے اضافے سے तुअह

اردو میں ह گرنے کے بعد، ان مندرجہ بالا شکلوں میں جو تبدیلیاں آئیں، حسبِ ذیل ہیں :—

तुआँ ۔ तुएँ ۔ اور ۔ तुअआँ

لیکن صرف 'ت'، پر لاحقہ हँ ، हिं اور हु اضافہ کیا جائے تو तुहँ ۔ तुहिं اور

तुहु بنتے ہیں۔ (تُہن۔ تُہیں اور تُہوں) تو تُہیں اور تہیں کا استعمال قدیم اردو میں موجود ہے۔ تہوں،

کے متعلق شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ اپ بھرنش میں موجود تھا۔ تُہن نکلی میں تھا جو غالباً اردو میں تُمہیں ہوگیا۔

---

[۳۲] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۰۱ بحوالہ ھورنلے۔ گوڈین گرامر ص ۱۹۸۔

तृ گمر نے کے بعد ان کی شکلیں یہ بنیں گی :- तुऑं - اور - तऑं - तु ए - ممکن ہے یہی
بعد میں 'توں'، 'تے' اور 'تیں' میں بدل گئی ہوں - 'توں'، 'تے'، اور 'تیں'، کا استعمال جس وقت
سے دستیاب ہے اگر اس سے قبل کے نمونے دستیاب ہو سکیں تو یہ قیاسات پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتے ہیں -
یا کم از کم ان لغات کی وہ صورت ضرور سامنے آ سکتی ہے جو اس دور میں رائج رہی ہو -

'تم' کی اصل اگر سنسکرت "توم" त्वम کو سمجھا جائے تو قیاس کہتا ہے کہ غالباً بعد میں तम (تُو) کا واؤ
پیش سے مبدل ہوا اور तुम (تُم) بنا - اس پر لاحقوں کے اضافے سے یہ شکلیں سامنے آئی ہیں :-
तुमहं (تمہن) - तुमहिं (تمہیں) - اور - तुमहु (تمہوں) - تمہن کا استعمال قدیم اردو میں
موجود رہا ہے، چنانچہ کدم راؤ پدم راؤ میں بھی اس کی مثالیں دستیاب ہیں - شمالی ہند میں سعدی کاکوری کے
یہاں بھی اس کا استعمال ملتا ہے - 'تمہوں' کے بارے میں پلیٹس نے لکھا ہے کہ قدیم اردو میں غیر فاعلی حالت
میں مستعمل تھا[۳۳] اردو میں یہ لاحقے غالباً گرا دیے گئے اور صرف 'تم' برقرار رکھا گیا -

پلیٹس 'تم' کو 'تمہوں' سے مختصر مانتے ہیں - ان کے نزدیک اس کی اصل "تمہانم" ہے - جو جمع کا صیغہ ہے اور
اضافی حالت میں ہے - اس سلسلے میں وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ 'تمہوں' قدیم اردو میں غیر فاعلی حالت میں مستعمل
تھا - اس طرح اس کے ارتقائی مدارج یہ ہوں گے : تمہانم - تمہوں - تم - پلیٹس کا خیال ہے کہ 'تمہانم' اگرچہ
مفعولی ثانوی حالت میں ہے لیکن پراکرت عہد میں مفعولی (ثانوی) اور اضافی حالت میں کوئی امتیاز نہ تھا اس

---

[۳۳] شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا - ص ۱۲۵ - بحوالہ پلیٹس - اردو گرامر ص ۱۱۵ -

اس لیے اس اشتقاق میں کوئی قباحت نہیں۔[34]

اپ بھرنش میں مفعولی حالت میں अम्हइं (امہیں) بولا جاتا تھا۔ 'تم' سے تمہیں तुम्हइं بھی مستعمل تھا۔ کیلاگ ان دونوں کی اصل अम्हहिं (امہیں) اور तुम्हहिं (تمہیں) بتاتے ہیں — اور हिं کو مستقل لاحقہ قرار دے کر سنسکرت "سمن" (مفرد) یا "بھیم" (جمع) سے نکالتے ہیں۔[35]

شوکت سبزواری کے نزدیک 'تم' غالباً "تمہ" تھا۔ اس کی اصل तुष्म (تُشم) ہے جو "تُ" ضمیر واحد حاضر اور स्म (سم) الحاق سے مرکب ہے۔ "سم" متکلم میں بھی تھا وہاں "مہ" ہو گیا تھا یہاں "تمہ" ہو گیا۔ پراکرت میں اس کا روپ "تمھے" ہے۔ 'تم' "تمھے" سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ ہند ایرانی کے کسی ایسے روپ سے لیا گیا ہے جو قدیم فارسی "تُوَم" سے ملتا جلتا تھا۔ سنسکرت "توم" اور قدیم فارسی "تُوَم" ایک اصل کی دو شاخیں ہیں۔[36]

34۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ص 251 بحوالہ پلیٹس۔ اردو گرامر ص 115۔

35۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ بحوالہ کیلاگ۔ ہندی گرامر۔ ص 212

36۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص 249-250۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ 1956ء

ضمیر واحد وجمع حاضر کی مفعولی اور اضافی صورتیں

ضمیر حاضر (تو اور تم) کی مفعولی صورت (یا حالت) 'تجھ'، 'تجھے' اور 'تجھ کو' ہیں۔ اضافی حالت تیرا، تیری، تیرے۔ 'تم' کی مفعولی حالت 'تمھیں' اور 'تم کو' ہے۔ اضافی حالت تمہارا، تمہاری، تمہارے۔ ضمیر حاضر کی مفعولی اور اضافی حالتوں میں تغیرات نظر نہ آنے کے سبب اس کی مثالیں نقل کرنے سے گریز کیا گیا ہے

ضمیر واحد و جمع متکلم

اردو میں ضمیر واحد متکلم کے لیے "میں" اور جمع متکلم کے لیے "ہم" استعمال ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ادبِ اردو کا مطالعہ حسبِ ذیل ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ استعمال کتنا قدیم ہے اور اس کے علاوہ کون کون سی مترادف لغات، اردو کے عہدِ قدیم میں مستعمل رہیں۔

اردو کی قدیم ترین دستیاب مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں اس استعمال کی مثالیں ملاحظہ ہوں [1]

میں: ع جو میں تج (تجھ) کہیا توں تنخص دور کر

ہوں: ؎ تجھے میں بھل دِشٹ کر دیکھیا ۔ کہ ہوں نہ تنخوں میں تجھے لیکھیا۔

یہ مثنوی نویں صدی ہجری (۸۲۵ و ۸۳۹ھ کے درمیان) کی تصنیف ہے۔

شاہ علی الحسینی گانؤں دھنی، گجرات کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ ان کی وفات ۹۷۳ ہجری میں ہوئی۔ ان کے یہاں واحد متکلم کے لیے "میں" کا استعمال دیکھنے میں آتا ہے مثلاً درجِ ذیل مصرع [2]

میں آئینہ مجھ سوں عارے

شیخ خوب محمد چشتی بھی گجرات کے ایک بزرگ ہیں۔ انہوں نے ۱۰۲۳ ہجری میں وفات پائی۔

---

[1] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص۲۷۔ "ہم" کی مثالیں ع: تہاں باج ہم پال سکے سوکوں ایضاً ص۱۲۵
ع: دیے لون ہم کوں ہوا پائے بند ایضاً ص۱۲۵

[2] شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم۔ ص۵۸۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ ۱۹۳۰ء

ان کا ایک مصرع ہے ۳ے اُن تھیں (سے) ہیں سنیا دن رات

قلی قطب شاہ کا مصرع ہے : ۴ے

ہیں :۔ ہیں نہ جانوں کعبہ و بتخانہ و میخانہ کوں۔

قلی قطب شاہ نے ضمیر جمع متکلم کے طور پر "ہمن" استعمال کیا ہے۔ مثلاً درج ذیل مصرع ۵ے

ہمن :۔ نین تمہارے کرے ہیں ہمن سوں بات صریح

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) میں، واحد متکلم کے لیے "میں"، اور جمع متکلم کے لیے ہمن، ہمنا اور ہمناں (بہ اضافۂ نون) استعمال ہوئے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے : ۶ے

میں ؎ نہیں دیکھیا کیں میں اس دھات کے

ہمن ؎ گئے رات دن یوں ہمن سنگ توں

ہمنا ؎ ترا شکر ہمنا سے کیا ہوئے گا

ہمناں ؎ کہے تھے ترا درد ہمناں کوں آو

۳ے شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم۔ ص ۴۹۔ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء

۴-۵ے قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ۔ ص ۲۳۶۔ ص ۲۲۸۔ مرتبہ محی الدین زورؔ۔ اعظم اسٹیم پریس۔ دکن سنہ ۱۹۴۰ء

۶ے ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص ۱۳۔ ص ۵۔ ص ۲۶۔ ص ۲۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سنہ ۱۹۵۳ء

حسن شوقی نے ضمیر واحد متکلم کے طور پر 'میں'، اور جمع متکلم کے طور پر 'ہموں'، استعمال کیا ہے مثلاً: ۷

میں: سینا میں کہ شہ گھر بڑا کاج ہے۔

ہموں: اے دل دیا ہموں کوں وے سکھ کرن کہاں ہیں

'ہموں' کے علاوہ 'ہمنا' بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے شوقی کا یہ مصرع: نہ ہمنا شک جہنم خانہ جنت کی طرح دستے

ملا وجہی کی نثری تصنیف "سب رس" (تصنیف ۱۰۴۵ھ) سے بھی چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۸

میں: ۱۔ میں ایسی نئیں (نہیں) ہوں۔

ہمنا: نیں (نہیں) تو کیا ہمنا تے سنبھالیا جاتا ہے۔

ہمیں (ہم): ہمیں بی (بھی) عجب مرد ہیں۔ بہت کوئی بڑے فرد ہیں۔

شاہی کے یہاں واحد متکلم کے لیے 'میں'، اور جمع متکلم کے لیے 'ہمن'، کا استعمال ہوا ہے مثلاً: ۹

ہمن: حق کے حقایق کی بوج (بوجھ) سب تو ہمن کوں کہاں

انکے یہاں 'ہمنا' بھی موجود ہے جیسے یہ مصرع: — نہیں سو ریت کی ریتوں بنیٹی ہمنا کھیا تے ہیں۔

---

۷ حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۱ء

۸ ملا وجہی۔ سب رس ص ۲۱۵ ۔ ص ۱۳۶ ۔ مرتبہ مولوی عبدالحق (مع مقدمہ)۔ فیض الکتابت کراچی۔ اشاعتِ سوم ۱۹۶۴ء

۹ علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی ص ۱۰۰ ۔ ص ۱۵۲ ۔ مطبوعہ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی۔

کمال خاں رستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" (۱۰۵۹ ہجری) میں بھی، ہمن اور ہمنا دیکھنے میں آتے ہیں۔

ان کے دو مصرع یہاں نقل ہیں: ۱۰

ہمن ؎ ہمن بات یو بولنے کی نہیں

ہمناں ؎ جو لو گماں تھے اس رکھ توں ہمناں تگاں

نصرتی (م ۱۰۸۴ھ) کے یہاں یہ استعمال دیکھیے: ۱۱

ہمن: ؎ ہمن پیٹ ہور نیٹ ہو کر تمیز

ہمنا: ؎ بڈ جائے (بڑھ جائے) ہیں ہمنا پہ یو رکھو قیاس

قاضی محمود بحری (ولی کے معاصر) کے یہاں بھی "ہمنا" استعمال ہوا ہے۔ مثلاً درج ذیل مصرع ۱۲

ہمناں ؎ او کھبالے بال گر ہمناں سوں فارغ بال ہیں

انہی کے کلام سے ہمن کی مثال ملاحظہ ہو: — ؎ سو لیوں کہیں ہر دم جو ہمن چھوڑ نہ جانا۔

واحد متکلم کے لیے قدیم ادب میں عام طور پر "میں" ہی مستعمل رہا، چنانچہ اس کی مثال بحری کے یہاں بھی مل جاتی ہے ۱۳

؎ میں اس من مُہن (موہن) کا صفت کیا کہوں ٭ نہ ایسا جو تقریر میں لیا کہوں

---

۱۰ کمال خاں رستمی بیجاپوری - خاور نامہ (مترجمہ ۱۰۵۹ھ) ص ۲۰، ط ۲۱۔ مرتبہ جاوید حسین شیخ - ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۸ء

۱۱ مُلّا نصرتی - دیوانِ نصرتی - مع مقدمہ و فرہنگ - مرتبہ جمیل جالبی - مطبع قوسین لاہور - طبع اول ۱۹۷۲ء۔

۱۲-۱۳ قاضی محمود بحری - کلیاتِ بحری سنہ ۱۱۱۳ھ مع مقدمہ و تشریح، مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید - مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۹ء
ص ۱۶۶ - ص ۱۲۵ - ص ۲۴۷۔

ولی کے یہاں 'میں' اور 'ہمن' کے علاوہ 'ہم' بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ دو مصرعے درج ذیل ہیں [۱۴]

ہمن : ؎ مارا ہے جو ظالم نے ادایاں سوں ہمن کوں

ہم : ؎ حقیقت سوں تری مدت سے ہم واقف ہیں اے زاہد

اس مطالعے سے واضح ہے کہ دکنی اردو میں 'ہم' کی جگہ عام طور پر 'ہمن' (ہمن) اور 'ہمناں' کا استعمال ملتا ہے۔ ایک آدھ جگہ 'ہموں' (ہموں) بھی دیکھنے میں آیا ہے جس طرح واحد متکلم کے سلسلے میں 'میں' کے علاوہ ایک آدھ جگہ 'ہوں' بھی دیکھا گیا۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں 'میں' کے علاوہ 'ہوں' دیکھا گیا۔ اس کی مثال پیشتر درج کی جاچکی ہے۔
شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین، اکبر و جہانگیر کے معاصر بزرگ ہیں۔ ان کے یہاں 'ہوں' کا استعمال ملاحظہ کیجیے: [۱۵]

ہوں: ؎ ان نینوں کا یہی بسیکھ ـ ہوں تجھ دیکھوں توں منجہ دیکھ

'ہموں' کے استعمال کی مثال بھی حسن شوقی کے کلام سے، پیش کی جاچکی ہے، اس کی مثال سید شاہ ہاشم حسنی العلوی (م ۱۱۵۹ھ) کے یہاں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کا ایک شعر درج ذیل ہے [۱۶]

ہموں: ؎ یہی حجت ہے بس ہموں کوں ÷ جس تھیں لیا سب منہ توں توں

---

[۱۴] ولی - کلیاتِ ولی - مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی - انجمن پریس کراچی - سنہ ۱۹۵۴ء

[۱۵] مولوی عبدالحق - اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۳۸ - انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۵۳ء

[۱۶] ایضاً ص ۴۲۔

شمالی ہند میں عام طور پر "ہم" کا استعمال ملتا ہے۔ البتہ دو ایک شاعروں کے یہاں "ھمن" یا "ہمنا" بھی

دیکھنے میں آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" (تصنیف ۱۱۰۵ھ)

میں "ہم" کے علاوہ "ہمن" بھی استعمال ہوا ہے۔ مثالیں درج ذیل ہیں: [۱۷]

ہم: ع نہ گھر تیرے ہم آویں گے اب کبھی

ھمن: ع ھمن بخش حق آخرش بے حساب

سعدی کاکوروی (جو اکبر اعظم کے زمانے میں تھے اور قلی قطب شاہ کے معاصر) کے یہاں "ہمنا" کا استعمال دیکھنے

میں آتا ہے مثلاً ان کا یہ شعر [۱۸]

ہمنا، ہم: ؎ ہمنا تمھن کوں دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

فائز کے یہاں واحد متکلم کے لیے "میں" کا استعمال ہوا ہے اور جمع متکلم کے لیے "ہم" کے ساتھ "ھمن" بھی ملتا ہے۔ چند

مصرعے ملاحظہ ہوں: [۱۹] ع کیا بیاں کر سکوں میں گت اس کی

ھمن: ع آیا نہ ہمن پاس کیا وعدہ خلافی

---

[۱۷] اسمٰعیل امروہوی، "اردو کی دو قدیم مثنویاں" ص ۱۲۲، ۱۱۱، مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور طبع اول ۱۹۶۹ء

[۱۸] سعدی کاکوروی کا یہ شعر شوکت سبزواری نے "لسانی مسائل" ص ۶۹ پر دیا ہے۔

[۱۹] فائز - دیوانِ فائز ص ۱۹۱، ۱۷۸، ص ۱۸۳۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ مطبوعہ عمدہ پریس دہلی ۱۹۴۶ء

ہم :- فائز کو بھایا مصرعِ یک رنگ اے سجن

"گر تم ملو گے اِن ستی دیکھو گے ہم نہیں"

فائز کے بعد "ہمن" کے استعمال کی مثال نہیں ملتی۔ نیز شمالی ہندکی اردو میں "ہموں" اور "ہموں" بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ صرف "میں" اور "ہم" کا استعمال برقرار رہتا ہے اور یہی ستروک ہو جاتا ہے۔

"میں" اور "ہم" کے ماخذ کے سلسلے میں ماہرینِ لسانیات کے نظریات حسبِ ذیل ہیں۔ ۲۰

شوکت سبزواری کے نزدیک "میں" سنسکرت मया (میا، مجھ سے، یا مجھ نے) سے بنا ہے۔ پراکرت میں اس کے لیے دو روپ تھے मए (مئے) اور मइ (مئی)۔ یہ اپ بھرنش میں मइँ (مئیں) تھا۔ غنہ کی وجہ چیٹرجی نے یہ بتائی ہے کہ "میا" मया کو فاعلی حالت سمجھ کر اس میں سنسکرت علامتِ آلہ "ین" اضافہ کر دی گئی۔ گویا اپ بھرنش मइँ (مئیں) سنسکرت کے ایک فرضی روپ मयेन سے تراشا گیا ہے۔

ھورنلے मइँ (مئیں) کو मह्युँ کا مخفف سمجھتے ہیں۔ جو म اور ह्युँ سے مرکب ہے۔ म (ضمیر متکلم) پر "اپ بھرنش" لاحقہ اضافت (جمع کرلیں) ह्युँ جوڑ دیا گیا ۲۱

شوکت صاحب ھورنلے کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں" کو سنسکرت वयम और

---

۲۰ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶۔ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

۲۱ ایضاً صفحہ ۲۴۶ بحوالہ ھورنلے۔ مشرقی گرامر صفحہ ۲۷۵۔

اور پالی ययय (میں) سے نکالا جائے تو بہتر ہے۔ य ہماری زبان میں ऐ کے قائم مقام ہے جیسے सयय سے सयैं اور नयन سے नैन۔ اسی طرح ययम (میم) سے मैं ۲۲

'ہم' کا ماخذ شوکت صاحب کے نزدیک سنسکرت 'اہم' ہے۔ اس کے شروع سے 'أ' گر گیا ہے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہری اودھ نے اس سلسلے میں کسی عالم کا قول نقل کیا ہے کہ 'اہم' سے 'ہم' اس طرح وجود میں آیا ہے جیسے 'اُدھے' سے 'دیئے' دونوں جگہ شروع سے الف گرا ہے ۲۳ اسی طرح 'اتھا' سے 'تھا' بنا ہے۔

شیام سندر کا بیان ہے کہ مارکنڈے نے اپنی مشہور کتاب 'پراکرت سروسو' میں 'اسمد' (میں) کی جگہ 'ہم' ایک لغت دیا ہے اور اسے مفرد بتایا ہے۔ شوکت صاحب کے نزدیک یہی 'ہم' ہماری زبان کا 'ہم' ہے۔ شیام سندر کا کہنا ہے کہ مفرد کا جمع کے لیے استعمال ایک طرح کی ناہمواری ہے مگر اپ بھرنش میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی ۲۴

بھنڈارکر، چٹرجی، دھیریندر ورما، جان بیمز وغیرہ علمائے لسانیات نے 'ہم' کو پراکرت अम्हे یا

---

۲۲ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۴۶۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

۲۳ ایضاً ص ۲۴۷۔ بحوالہ ہری اودھ۔ ہندی بھاشا ص ۸۷

۲۴ ایضاً۔ بحوالہ شیام سندر۔ ساہتیہ ص ۱۵۳۔

(اسمے اور اسمے ہی) سے مشتق مانا ہے۔ پہلا فاعلی حالت میں ہے، دوسرا آلی حالت میں۔ अस्मे हे

پہلے کا ماخذ ایک قدیم ہند ایرانی لغت "اسمے" ہے جو ویدک زمانے کی یادگار ہے۔ دوسرا اسنسکرت अस्माभि

(اسمابھی) سے ڈھالا گیا ہے۔ اسمابھی۔ امہے بھی۔ امہے ہی۔ امہے ہی۔ یہ اس کے مختلف روپ ہیں۔

شروع سے "آ" گرا اور "مہے" میں تبدیل ہوا تو "ہمے" اور اس سے "ہم" وجود میں آیا [٢٥]

دراصل اردو ادب کے قدیم دور میں ضمیر جمع متکلم "ہم" کے ساتھ مفعولی (اور کبھی اضافی) صورتیں گڈمڈ

ہو کر استعمال ہوتی رہیں۔ جیسا کہ درج شدہ مثالوں سے واضح ہے۔ کبھی ہمن اور ہمناں "ہم" کی جگہ اور اسی کے معنوں

میں استعمال ہوئے اور کبھی مختلف معنوں میں۔ بعد میں ان دونوں صورتوں (فاعلی ضمیر، اور مفعولی صورت) کا فرق و

امتیاز واضح ہوا، اور دونوں کا استعمال الگ الگ متعین ہو گیا۔ چنانچہ ضمیر جمع متکلم کے لیے صرف "ہم" کا استعمال

بر قرار رکھا گیا اور باقی کو متروک کر دیا گیا۔ یہ متروکات ہمن اور ہمناں وغیرہ مفعولی صورتیں اختیار کر کے "ہمیں" کی

شکل میں ڈھل گئیں، اور "ہمیں" کا استعمال مفعولی کے طور پر مخصوص ہو گیا۔ اس کی تفصیلی بحث "ہم" کی مفعولی

صورت کے ذیل میں کی جائے گی۔ اوپر جس اشتقاق کا ذکر کیا گیا ہے (امہے اور امہے ہی) اس کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ممکن

ہے فاعلی حالت سے ضمیر "ہم" مشتق ہوا اور آلی حالت سے "ہم" کی مفعولی صورت "ہمیں" وجود میں آئی ہو۔

---

٢٥ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ٢٧٤۔ بحوالہ بیمز۔ ج ٣۔ ص ٣٠٧

ضمیر واحد غائب "وہ" کی غیر فاعلی صورتیں

اُن، اُنہوں اور اُنہیں (اون، اُنن)

ادبِ اردو کے قدیم نمونوں میں "اُن" کے ساتھ کہیں کہیں واؤ کے اضافے کے ساتھ 'اون' بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ جگہ 'اُنہ' بھی نظر آتا ہے۔ "انہوں" کا استعمال البتہ بہت عام ہے۔ کچھ نمونے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ "کدم راؤ پدم راؤ" کا مصرع ہے: جو انہوں تجہ ہوئے ات ویل بھاگ [1]

شیخ بہاء الدین باجن نے (م ۹۱۲ھ) "اُنہ اور" انہوں" استعمال کیا ہے:

نہ اُنہ جنیا نہ وہ جایا + نہ اُنہ مائی باپ کلایا

ع یہ فیتنی انہوں نے پاوے [2]

"قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) میں "اُنو" اور "اُنن" استعمال ہوئے ہیں۔ درج ذیل مثالیں دیکھیے: [3]

ع ہمیں سب اُنو کا درس پائیں گے

اُنن کوں پتیا بات بولیا نہ جائے + انو کے کنے دل کوں کھولیا نہ جائے

قلی قطب شاہ کے یہاں بھی یہی صورت ہے مثلاً: ع اونو افضل ہیں ساریاں میں اُنن کا بے بدل طالع [4]

---

[1] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۸۲۵-۸۳۹ھ)۔ ص ۲۲۱ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء

[2] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۳۲-۳۳۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۷ء

[3] ملا وجہی۔ مثنوی قطب مشتری۔ ص ۸-۲۴۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۳ء

[4] قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ۔ مرتبہ محی الدین زور۔ اعظم اسٹیم پریس دکن ۱۹۴۰ء

دکنی اردو کی نثری کتاب "سب رس" (تصنیف ۱۰۴۵ھ) کے دو جملے ملاحظہ ہوں: [۵]

۱۔ جتے (جن نے) خلیفہ کوں نیں سمجیا، او تے (اون نے) کیا سمجیا۔

۲۔ آنو کے دلاں، آنوکیاں انکھیاں، آنو کے کاناں، قدرت سوں باندہ کر، غفلت کی دی گرہ۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی کا ایک مصرع ہے [۶]؎ شہنشہ اونن کوں لگے کاٹنے۔

کمال خاں رستمی بیجاپوری کے یہاں بھی یہی صورت ہے جیسے یہ مصرع: آنن ہاتھ میں تیغ جوں ماں ہوا۔

حسن شوقی کا مصرع ہے [۸] نگینہ آنون میں سو جیو باگ مار

"معراج العاشقین" (منسوب بہ خواجہ گیسو درازؒ) کے دو جملے یہاں نقل ہیں: [۹]

۱۔ اون پانچ خواص کے پوڑی باندھنا۔

۲۔ خدا آنو کوں عبادت معاف کریا۔

---

[۵] ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۱۱-۱۲ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

[۶] علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی ص ۱۳۵۔ مرتبہ سید مبارز الدین رفعت۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی۔ سنہ ۱۹۶۲ء

[۷] کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ ص ۴۵۔ ایجوکیشنل پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۸ء

[۸] حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۱ء

[۹] معراج العاشقین (منسوب بہ خواجہ گیسو درازؒ)۔ تصنیف مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری۔ مرتبہ تحسین سروری۔ سنہ ۱۹۶۱ء دکنی دار الاشاعت

اس مطالعے سے واضح ہے کہ دکنی اردو میں "اُن" اور "انہوں" کے علاوہ "اون"، اونو، اُنو، اُنہ اور اُنن بھی مستعمل رہے ہیں۔ شمالی ہند میں یہ لغات عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی ہیں۔ البتہ انہوں کا استعمال عام ملتا ہے۔ اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" (۱۱۰۵ھ) سے دو مثالیں ملاحظہ ہوں: [10]

ے دعا نام اون کا بی بی فاطمہ ؎ طفیلی انہوں کے ہیں اور شما

؎ انہوں کے تن ڈالیں رو رو سر۔

تاباںؔ کا مصرع ہے [11] انہوں کے عشق میں ہوتا ہے آدمی کافر

خواجہ میر دردؔ کہتے ہیں [12] ؎ ورنہ ہے معلوم ہم کو سب انہوں کی خوبیاں۔

مرزا رفیع سوداؔ کا مصرع ہے [13] خرمن سے مور انہوں کے اگر دانہ لے گیا

شاہ نصیر کا مصرع ہے [14] رہا نہ بحر جہاں میں انہوں کا نام و نشاں۔

"کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" کا ایک جملہ ہے [15] جیتے مرتے اونھیں سبھوں کا آسرا اور اُن کے گھرانے کا

---

[10] اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ ص ۱۲۱ تا ۱۱۷۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء اشاعت اول

[11] عبدالحئی تاباں۔ (م ۱۱۶۱ یا ۱۱۶۵ھ)۔ دیوانِ تاباں ص ۱۷۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔ سنہ ۱۹۳۵ء

[12] خواجہ میر درد۔ دیوانِ درد۔ ص ۹۶ / [13] مرزا رفیع سودا (م ۱۱۹۵ھ)۔ کلیاتِ سودا ص ۱۲۶۔ مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ زرین آرٹ پریس لاہور

[14] شاہ نصیر۔ کلیاتِ شاہ نصیر جلد اول۔ ص ۱۸۱۔ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ طبع اول سنہ ۱۹۷۱ء

[15] انشاء اللہ خان انشاؔ۔ "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" ص ۴۵۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی طبع سوم سنہ ۱۹۷۵ء

شیخ صالح محمد عثمانی کے ترجمے "جامع الحکایات ہندی" کا ایک جملہ ہے: [16] ہر چند یہ کام تو انہوں کا سے ہوا۔

مثنوی "سحر البیان" کے دو مصرعے ہیں [17]

۱۔ انہوں سے ہے قایم امامت کا گھر۔

۲۔ انہوں کے جہاں میں پھرے جیسے دن۔

اس سے واضح ہے کہ شمالی ہند میں ایک عرصے تک "انہوں" استعمال ہوتا رہا۔ بعد میں زبان کے تسہیلی رجحان اور تحریکِ اصلاحِ زبان کے مطابق، تخفیف ہوئی اور صرف "اُن" کو برقرار رکھا گیا۔ مختلف حالتوں کے اظہار کے لیے "اُن" پر، حالتوں کی علامات (علامتِ فاعل، مفعول، ظرف و اضافت وغیرہ) اضافہ کی جانے لگیں۔ اب تک یہی استعمال چلا آ رہا ہے۔

اس کے <u>ماخذ</u> سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ "اُن" میں "ن" جمع کا ہے۔ جو لاحقۂ اضافت "نام" नाम سے لیا گیا ہے۔ پراکرت میں اس کا روپ णां تھا۔ اس کے ارتقائی حلقے یہ ہیں: अवणां - अउणां - उणां - اُن [18]

---

[16] شیخ صالح عثمانی (مترجم) جامع الحکایات ہندی ص ۳۵ مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر۔ زرین آرٹ پریس لاہور

[17] میر حسن۔ مثنوی سحر البیان۔ ص ۲۱-۱۳۶ (تصنیف ۱۱۹۹ھ) مطبوعہ نامی پریس لاہور۔ اشاعتِ اول دسمبر ۱۹۶۳ء

[18] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۵۴۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

"اُن" کا ایک روپ "اُنھ" بھی ہے اور "اُنن" بھی۔ ھورنلے کے نزدیک "نھ" جمع کے لیے ہے اور [illegible] سے بہت کچھ تبدیلیوں کے بعد وجود میں آیا ہے [19]

مسٹر ٹرنر کا بیان ہے کہ پراکرش [illegible] (ن) موجودہ زبانوں میں ںھ ہو گیا [20] شوکت صاحب کا کہنا ہے کہ جس طرح "اُس" پر "ے" بڑھا کر "اسے" بنایا گیا تھا، "انھ" پر "یں" بڑھا کر "انھیں" وضع کر لیا گیا [21]

---

[19] شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا ص ۲۵۵۔ بحوالہ تقابلی گرامر پارہ ۳۶۵ء (ھورنلے)۔

[20] ایضاً ص ۲۵۴ بحوالہ ٹرنر - بلیٹن اسکول اور ینٹل اسٹڈیز - جلد ۵ - ص ۱۳۲

[21] شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا - صفحہ ۲۵۴-۲۵۵ - دی سٹی پریس ڈھاکہ ۱۹۵۶ء

ضمیر واحد متکلم "میں" کی مفعولی صورت

اردو میں واحد متکلم کے لیے ضمیر "میں" استعمال ہوتی ہے۔ مفعولی صورت میں یہ "مجھ" اور "مجھے" ہو جاتی ہے۔ قدیم اردو ادب میں کیا صورت تھی، ذیل کی مثالوں سے واضح ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے چند مصرعے دیکھیے:-[1]

مُجھ: ع جو مُجھ انک (انکھ) دلیسے سو منداں تُجھ

مُنج: ع کہ بن دوس منج کہ کہ ماریا اُچاکے

منجہ: ع منجہ انکھول پانچ جو سر پیٹ لیہہ

مجھے: ع مجھے آپ سو یار رکھے تب لگ

منجے: ع نہ کرنا منجے تھا سو کیتا نکھت

منجھے: ع منجھے کیا ہوا ایکل کدم تن لیئیں

شاہ میرانجی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ) کے کلام سے دو مصرعے درج ذیل ہیں:-[2]

مجھ: ع میں تو باندی بردا تیری تیں مجھ ہاتھوں دھریا

منجکوں: ع آپ سندیسا تور گُسائیں تیری منجکوں آس

---

[1] نظامی، فخر دین - مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (تصنیف ۸۲۵ و ۸۳۹ھ) مرتبہ جمیل جالبی۔ ص ص ص ص ۱۵۱-۱۰۷-۹۷-۸۱

[2] زور، محی الدین قادری - دکنی ادب کی تاریخ - ص ۲۵ - نشاط پریس کراچی - سنہ ۱۹۶۰ء

شاہ برہان الدین جانم (شاہ میرانجی کے صاحبزادے، م ۹۹۰ھ/۱۵۹۱ء) کا ایک شعر ہے: ۳

منجھ: ؎ تس کوں گھر میں تن من شاد - جس کا اپے منجھ پر ساد

شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ مطابق ۱۵۰۶ء) کا ایک مصرع ملاحظہ ہو: ۴

مجھ: ع جلوں بلوں ہور بل بل جاؤں مجھ تجھ بن پل نہ سہاوے رے

شیخ خوب محمد چشتی گجراتی (م ۱۰۲۳ھ) کا ایک مصرع ہے: ۵

منج: ع وجیو منج کوں آئی ترنگ

شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین (اکبر و جہانگیر کے معاصر بزرگ ہیں) کا ایک شعر درج ذیل ہے ۶

منجہ: ؎ اِن نینوں کا یہی بسیکھ - ہوں (میں) تجھ دیکھوں توں منجہ (مجھ) دیکھ۔

محمد قلی قطب شاہ (۹۷۳ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے چند مصرعے دیکھیے: ۷

---

۳ محی الدین قادری زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۳۵۔ مطبوعہ نشاط پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۰

۴ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۳۳۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

۵ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۱۹۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء

۶ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۳۶۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

۷ محمد قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ مرتبہ سید محی الدین قادری زور۔ سنہ ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۰ء مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد - دکن
ص ۳، ص ۳، ص ۱۳، ص ۲۶۲، ص ۲۷۲، ص ۲۸۱۔ ص ۲۔

منج :۔ تج نام منج آرام ہے ۔ منج جیو سو تج نام ہے

منجے : مص نہ بھاوے منجے پیو بن ہور کیچ (کچھ)

مجے : مص عشق کیوتاں تھے مجے مشتری

منجہ : مص سب عاشقاں میں منجہ اُو سہرا کیے چاپ ناب سوں

مج : مص مج محمد ناانوں ہے مستی سو لیا راستی

مجہ : مص مجہ نین میں پوجاری پوجا ادھان ہمارا

وجہی کی "قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) سے بھی چند مصرے نقل ہیں :۔[۸]

منج : مص تو اباں سوں توں منج کوں پرنور کر

منجے : مص گھر کر منجے توں، کہ کنکر ہیوں میں

مج : مص مج صبر دیونہار وہ دیدار کہاں ہے

منجہ : مص جو لیایا ہے سات اپنے اس ٹھار منجہ ۔

مجھیاں مص : دیکھت دھن نین جھل کھا کر مجھیاں دعویٰ کیا آ کر

"سب رس" (تصنیف ۱۰۴۵ھ) کے چند جملے درج ذیل ہیں :۔[۹]

---

[۸] ملا وجہی ۔ قطب مشتری ۔ ص ۱، ص ۲، ص ۳۲، ص ۷۲، ص ۸۶ ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۔ سنہ ۱۹۵۳ء

[۹] ملا وجہی ۔ سب رس ۔ ص ۲، ص ۲۱۲، ص ۲۳۸، ص ۹۶ ۔ مرتبہ مولوی عبدالحق ۔ انجمن پریس کراچی ۔ (اشاعت چہارم) سنہ ۱۹۷۷ء

مجھ : میرا ہاتھ سب کے اوپر روز ہوا، جو فقر سوں جھگڑ رے گیا تو فقر مجھ پر ور رہا۔

مجے : میں دل سے عاشق ہوئی ہوں مجے دل سوں ملا۔

منجے : منجے بہت لگتا ہے اس ٹھار عجب، عجب عجب ہے ہزار عجب۔

کمال خان رستمی کے "خاور نامہ" (۱۰۵۹ھ) سے بھی چند مصرعے نقل ہیں: ؎۱۰

مجھ : ؏ الہی جتی بات مجھ بول دے

مج : ؏ در معرفت مج او پر کھول دے

مجھے : ؏ مجھے عقل دے تا پچھانوں تجھے

منجے : ؏ دیا ہے منجے آبرو جگ میں توں

مجے : ؏ اگر جانتا نیں مجے شہریار

مج : ؏ تو بخشے گا او مج کوں بھی ریش مجھ

کلیاتِ شاہی سے بھی چند مصرعے یہاں درج ہیں: ؎۱۱

مج : ؏ سایہ کرم کا دیکھا، ذوق سوں رکھ مجھ بدن

۱۶۱

؎۱۰ کمال خان رستمی بیجاپوری: "خاور نامہ" ص ۹، ص ۹، ص ۹، ص ۲۰۷، ص ۲۰۷ - مرتبہ شیخ چاند ابن حسین احمد نگری - ایجوکیشنل پریس کراچی

؎۱۱ علی عادل شاہ ثانی شاہی - کلیاتِ شاہی - ص ۱۰۲، ص ۱۰۳، ص ۱۰۵ - مسعود پرنٹنگ پریس - دہلی۔

منجے : مصرع ہوا ہے پردہ منجے کا کر ستاریاں کا تگٹ تیں ہیر

مجہ : مصرع ہیرے پاتاں میں ڈالیاں دِسیں خارنج کے مجہ پھول

دیوانِ نصرتی سے بھی مثالیں دیکھیے : [12]

مجہ : مصرع نہ لڑسیں اپنگ مجہ سیتی فوج جوڑ

منج : مصرع تس میں پڑیا منج نظر عابد نیکوں سیر

منجے : مصرع کچہ نہیں سمجیا منجے نعتِ نبیؐ میں دوجا

مج : مصرع طبع کی جج سشہ پری خوش ہوئی پرواز کر

مجے : مصرع اے رشہ کو نین کے سب تے یو روزی مجے

قاضی محمود بحری (معاصرِ ولی) کے کلام میں بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً : [13]

منجہ : مصرع کتیا (کیا) اس گلبدن کوں میں کہ سب کوں سٹ نہ منجہ مارو

منج : مصرع پند کیا کہتا ہے منج کوں کیچ (کبھی) نٹیں (نہیں) منجہ سار کا

منجے : مصرع جگ منجے بولتا کر تو گیانی

منجہ : مصرع کیوں جائے گا منجہ جیو تے یو جاچ جیتے ہی تلک

---

[12] ملک الشعراء ملا نصرتی۔ دیوانِ نصرتی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبعِ قوسین لاہور۔ سنہ ۱۹۷۲ء

[13] قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری۔ صفحہ ۱۶۹۔ ۱۶۹۔ ۱۷۵۔ ۱۴۷۔ مرتبہ ڈاکٹر السید محمد حنیف۔ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۹ء

ولی کے چند مصرعے بھی دیکھیے: [۱۴]

مجہ : ع مجہ صدق طرف عدل سوں اسا اہلِ حیا دیکھ

مج : ع ہے یاد تری مج کوں سبب راحتِ جاں کا

مجھے : ع پیتم کا ناؤں لے کے مجھے بے خبر کرو

اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے دکنی و گجراتی نمونوں میں مجھ اور مجھے کے علاوہ مجہ (جو 'مجھ' ہی ہے)، بغیر ھ کے مج، نون زائد یا غنہ کے ساتھ منج، منجے اور کہیں کہیں مجے اور مجھے پر غنہ کے اضافے کے ساتھ منجھ اور منجھے بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ وجہی کی "قطب مشتری" میں البتہ 'مجھیاں' کی مثال ملتی ہے جو کسی اور کے یہاں نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ 'مجھے' کے بجائے غالباً 'مجھ سے' کے معنوں میں ہے۔

شمالی ہند کی اردو کے نمونوں میں یہ مختلف صورتیں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ وہاں 'مجھ' اور 'مجھے' ہی استعمال ہوا ہے۔ البتہ اسمٰعیل امروہوی کے یہاں 'مج' کی مثال دیکھنے میں آئی۔ ان کی مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہ رض تصنیف ۱۱۰۵ھ کا مصرع ہے: ع کہو پیاری کہی چیز مج کوں دیو [۱۵]

'مجھ' اور 'مجھے' کے استعمال کے سلسلے میں شمالی ہند سے چند مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ فائز کہتے ہیں [۱۶]

---

[۱۴] ولی - دیوانِ ولی - مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی - انجمن پریس کراچی - سنہ ۱۹۵۴ء

[۱۵] اسمٰعیل امروہوی - وفات نامہ بی بی فاطمہ رض - ص ۱۳۷ - مرتبہ نائب حسین نقوی (اردو کی دو قدیم مثنویاں) نقوش پریس لاہور سنہ ۱۹۶۹ء

[۱۶] فائز - دیوانِ فائز ص ۱۷۷ - مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب - انجمن ترقی ہند دہلی - عمدہ پریس دہلی ۱۹۲۶ء

مجھو : ؏ مجھ کوں قرار غم ستی شام و سحر نہیں

حاتم کے دو مصرعے دیکھیے: [17]

مجھ : ؏ تجھے ہے عیش پر مجھ کو پڑی ہے مشکل اے بلبل

مجھے : ؏ حسرت تھی مجھے یار نہ دیکھا تھا اسو دیکھا۔

تاباں کے کلام سے بھی دو مثالیں نقل ہیں: [18]

مجھ : ؏ ساقی ہے ابر مجھ کو محروم رکھ نہ مے سے

مجھے : ؏ کیوں ہمیشہ مجھے دیتے ہو اذیت صاحب

نثر میں بھی یہی صورت ہے۔ مفضل کی کربل کتھا کا ایک جملہ ہے: [19]

مجھ :۔ گھوڑا میرا مجھ بغیر، تجھ پاس آوے، اوس پر سوار ہو جیو۔

قدیم ادبِ اردو کی تمام مثالوں سے واضح ہے کہ 'مجھ' اور 'مجھے' کا استعمال مفعولی معنوں میں ہوا ہے۔

اس کے ماخذ کے سلسلے میں علمائے لسانیات کی آراء و نظریات حسبِ ذیل ہیں:۔

ھورنلے نے 'مجھ' کو اضافی بتایا ہے اور اسے سنسکرت کے मदीयम (مدّیم) سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'مجھ' کو 'مددرشن' سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے یعنی 'مددرہ' اور پھر 'مجھ' بنا۔ [20]

---

[18] تاباں (میر عبدالحئی تاباں)۔ دیوانِ تاباں۔ مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۲۰۳۔ ص ۳۵، انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن سنہ ۱۹۳۵

[19] مفضل علی فضلی (مؤلف)۔ کربل کتھا۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۶۵

[20] اردو زبان کا ارتقا (شوکت سبزواری) ص ۲۵ بحوالہ ھورنلے۔ تقابلی گرامر۔ ص ۲۸۲۔

مشہور ماہر لسانیات لاسن نے 'مجھ' کو سنسکرت کی فرضی، اضافی ضمیر "میہ" سے مشتق بتایا ہے۔ ھورنلے کو اس پر اعتراض ہے کہ صوتی طور پر "س" کی 'جھ' سے تبدیلی کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے[21] کیونکہ 'س' کی تبدیلی عموماً 'ہ' کے ساتھ دیکھنے میں آئی ہے اس اعتبار سے 'میہ' سے 'مہیہ' ہو سکتا ہے 'مجھ' نہیں بن سکتا
شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ 'مجھ' سنسکرت میں 'مہیم' تھا جو پراکرت میں 'مجھم' ہوا، اور 'تجھ' کی تقلید میں 'ھ' اس پر بعد میں بڑھا دیا گیا[22]

شوکت سبزواری اور ھورنلے کی رائے میں کسی قدر مماثلت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شوکت صاحب 'مجھ' کو 'مہیم' سے ماخوذ بتاتے ہیں جب کہ ھورنلے کے نزدیک اس کا ماخذ 'مَدِھیَم' ہے۔ 'مہیم' کے مقابلے میں 'مجھ' کو "مَدِھیَم" سے اخذ کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ "دھ" کے "جھ" سے بدل جانے کی مثالیں دیکھی گئی ہیں[23] اسی طرح 'م' کے غنہ سے بدل جانے کی بھی علمائے لسانیات نے تائید کی ہے۔ لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ "مَدِھیَم" سے "مَجھیں" (منجے وغیرہ) بنا اور پھر 'مجھے' اور 'مجھ'۔ آخری دونوں صورتیں اب بھی مستعمل ہیں۔

---

۲۱ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۵۰ بحوالہ ھورنلے۔ تقابلی گرامر ص ۲۸۲۔

۲۲ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۴۸۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

۲۳ کہیں 'دھ' سے 'د' گر گئی ہے اور حرف 'ھ' باقی رہا ہے (دیکھیے اردو زبان کا ارتقا ص ۲۰۷، آریائی 'ادھی'۔ پالی میں 'دھی' ہوا۔ پراکرت میں 'ہی'، یا 'ہم' (بحوالہ چیٹرجی، بنگالی۔ پ ۴۹۹)۔
اپ بھرنش دور میں 'م' کبھی واؤ (و) سے بدلا، کبھی غنہ سے اور کبھی غنہ اور واؤ کے ساتھ بیک وقت اس کا تبادلہ ہوا۔ اس کا تبادلہ 'ھ' کے ساتھ اور ش کا ج کے ساتھ ہوا۔ (دیکھیے۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۳۵)
مَدِھیَم (مَدِھیَم) سے مَجھیں کے ساتھ 'مجھیاں' بھی محل نظر ہے۔ جو کہ قطب مشتری میں استعمال بھی ہوا ہے۔

ضمیر جمع متکلم "ہم" کی مفعولی صورت "ہمیں"

ضمیر جمع متکلم 'ہم' کی مفعولی صورت 'ہمیں' ہے۔ قدیم اردو ادب کے مطالعے سے اس کے استعمال کی

درج ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اردو کی قدیم ترین دستیاب تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" کے چند مصرعے دیکھیے ؎[1]

۱۔ ہمیں جیو ناں جرم تجہ چاؤ تل

۲۔ نہ راکھے ہمن کوں ہمن اندہ گند

۳۔ کہ کارن ہمن بھوگ رہناں تمن

ان میں سے پہلے مصرعے میں یہ استعمال آج کی اردو کے مطابق ہے۔ دوسرے میں 'ہمن' استعمال ہوا ہے اور مفعولی طور

پر ہے، تیسرے مصرعے میں یہی 'ہمن' اضافی (ہمارے) کے طور پر ہے۔

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) سے چند مصرعے یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎[2]

۱۔ ہمیں عین توں اس میں ہے نور عین

۲۔ ہمن باپ تے ہمن تیرا ز یاست ہے

۳۔ کہ نہ تیرا درد ہمناں کوں آؤ

؎[1] فخر دین نظامی ۔ کدم راؤ پدم راؤ ۔ ص ۹۱ ۔ ص ۱۲۵ ۔ ص ۱۲۵ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء

؎[2] ملا وجہی ۔ قطب مشتری ۔ ص ۱ ۔ ص ۴ ۔ ص ۲۶ ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۴ء

دیوانِ حسن شوقی کا ایک مصرع ہے[۳]: نہ ہمنا شک جہنم کا نہ جنت کی طمع دھرتے۔ یہ "ہمنا" مفعولی "ہمیں" کے طور پر ہے۔

"سب رس" سے بھی دو جملے درج ذیل ہیں، [۴]

۱۔ ژتال فکر یو ہے ہمیں دل کے کنے نا جانا۔

۲۔ عقل ہور دل ہمنا (ہمیں) نا دیکھے۔

دوسرے جملے میں 'ہمنا' کا استعمال بھی مفعولی ہے۔

رستمی کے "خاور نامہ" (مترجمہ ۱۰۵۹ھ) سے بھی چند مصرعے نقل ہیں [۵]

۱۔ جو بچھڑتے وقت تجہ کہیں گے ہمیں۔

۲۔ ہمن بات یو بولنے کی نہیں۔

۳۔ بولیا اس بلا تھے توں ہمناں بچا

۴۔ ہمن ہاتھ دامن پو تجہ مستعصم

۳؎ حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۱ء

۴؎ ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۱۹۶ - ص ۱۹۶ - مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

۵؎ کمال خاں رستمی - خاور نامہ۔ ص ۲۰، ص ۲۰، ص ۱۲، ص ۲۴ - مرتبہ شیخ چاند ابنِ حسین ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۸ء

دوسرے اور تیسرے مصرعے میں 'ہمیں' کی جگہ 'ہمن' اور 'ہمناں' استعمال ہوا ہے۔ چوتھے مصرعے میں البتہ 'ہمن' کا استعمال اضافی کے طور پر ہے (یعنی ہمارا)

شاہی کے دو مصرعے دیکھیے: [۶]

۱۔ حق کے حقایق کی بوجھ لب تو ہمن کوں کہاں۔

۲۔ بولے جہاں کے پار کس ہمنا نہ آوے بولنا

دونوں مصرعوں میں ہمن اور ہمنا کا استعمال مفعولی ہے۔

نصرتی کی "گلشنِ عشق" (تصنیف ۱۰۶۷ھ) میں یہ استعمال ملاحظہ ہو [۷]

۱۔ ہمیں کچھ تیرے بول تے نیں ہے بھار

۲۔ ہمن ہاتھ پے جس کی جم کی نگیں۔

یہاں دوسرے مصرعے میں 'ہمن' مفعولی کے بجائے اضافی کے طور پر ہے۔

ولی کے معاصر بحری کا ایک مصرع ہے: سو لیوں کہیں بہ دم جو ہمیں چھوڑ نہ جانا [۸]

---

[۶] علی عادل شاہ ثانی شاہی - کلیاتِ شاہی - ص ۱۳۵ - ۱۵۳ - مرتبہ سید مبارز الدین رفعت - محبوب پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۲ء

[۷] ملک الشعراء ملا نصرتی - مثنوی گلشنِ عشق - ص ۲۰۶ - ۱۲۱ - مرتبہ مولوی عبدالحق - انجمن ترقی اردو - کراچی، سنہ ۱۹۵۲ء

[۸] قاضی محمود بحری - کلیاتِ بحری - ص ۱۲۵ - مرتبہ ڈاکٹر حفیظ سید - مطبع نولکشور لکھنؤ - طبع اول سنہ ۱۹۳۹ء

اس مطالعے سے واضح ہے کہ 'ہمیں' کے ساتھ 'ہمن' اور 'ہمنا' بھی استعمال ہوتا رہا۔ کبھی مفعولی طور پر اور کبھی اضافی کے طور پر۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً اضافی اور مفعولی صورتیں خلط ملط ہوتی رہیں۔ کہیں کہیں 'ہمن'، ہمیں اور ہمنان، ضمیر 'ہم' کی بجائے بھی مستعمل رہیں، اس کی مثالیں "ضمیر جمع متکلم" کی بحث میں درج کی گئی ہیں۔ شمالی ہند میں کچھ عرصہ یہی صورت رہی۔ مثال کے طور پر اسمٰعیل امروہوی کے چند مصرعے دیکھیے [۹]

۱۔ ہمن کوں ہے امید دیدار کا۔

۲۔ ہمن بخش حق آخرش بے حساب

۳۔ پھر تم ہمن ساتھ کیسے اچھی۔

پہلے دو مصرعوں میں 'ہمن' کا استعمال مفعولی ہے مگر تیسرے مصرعے میں اضافی (ہمیں ہمارے)

دیوانِ فائز سے بھی دو مصرعے یہاں نقل ہیں [۱۰]

۱۔ آیا نہ ہمن پاس کیا وعدہ خلافی

۲۔ دوری نہ کرو ہمن سے اس حد

۳۔ ہمن پر رحم کر اپنے کرم سے

[۹] اسمٰعیل امروہوی۔ وفات نامہ بی بی فاطمہؓ (۱۱۰۵ھ)، اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ مرتبہ ناظم حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔

[۱۰] فائز۔ دیوانِ فائز۔ ص ۱۴۸، ص ۱۸۸، ص ۱۹۷۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ عمدہ پریس، دہلی، سنہ ۱۹۴۶ء

پہلے مصرعے میں یہ استعمال اضافی ہے ، دوسرے میں مجروری اور تیسرے میں ظرفی ۔

شاہ حاتم کا مصرع ہے : [11]

ہمیں یاد آتی ہیں کی باتیں اس گل رو کی رہ رہ کے

فائز کے بعد "ہمن" اور "ہمنا" کا استعمال بطور مفعولی اور اضافی نہیں ملتا جس سے ظاہر ہے کہ فائز کے بعد یہ بے قاعدگی ختم ہو گئی اور صرف "ہمیں" کا استعمال برقرار رکھا گیا ۔ چنانچہ حاتم ، تاباں ، درد ، میر ، سودا سب کے یہاں یہی استعمال دیکھنے میں آتا ہے ۔

"ہمیں" کے **ماخذ** کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے میں ضمیر جمع متکلم کے ماخذ کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ अम्हेहि (پراکرت "امہے ہی") سے "ہمیں" کا اشتقاق قرین قیاس ہے ۔ پراکرت अम्हेहि ، سنسکرت अस्माभि (اسمابھی) سے ڈھالا گیا ہے ۔ اس کے درمیانی حلقے یہ ہیں : اسمابھی ۔ اسّے بھی ۔ امہے بھی ۔ امہے ہی ۔ شروع سے "ا" گرا اور "ہے" میں قلب ہوا تو "ھمے" وجود میں آیا [12]

شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ اردو مفعولی ضمیر "ھمیں" کی اصل سنسکرت "آسمے" یا پراکرت "امہے" ہے "ھمیں" کا غنہ म (م) علامت مفعول کا بقیہ ہے ۔ پراکرت میں فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں

---

[11] شاہ حاتم ، حالات و کلام ۔ ص ۸۹ ۔ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار ۔ جدید اردو ٹائپ پریس ۔ لاہور ۱۹۷۴ء

[12] شوکت سبزواری ۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۴۷ بحوالہ بیمز ۔ ج ۲ ۔ صفحہ ۳۰۷

"امہے" استعمال ہوتا تھا ـــ اور اپ بھرنش میں "अम्हइँ" (اَمْہیئں) [۱۳] ماگدھی میں اس کا روپ "اشمے" تھا۔ یا تو ہراکرت میں بھی غنہ تھا جو کثرتِ استعمال سے غائب ہو گیا یا 'ن' بعد کا ارتقا ہے۔ بہر حال جو صورت بھی ہو تقاضائے قیاس یہ ہے کہ مفعولی حالت میں 'ن' یا 'م' ہو۔ اردو "ہم" فاعل کے لیے اور "ہمیں" مفعول کے لیے عین قیاس کے مطابق ہے [۱۴]

[۱۳] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۴۷۔ (بحوالہ بیمز۔ جلد ۲ صفحہ ۲۰۸) دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

[۱۴] ایضاً۔ ص ۲۴۷، ص ۲۴۸

ضمیر واحد وجمع متکلم کی اضافی حالت

ضمیر واحد وجمع متکلم کی اضافی حالت 'میرا' اور 'ہمارا' ہے تغیرِ تانیث کی صورت میں 'میری'، 'میرے'، اور ہماری، ہمارے۔ اس سلسلے میں قدیم اردو ادب میں کوئی تغیر دیکھنے میں نہیں آتا۔ ابتدا سے آج تک اسی طرح مستعمل ہیں لہٰذا اس کی صرف چند مثالیں درج کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ"[1] کے دو مصرعے دیکھیے :-

۱- جے میرا کے کام کر آج ایک

۲- ہماری تلا واج منکا سنجار

قطب مشتری کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں[2]

۱. مرا حال کیا ہے سو جانے تہیں

۲- ملا دو منجے کوئی میرے شاہ سوں

۳- مری بات توں ہور اس کا ہنر

۴- ادھر عیسی اثر شہ کا وہاں اچنا ہمارا ہو۔

"سب رس" میں بھی یہی کیفیت ہے۔ دو جملے درج ذیل ہیں :[3]

---

[1] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۱۶۳ ۔ ص ۱۱۵۔ انجمن پریس کراچی، سنہ ۱۹۷۳ء

[2] ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص ۷۳، ص ۷۷، ص ۶۶، ص ۸۳۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی سنہ ۱۹۵۳ء

[3] ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۲۲۰، ص ۱۳۹۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۶ء

۱۔ کہ سیر اعشق تو بہت ہے گرم ، کدمیں تو بھی اس کا دل ہوئے گا نرم۔

۲۔ ہمارا بی (بھی) دل ہات (ہاتھ) لیتا ہے۔

"خاور نامہ" میں ہے کہ؎ خدایا توں میرا بخش سب گناہ

کلیاتِ شاہی سے چند مصرعے یہاں نقل ہیں؎[5]

۱۔ سمجھائی پا کہ میں میرا یو مضموں جن کہ (کے) لیا یا ہے۔

۲۔ لیا یاں بُلا میرے کنے آں دلبرِ جانانہ را۔

۳۔ جس دن تے (سے) تمن ساتھ لگیا مترا ہمارا۔

۴۔ ہمارے نین ہور دل میں لگے کھٹ پٹ تمن دیکھت۔

کلیاتِ بحری میں بھی یہی صورت ہے مثلاً اس کے درجِ ذیل مصرعے:؎[6]

۱۔ جالو سینے (سینے) او پر میرے بڑیا یو سیل مرا

۲۔ کہ یو سیو یاں تمن چارا ہمارا۔

بحری، وؔلی کے معاصر ہیں اور وؔلی کے کلام میں بھی یہ استعمال اسی طرح ملتا ہے۔ اس کے چند مصرعے

---

[4] کمال خان رستمی۔ خاور نامہ (مترجمہ ۱۰۵۹ھ) ص ۱۱۔ ایجوکیشنل پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۸ء

[5] علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی۔ ص ۱۰۵، ص ۱۴۱، ص ۱۴۱، ص ۱۴۳۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی۔ سنہ ۱۹۶۲ء

[6] قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری۔ ص ۱۳۲، ص ۱۳۱۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۶ء

ملاحظہ ہوں ۷؎

۱۔ یارو سلام میرا اس یار سیں کہو جا

۲۔ بوسہ دے کر بجھا تو میری پیاس

۳۔ تصور دل میں میرے جلوہ گر ہے صبح و شام اس کا۔

شمالی ہند میں بھی اس سلسلے میں کوئی تغیر نظر نہیں آیا۔ دو ایک مثالیں دیکھیے۔ اسمٰعیل امروہوی کے مندرجہ ذیل مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں: ۸؎

۱۔ دامن حرا لے کے جوڑ کے اوپر

۲۔ اپنی بات میری جو دل میں دھرو۔

۳۔ مرے بیاہ کا دیکھیا ہوگا حال۔

"کربل کتھا" شمالی ہند کی قدیم نثر کی کتاب ہے۔ اس کے چند جملے یہاں درج کیے جاتے ہیں ۹؎

۱۔ ذوالجناح گھوڑا پانی میں منہ نہ ڈالتا اور کہتا نہ پیوں پانی جب لگ کہ خداوند (مالک) میرا آ نہ پیوے جو کے۔ (پی چکے)

۲۔ اس وقت خطیب میرے دادا کی امت کے منبروں پر خطبے پڑھتے اور لعنت میرے دادا کی کہتے۔

۷؎ ولی۔ دیوانِ ولی، انتخاب مرتبہ محمد خاں اشرف و حسرت موہانی۔ طبع ۱۹۴۹ء، ص ۵۰۔ استقلال پریس۔ لاہور۔ طبع دوم ۶۹

۸؎ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۲۱، ص ۱۲۱، ص ۱۱۲۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۹

۹؎ فضل علی فضلی (مؤلف)۔ کربل کتھا۔ ص ۲۰۵، ص ۲۰۷، ص ۸۹ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دلی۔ طبع اول ۶۵

۳- اے کاش، ماں ہماری، فاطمۃ الزہرا جیوتی (جیتی) ہوتی تو یتیمی اور بے کسی ہماری پر رحم کرتی۔

اس مطالعے سے واضح ہے کہ اضافی حالت (میرا، اور ہمارا) میں تغیر نہیں نظر آتا۔ البتہ ایک مقام پر اسو عام طریق سے کچھ ہٹ کر ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" میں یہ مصرع ملتا ہے: بیٹھاوے ہماں کے نہ اگتے بلاؤ ص ۱۶۹ ہے اس میں "ہماں کے" "ہمارے" کے بجائے معلوم ہوتا ہے [10] "ہماں کے" میں "کے" کا جہاں تک تعلق ہے اسے کیرا کا مخفف سمجھنا قرین قیاس ہے۔ "کیرا" کے سلسلے میں شوکت سبزواری نے لکھا ہے "کیرا کو "کے" اور "را" سے بھی مرکب مانا جا سکتا ہے "را" ہر چند مفعول کے لیے ہے لیکن فارسی اور پہلوی میں یہ اضافت اور نسبت کے لیے استعمال ہوا ہے "حامد را پسرے بود" میں "را" اضافی ہے۔ اضافت اور مفعول میں معنوی اتحاد اور لگاؤ نگی ہے۔ ہند ایرانی زبانوں میں ایک کا استعمال دوسرے کی جگہ ہوتا تھا۔" [11] لہذا ممکن ہے یہ "کے"، ہی "ہماں" کے ساتھ مل کر اضافی حالت کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہو، بعد میں جب یہ مفعول کے ساتھ باقاعدہ مخصوص ہو گیا تو اضافت کے لیے "را" استعمال ہونے لگا۔

"میرا" کا ماخذ سکسینہ نے "موکیر" بتایا ہے [12] شوکت سبزواری کو اس سے اختلاف ہے۔

---

[10] عکسی مخطوطہ کدم راؤ پدم راؤ میں اس کا املا "نقمان" ہے لہذا امکان اس بات کا بھی ہے کہ یہی "نقمان"، "ھمن" ہو گیا ہو اور اس "ہماں" کے اضافی سے "ھمناں" بنا ہو۔ قدیم زمانے میں اضافی اور مفعولی حالت میں فرق نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیک وقت اضافی اور مفعولی طور پر استعمال ہوتا رہا۔ جیسا ضمیر جمع متکلم اور اس کی مفعولی حالت کی ذیل میں مثالیں دی گئی ہیں

[11] اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۲۳۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ سنہ ۱۹۵۶ء۔ [12] سکسینہ۔ اودھی کا ارتقا ص ۱۶۳

* حامد حسن قادری نے امیر خسرو کے کلام کا جو نمونہ دیا ہے اس میں "ہماں" (برائے اضافی ہمارا) استعمال ہوا ہے "کہاں گئی آئی ہماں پیاری آئی۔" دیکھیے: داستان تاریخ اردو۔

اس سلسلے میں شوکت سبزواری کی رائے یہ ہے: "اردو غیر فاعلی حالت "مے" کا استعمال صرف اضافی حالت میں ہوا ہے جیسے میرا، میری، میرے۔ بقیہ حالات میں "مجھ" آتا ہے ۔۔۔ "مے" براہِ راست سنسکرت मे سے ماخوذ ہے جو اضافی حالت میں ہے۔ اردو میں اس کی یہ حالت فراموش کرکے نئے سرے سے اس پر علامتِ اضافت "را" اضافہ کر دی گئی"۔ ۱۳

"میری" کی جمع "میریاں" اور "ہماری" کی جمع "ہماریاں" بھی اردوئے قدیم میں کہیں کہیں مستعمل رہی ہے۔ مثال کے طور پر "معراج العاشقین" منسوب بہ گیسو دراز کا ایک جملہ ہے:۔

اپتال میریاں باتاں سن۔ ۱۴

اسی طرح شمالی ہند میں میر کے کلام میں "ہماریاں" دیکھنے میں آیا۔ ان کا حسبِ ذیل شعر ملاحظہ ہو:۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ

مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں ۱۵

---

۱۳ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۴۶۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ طبع اول جولائی سنہ ۱۹۵۶ء۔

۱۴ خواجہ گیسو دراز۔ (منسوب) معراج العاشقین۔ مرتبہ تحسین سروری۔ دکن دارالاشاعت کراچی۔ سنہ ۱۹۶۱ء

۱۵ میر تقی میر۔ کلیاتِ میر۔ باہتمام کیسری داس۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۴۱ء

ضمیر واحد غائب کی مغیرہ صورت

ضمیر واحد غائب 'وہ' کی مغیرہ صورتیں "اُوس" اور "اُسے" ہے۔ مفعولی حالت میں اس پر 'کو' کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اضافی حالت میں 'کا' (کے، کی)۔ قدیم ادبِ اردو کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں نمایاں تغیرات نہیں ہوئے۔ سوائے اس کے، کہ بعض اوقات "اُس" کے بجائے 'اوس' لکھا ملتا ہے۔ نیز شمالی ہند میں اس کی ایک لغت "وِس" بھی مستعمل رہی ہے۔ نمایاں تغیرات نہ ملنے کے سبب طویل مثالوں سے اجتناب کرتے ہوئے صرف چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں اس کا استعمال دیکھیے [۱]

بھی کیا جو اُس کا نہ بھیو نہ کھائیں + جو اپنا ہیں ڈکھ اُس کا سُبھائیں

کمال خاں رُستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" کا ایک مصرع ہے [۲]

کہ اوس او پر بھی او سات صورت کیا۔

حسن شوقی کا ایک شعر نقل ہے [۳]

اوسے خاک خوں سوں برابر کیا + قیامت توں اوس سوں سرا سر کیا

---

۱ فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۸۳ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول ۱۹۷۳ء

۲ کمال خاں رستمی۔ خاور نامہ۔ ص ۵ مرتبہ شیخ چاند ابن حسین احمد نگری۔ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۸ء۔

۳ حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ ص ۸۲ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول ۱۹۷۱ء

نصرتی کے یہاں بھی اوس، دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے یہ مصرع [۴]

ع پن اوس دل میں تھا خان کا سمت دھاک

لیکن ولی کے یہاں یہ زائد 'واؤ' نہیں ملتا۔ ان کے دو مصرعے درج ذیل ہیں: [۵]

ع کہ اس کوں شوق ہے تجھ آستاں پر جبہہ سائی کا

ع تُسے دشوار ہے جگ میں نکلنا غم کے پھاندے سوں۔

شمال ہند میں 'اُس' کے علاوہ 'واؤ' کے اضافے کے ساتھ 'اوس' بھی مستعمل رہا ہے اور شمالی ہند کے قدیم شاعر فائز کے یہاں 'اُس' کی ایک اور لغت 'وس' کا استعمال بھی ملا۔ یہ نہ صرف اس وقت کی بول چال میں شامل تھا بلکہ اب بھی دہلی والوں کی زبان سے سننے میں آجاتا ہے۔ فائز کا مصرع ہے: [۶]

کیا تیں نے وِسے سب جگ میں معظم

لیکن شعرا کے کلام میں اس کا عام استعمال نہیں ملا۔

شمال ہند میں "اوس" کے استعمال کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فضلی کی کربل کتھا کا ایک جملہ ہے [۷]

---

[۴] ملک الشعراء ملا نصرتی۔ دیوانِ نصرتی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبع قوسین لاہور۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۲ء

[۵] ولی۔ کلیاتِ ولی۔ ص ۳۲ مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۴ء

[۶] فائز۔ دیوانِ فائز ص ۱۹۸ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ عمدہ پریس دہلی۔ سنہ ۱۹۴۶ء۔

[۷] فضل علی فضلی۔ کربل کتھا۔ ص ۲۰۳ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دلی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۶۵ء

باگ اوس کے اختیار میں دیجیو کہ وہ تجھے اس قوم سے باہر لے جاوے۔

انشا نے "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" میں بھی "اوس" استعمال کیا۔ جیسے درج ذیل جملہ ۸

جملہ:۔ اوسے اوس کے ماباپ (ماں باپ) اور سب گھر کے لوگ کنور اودے بھان کر کے پکارتے تھے۔

اس قسم کی مثالیں شمالی ہند میں، ڈھونڈنے سے مل ضرور جاتی ہیں لیکن یہ استعمال عام نہیں۔ چنانچہ فائز،

حاتم، اسمٰعیل امروہوی، درد، اثر، میر، سودا کے یہاں بھی اور نثری تصانیف میں بھی حرف "اس" بغیر

واؤ زائد کے ملتا ہے۔

دکن کی اردو میں بھی قدیم ترین مثالوں میں "واؤ زائد" کے بغیر "اس" دیکھنے میں آتا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ

سے مثال پہلے پیش کی جا چکی ہے۔ دو ایک مثالیں مزید درج کی جاتی ہیں۔ شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری م ۹۰۲

کے یہاں یہ استعمال دیکھیے:۔ ۹

ع اُس کے تائیں سر چیا وہ سو ہی پچھان مانے

ع سنوار کے گلی باندھیاں مُشک وہ کیا اس کوں جانے

شیخ بہاء الدین باجن م ۹۱۲ھ کا مصرع ہے ۱۰

---

۸ انشاء اللہ خاں انشا۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی۔ ص ۳۸ مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن پریس کراچی اشاعت سوم ۱۹۷۵ء

۹ شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری۔ قدیم اردو ص ۱۳۔ مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۶۱ء

۱۰ شیخ بہاء الدین باجن۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۳۲ مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن پریس کراچی ۱۹۵۳ء

۶۔ باجن دماخذ اس کی تبولے

حضرت شاہ برہان الدین جانم، حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ ان کا ایک شعر دیکھیے [11]

جے اس شرکت ہوتا آد + ہوتا کل جگ مانہ فساد

اس کے ماخذ کا جہاں تک تعلق ہے "اُس" کو "او" کی اضافی حالت بتایا جاتا ہے اور یہ اصل میں "اَوَشْیَہ" تھا۔ پراکرت میں "اُوش" ہوا، اور پھر "اُس"۔ شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ "اُس" 'وہ' کے درمیانی حلقوں میں سے ایک حلقہ ہے جس میں 'س'، ضمیر "سے" کی یادگار ہے نیز 'اُس'، پڑھے، بڑھا کر "اُسے" بنا لیا گیا ہے [12]

'وہ' کے درمیانی حلقے شوکت صاحب نے یہ لکھے ہیں: [12]

اوش۔ اوس۔ اوہ۔ وہ یا اُو۔

'وہ' کے درمیانی حلقوں میں سے دوسرے نمبر پر "اوس" موجود ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ 'وہ' کا ماخذ ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے ایک مقام پر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے "اوس" مغیرہ حالت کے لیے مخصوص ہو گیا اور 'وہ' ضمیر واحد غائب کے لیے [13]

---

[11] شاہ برہان الدین جانم۔ قدیم اردو ص ۲۶۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۶۱ء۔

[12] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ص ۲۵۵ تا ۲۵۶۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ طبع اول جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

[13] دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ 'وہ' کا ماخذ "اوش" ہو اور "اوس" کا ماخذ "اَسَّ"۔ کیونکہ "اَسَّ" سنسکرت میں ایک حرف تھا جو اشارۂ بعید کا کام دیتا تھا۔ اردو زبان کا ارتقاء ص ۲۵۲ بحوالہ کیلاگ۔ ہندی گرامر ص ۲۱۴۔

ماضی مطلق بنانے کا قاعدہ

اردو میں ماضی مطلق بنانے کے لیے عام طور پر مادۂ فعل پر الف کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کھیلنا مصدر ہے اس سے علامتِ مصدر "نا" گرا دیں تو مادۂ فعل رہ جاتا ہے یعنی "کھیل"۔ اس پر الف کا اضافہ کر دیں تو یہ ماضی مطلق بن جاتا ہے یعنی "کھیلا"۔ اسی طرح "کھانا" سے کھایا، رکھنا سے رکھا وغیرہ۔ لیکن اگر مادہ الف یا واؤ پر ختم ہو رہا ہو تو "یا" بڑھاتے ہیں مثلاً "کھا" سے کھایا، "لا" سے لایا، "کھو" سے کھویا، "سو" سے سویا وغیرہ ۔[1]

اردوئے قدیم ایک تو مندرجہ بالا قاعدے کو اپنائے رہی، لیکن اس کے پہلو بہ پہلو کچھ تغیر بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر، اردوئے قدیم میں ایک رجحان یہ بھی بہت عام ہے کہ مادۂ فعل پر بعض مقامات پر تو صرف الف کا اضافہ کیا گیا ہے لیکن بیشتر موقعوں پر "یا" کا اضافہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر "لکھنا" سے مادۂ فعل "لکھ" اور اس پر "یا" کا اضافہ، "لکھیا"۔ اسی طرح بولیا، رکھیا، دیکھیا، سمجھیا، کہیا وغیرہ۔

دوسرا رجحان اردوئے قدیم میں یہ نظر آتا ہے کہ جب مادۂ فعل الف یا واؤ پر ختم ہو رہا ہو تو صرف "یا" کے اضافے کے بجائے ہمزہ کے ساتھ "ئیا" کا اضافہ کرتے ہیں۔ جیسے "آ" سے آئیا، "کھو" سے کھوئیا وغیرہ۔

ایک اور رجحان یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ "کرنا" سے "کیا" کے ساتھ ساتھ "کیتا" اور "کینا" ماضی مطلق بنایا گیا ہے۔ "کیتا" تانیث کی صورت میں بدل کر "کیتی" اور جمع کی صورت میں "کیتے" استعمال ہوا ہے۔ دکنی اردو میں

---

[1] شوکت سبزواری۔ اردو قواعد ص ۳۷۔ حقی آفسٹ پریس کراچی طبع اول سنہ ۱۹۸۲ء
مولوی عبدالحق۔ قواعد اردو۔ جمالیہ پریس لاہور۔

"کینا" کا استعمال نہیں ملتا۔ شمالی ہند میں کہیں کہیں اکا دکا مثالیں مل جاتی ہیں۔ ذیل میں قدیم اردو سے مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

"کدم راؤ پدم راؤ" کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں، جو مذکورہ بالا رجحانات کے مظہر ہیں[۲]

۱۔ قلم گیان سوں تیں لکھیا بھگ جگ۔

۲۔ انگل ہٹ کر چند کیتا دو پہاڑ

۳۔ کدم راؤ کہیا پدم پٹ کیا

تیسرے مصرعے میں دو رجحان پہلو بہ پہلو موجود ہیں، 'کہیا' جو قدیم اردو کا ایک رجحان ہے اور 'کیا'، جو قدیم اردو میں استعمال ہونے کے باوجود بالکل آج کے طریقے کے مطابق ہے۔ یہ رجحان (موخر الذکر رجحان) اس وقت سے آج تک اسی طرح چلا آتا ہے۔ کچھ اور مثالیں دیکھیے۔

قطب مشتری (تصنیف ۱۰۱۸ھ) کے چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں[۳]

۱۔ چھپایا ہے یو دو میں اپنا توں راز

۲۔ جو دھن کا صورت سنہ کوں دکھلا دیا + سو شہ لیدی کوں سیرتی لیدا دیا

۳۔ خزاں قتل کیتا ہے کیلی بہار

---

[۲] فخر دین نظامی دکنی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۱۱۱-۱۱۲ شعر ۶۵ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی اشاعت اول ۱۹۷۳ء

[۳] ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص ۳ شعر ۳۱-۶ ۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

متن مطابق صفحہ ۳

صـ۲ ← ۴۔ جے چیز اپنی قدرت تے پرگٹ کیا۔

پہلا اور آخری مصرع آج کی اردو کے مطابق ہے۔ بقیہ دونوں مثالیں دکنی اردو کا رجحان واضح کر رہی ہیں۔ "قطب مشتری" ہی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎۴

صـ۳ ← پتنگ کوں دیئے کا پرت لا دیا ٭ کمل پر توں بھونرے کوں لبدائیا۔

"سب رس" کے دو جملے درجِ ذیل ہیں ؎۵

صـ۸۸ ۱۔ نظر پوچھیا کہ تمیں کون ہیں کیا نام دھرتے ہیں۔

۱۳۲ ۲۔ ان چورنے ان حرام خورنے چار ہی کھایا۔

"خاور نامہ" (سنِ ترجمہ ۱۰۵۹ھ) کے چند مصرعے دیکھیے ؎۶

صـ۲ ۱۔ نگہبان ہر برج او پر رکھیا۔

صـ۲ ۲۔ دیا پانچواں گھر بھی بہرام کوں۔

صـ۳۴ ۳۔ اندیش دیکھ کیا کام لیایا ہے یاں

۱۹ ؎ اگے جا ان کوں بلا لیایا ٭ پھر اگر آتش کو تو دکھلائیا

؎۴ ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ صـ۳۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

؎۵ ملا وجہی۔ سب رس (تصنیف ۱۰۴۵ھ) صـ۱۳۲-۸۸۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

؎۶ کمال خان رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ۔ صـ۱۹-۳۴-۲-۲ حصہ ۲ مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

قلی قطب شاہ کے چند مصرعے بھی یہاں نقل ہیں ۔[7]

۱۔ باتاں گھرسیاں نرملیاں وار یا جوہر ے نانوں پر

۲۔ کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا۔

۳۔ صنعت سوں کیتا صانع لب لال موہنیاں کے۔

حسن شوقی (۹۶۸ھ ۱۰۵۰ھ) کے بھی چند مصرعے ملاحظہ ہوں [8]

۱۔ سنیا آن کر سر نگلی بائے تل

۲۔ سو شوقی نے لیا شوق لولیا تمام

۳۔ کیا رام خلوت منے انجمن [9]

ابن نشاطی کی مثنوی "پھولبن" (تصنیف ۱۰۶۶ھ) میں بھی یہی صورت ہے مثال کے طور پر[10] درج ذیل مصرعے:۔

۱۔ ولایت حسن کا توں ملک کوں غشیا

۲۔ زمیں تے نیشکر جب بھار آیا

۳۔ قبا کوں پھول کی توں چاک دیتا + ملک کے پیرہن کوں تنگ کیتا

---

[7] قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ ص ۱۹۱ ص ۲۴۰۔ مرتبہ محی الدین قادری زور۔ اعظم اسٹیم پریس دکن ۔ سنہ ۱۹۴۰ء

[8] حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی ۔ مرتبہ جمیل جالبی ۔ انجمن پریس کراچی طبع اول سنہ ۱۹۷۱ء۔

[9] ایضاً ۔ فتح نامہ نظام شاہ۔ تصنیف ۹۷۲ھ ۔

[10] ابنِ نشاطی۔ مثنوی پھولبن ۔ ص ۲ ص ۳ ص ۲ ۔ انجمن ترقی اردو ۔ کراچی سنہ ۱۹۵۵ء

ملا نصرتی (۱۰۸۳ھ) کے چند مصرعے دیکھیے [11]

۱۔ پڑیا دغدغے کی حرارت میں جگ

۲۔ جے کوئی عرض کیتا ایسی مدعا

۳۔ تو یوں کھیلتا کیوں یتی (اتنی) تیز نہر

بحری، ولی کے معاصر ہیں۔ ان کے چند مصرعے درج ذیل ہیں [12]

۱۔ کل دن تجے دیکھیا تو اتھا آج بی (بھی) دیکھیا

۲۔ تب اس چھوڑ گلشن کوں گھر آییا

۳۔ گل اسرار کے گود بھر آییا

ولی کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں [13]

۱۔ چاروں طرف کھلیا ہے گلزار رنگ و رس کا

۲۔ اے عیسوی دم جگ منے پایا وہ عمر جاوداں

---

[11] ملک الشعرا ملا نصرتی۔ دیوانِ نصرتی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبع قوسین لاہور۔ طبع اول سنہ ۱۹۷۲ء

[12] قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری۔ ص ۱۳۶۔۱۳۹۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

[13] ولی۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی۔ طبع سوم سنہ ۱۹۵۴ء

"معراج العاشقین" کا ایک جملہ ہے [۱۴] "یو پانچ عناصراں کا ممتنع الوجود ہو جیا تو پیر کا روح معلوم ہو جائے گا۔"

شمالی ہند کی اردو میں دکنی اردو کے یہ رجحانات زیادہ راہ نہیں پاتے۔ صرف اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اسمٰعیل امروہوی کے چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں [۱۵]

وعدہ میرے بابا کا آپہنچیا ✦ ضرور یہاں سے جانا جو مجھ کو ہویا

ع دیکھیا ان کوں ہو روئے کیتا سخن

"کیتا" کی تانیث بھی مستعمل رہی ہے جیسے انہی کا یہ مصرع : علی کی طرف زود کیتی نظر

اور جمع "کیتے" بھی استعمال کی گئی ہے۔ جیسے ان کا یہ مصرع : گورستان میں جا کے کیتے نظر۔

ان کے علاوہ شمالی ہند کے دوسرے شعرا کے یہاں یہ تغیرات نظر نہیں آتے۔ البتہ مسعود حسین خاں نے خسرو سے کھڑی اور برج ملی زبان کا یہ نمونہ بھی نقل کیا ہے [۱۶]

ایک گنی نے یہ گن کینا ✦ ہریل پنجرے میں دے دینا

"کینا" اور دینا (بروزن پینا، جینا) بمعنی کیا اور دیا۔ لیکن ماضی مطلق بنانے کی یہ صورتیں زیادہ عام نہیں۔ اس کے برعکس امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) کے یہاں ماضی مطلق کا موجودہ قاعدہ بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے یہ پہیلی :۔

---

[۱۴] مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری۔ معراج العاشقین (منسوب بہ گیسو دراز) ص ۲۲۔ مرتبہ تحسین سروری۔ دکن دار الاشاعت کراچی ۱۹۶۱ء

[۱۵] اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۳۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۲۰، مرتبہ نایب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۹ء

[۱۶] ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ص ۱۰۲۔ مطبع عالیہ۔ لاہور۔ ۱۹۶۶ء

ایک تھال موتی سے بھرا + سب کے سر پہ اوندھا دھرا [۱۷]

اسی طرح "مقدمہ تاریخ زبانِ اردو" میں "نام دیو" سے قدیم کھڑی بولی کا مندرجہ ذیل نمونہ بھی نقل کیا گیا ہے [۱۸]

ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں سے آیا۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہم آج بھی استعمال کرتے ہیں۔ شمالی ہند کی اردو میں یہی استعمال عام رائج تھا یہ اردو کی اپنی چیز ہے چنانچہ قدیم اردو کے دکنی دور میں بھی یہ استعمال بالکل ابتدا ہی سے چلا آ رہا ہے۔ دیگر رجحانات کو بعد میں بالکل ترک کر دیا گیا۔ صرف موجودہ طریقے کو برقرار رکھا گیا۔

قدیم اردو میں، ماضی مطلق میں یائے زائد کے استعمال کی توجیہہ ماہرینِ لسانیات کی آرا کی روشنی میں اس طرح کی جا سکتی ہے :۔

دکنی اردو میں لاحقہ "ے ۔ ا" سے پہلے ایک "ی" (اسم مفعول یا ماضی میں) ادا ہوتی تھی اور یہ ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ جیسے پڑھیا۔ لکھیا۔ اُٹھیا۔ چلیا۔ نکلیا وغیرہ۔ یہ "ی" موجودہ زبانوں کے ایک رجحان کے زیرِ اثر اضافہ کی گئی ہے۔ سنسکرت وغیرہ جو کلمے کے وسط یا آخر میں آتے ہیں پراکرت میں اکثر حذف ہو جاتے تھے۔ لیکن ان کی حرکات باقی رہ جاتی تھیں۔ پراکرت میں یہ حرکتیں اپنی حالت پر رہیں۔ بول چال کی زبانوں میں دو حرکتوں کا اجتماع ثقیل سمجھا گیا اس لیے یا تو ان حرکات کو سابق حرکت میں مدغم کر دیا گیا یا ان کے درمیان "ی" یا "واؤ" (و) اور داخل کر دیے گئے

---

[۱۷] ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو۔ ص ۱۰۲۔ مطبع عالیہ۔ لاہور۔ ۱۹۶۶ء

[۱۸] ایضاً۔ ص ۱۰۱۔

مثلاً "میلا" سنسکرت میں "میلکہ" تھا۔ "ک" گر جانے سے "میلَ ے" رہا۔ اردو میں "ل" کے "ے" اور آخری "ے" کے اجتماع کو ثقیل سمجھ کر دونوں کو مدغم کر دیا گیا اس طرح "میلا" بنا۔ چلیتہ کی "ت" گری تو "چلِ ے و" ہوا۔ یہاں च् اور ल का ادغام دشوار تھا اس لیے ان کے درمیان "ی" داخل کر دی گئی۔ اس طرح "چلیا" (دکنی) اور "چلیو" (برج) بنے۔

ڈاکٹر ویبر کا بیان ہے کہ جین پراکرت میں وقفیہ گرتے نہ تھے بلکہ ایک خفیف التلفظ "ی" سے بدل جاتے تھے ہندوا اکو نے اس کی تائید ھیم چندر کے بیان کردہ ایک اصول سے کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ حروفِ صحیح گرنے کے بعد جو अ باقی بچ جاتا ہے وہ ایک خفیف "ی" کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ دکنی اردو اور برج میں اسم مفعول (یا ماضی) کی "ی" ھیم چندر کے اس اصول کے مطابق ہے۔ اس سے شوکت سبزواری نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ "ی" زیادہ قدیم ہے جو اردو اسم مفعول (یا ماضی) سے بعد میں تخفیف کر دی گئی [19]

"کیتا" کے ماخذ پر روشنی ڈالتے ہوئے شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ "کیتا" "کرِتہ" سے ڈھالا گیا ہے۔ "کرِتہ" سے "ر" گر گیا لیکن اس کا کسرہ "ک" پر باقی رہا۔ اس طرح "کِ ے تہ" بنا۔ پھر "ہ" کے الف سے بدل جانے یا گر جانے سے "کِ ے ت" یا "کِ ے تا" بنا۔ "ر" کے گر جانے سے باقی بچ رہنے والا کسرہ ایک خفیف التلفظ "ی" کی مانند پڑھا گیا اور اس کا املا "کیتا" ہوا۔ بعد میں غالباً اس کی "ت" بھی گر گئی اور اس کی حرکت باقی رہ گئی جس کے باعث "کِ ے ا" اور پھر "کیا" ہوا۔ "ر" کے گرنے سے جو کسرہ باقی رہا تھا اور جو خفیف التلفظ "ی" کی مانند ادا کیا گیا اس کی یادگار "کیا" میں بھی "ی" کی صورت میں موجود ہے [20]

[19-20] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۳۰۵-۳۰۶۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

ماضی معطوفہ

ماضی معطوفہ [1] مادے کے آخر "کر" یا "کے" اضافہ کرنے سے بنتا ہے۔ یہ استعمال ادبِ اردو میں کس وقت سے موجود ہے اس کا جائزہ لینے سے قبل، صاحبِ جلوۂ خضر کی رائے نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو میں ماضی معطوفہ اور امر میں فرق نہ تھا۔ ناسخ نے امر پر "کر" بڑھا کر "ماضی معطوفہ" بنائی۔

اردو میں مصدر سے علامتِ مصدر یعنی "نا" گرانے کے بعد "مادہ" باقی رہ جاتا ہے۔ یہی مادہ دراصل امر صیغۂ واحد حاضر ہوتا ہے۔ اس پر "کر" اور "کے" بڑھا کر "ماضی معطوفہ" بنتی ہے۔ لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس طرح پر اس کا استعمال ناسخ نے متعین کیا، یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ استعمال اس طریق پر کب سے شروع ہوا اس سلسلے میں اردو کے دستیاب ادب سے مختلف ادوار کے نمونے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جن کے ذریعے اصل حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

دکنی ادب میں نظامی دکنی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کو تقدم زمانی حاصل ہے اس کا ایک شعر یہ ہے:

جو میں تج کہیا توں تنفن دور کر
تنفن دور کر کر مجے دے اُتر [2]

---

[1] مولوی عبدالحق نے اسے حالیہ معطوفہ کا نام دیا ہے۔ قواعدِ اردو ص ۱۰۶ ۔ جی ایف پریس ۔ لاہور۔

[2] فخر دین نظامی ۔ کدم راؤ پدم راؤ ۔ (تصنیف ۸۲۵ و ۸۳۶ھ) ص ۷۷ مرتبہ جمیل جالبی ۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء

شیخ بہاء الدین باجن، گجرات کے صوفیا میں سے ہیں۔ انہوں نے ۹۱۲ھ میں وفات پائی۔ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں ان سے جو کلام نقل کیا ہے اس سے دو شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:۔

ے بھونرا لیوے پھول رس رسیا لیوے باس
باجن مالی سینچے آس کر بھونرا اگھڑا اداس

ے محمد سرور سہریم کا رحمت اللہ بھریا
باجن جیوڑا وار کر سرآگیں دھریا ۳ے

احمد شاہ، بادشاہ گجرات کے زمانۂ حکومت میں تعمیر ہونے والی ایک مسجد کے کتبے پر دو شعر اردو میں بھی درج ہیں۔ احمد شاہ، گجرات کے آخری بادشاہ سلطان بہادر مظفر ننو کا پیش رو تھا۔ اس کے بعد سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ احمد شاہ ۹۶۱ ہجری میں تخت نشین ہوا اور ۹۶۸ ہجری میں قتل کر دیا گیا۔ یہ مسجد اسی کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوئی۔ اس پر جو کتبہ ہے اسی زمانے کی اردو کا نمونہ ہے اور اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ یہ زبان ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل چکی تھی یہاں تک کہ اس میں کتبے تک لکھے جاتے تھے۔ بلا مبالغہ یہ ناسخ سے بہت پہلے کی بات ہے۔ کتبے کے شعر درج ذیل ہیں ان میں "کر" کا استعمال موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے:۔

۳ے محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ ص ۲۰۸۔ اشرف پریس لاہور ۱۹۷۲ء

فنا دُنیتی سمجائے کر باندھے شاھی پال ۔ باتو مسجد کرتیس بیجیں ملک جلال

تاریخ اس بیت کی ہوئی سولوں مشہور ۔ مسجد جامع کے بیچ دکھایا ہے نور

آخری مصرعے سے مسجد کا سنِ تعمیر یعنی ۹۶۳ ہجری نکلتا ہے ۴

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م ۹۷۳ھ) سے جو اقتباسات شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں نقل کیے

ہیں ان میں سے ایک درج ذیل ہے :۔

کہیں سو ہووے اندھیاری راتا ۔ سانجہ بتی کر لاوے دکھاتا

ہو کر دیوا راتیں ساری ۔ لا کر جوت دکھاوے بھاری

یہ استعمال اس طور پر بہت عام رہا ہے ۔ اسی کا ایک اور نمونہ دیکھیے :۔

کہیں تیغ ہوا بھیس لیاوے دھرتی ہو کر آپ بچھاوے

کر پر پیت ہو بھاری بیسے سُرماں ہو کر نینوں بیسے ۵

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" کے مصرعے ہیں :۔

۱۔ کہ آسمان پے دیکھ کر بولنا

---

۴ تلخیص الاردو ۔ ص ۱۲ تا ۱۳ ۔ مولوی عبدالحق کا مضمون "اردو زبان کے قدیم کتبے"

۵ محمود شیرانی ۔ پنجاب میں اردو ۔ ص ۲۲۰-۲۱۹ ۔ اشرف پریس لاہور ۔ ۱۹۷۲ء

۲۔ عطارد لگا اس کوں سمجھائے کر [۶]

"سب رس" کا ایک جملہ ہے :۔

فرصت کا وقت غنیمت کر جان، تدبیر سیر من دھرے [۷]

غنیمت کر جان بمعنی غنیمت جان کر۔

ابنِ نشاطی کی مثنوی "پھولبن" مصنفہ ۱۰۶۷ھ کا مصرع ہے :۔

پھراوے چرخ کر تو روز آسمان [۸]

ولی کہتا ہے : ع شرح کوں گر اجازت ہو تو آوے سیس سوں چل کر [۹]

"معراج العاشقین" [۱۰] میں "عطفی کر" کا استعمال درج ذیل انداز میں ملتا ہے :۔

جملہ ۱ :۔ یو چار چیزاں چھپا کو دکھیا تھا۔

۲ :۔ ظاہر باطن کی ترتیب لوج کو، قایم اچھے تو اسے صوفی مذہب بولتے ہیں۔

---

[۶] ملا وجہی۔ مثنوی "قطب مشتری"۔ ص ۳۱-۱۲ ۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

[۷] ملا وجہی۔ "سب رس"۔ ص ۱۵۱ ۔ انجمن پریس۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۶۷ء

[۸] ابنِ نشاطی۔ "پھولبن"۔ ص ۲ ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ سنہ ۱۹۵۵ء

[۹] ولی ۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۴ء

[۱۰] معراج العاشقین کو عرصۂ دراز تک خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف کہا جاتا رہا، لیکن بعد کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب دراصل "تلاوۃ الوجود" کا خلاصہ ہے اور یہ رسالہ اور اس کا خلاصہ دونوں مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ہیں۔ مخدوم شاہ حسینی، پیر الہ حسینی کے مرید و خلیفہ تھے جو میراں جی خدانما کے مرید و خلیفہ تھے۔ میراں جی خدانما کا سالِ وفات ۱۰۷۰ھ ہے۔ یہ حضرت امین الدین اعلی کا سلسلہ ہے اور "تلاوۃ الوجود" میں، جس کا خلاصہ معراج العاشقین ہے، سلسلۂ امینیہ کے مخصوص تصوف کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تصنیف گیارھویں صدی ہجری کے اواخر اور بارھویں صدی ہجری کے

۳۔ اللہ سوں ملنے چلو کر کو عرض کیے۔

۴۔ معراج کی خبر دے کو بندے کوں سرفراز کر کو بھیجا [۱۱]

ایک سے زاید مثالوں کے اندراج کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ استعمال اسی صورت میں، اس کثرت سے عام ملتا ہے۔

اب شمالی ہند کے اردو ادب سے اس استعمال کی مثالیں دیکھیے۔ اسمٰعیل امروہوی[۱۲] کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہ رض"

(تصنیف ۱۱۰۵ھ) کے دو مصرعے ہیں:-

۱۔ بیبی فاطمہ رض روئے کر غش تھی

۲۔ علی رض روئے کر بہوت زاری کریں۔

انھی کا ایک اور مصرع دیکھیے اس میں فعل "کر" کے ساتھ بھی "کر" علطی استعمال ہوا ہے:-

ایسے سوال کر کر جو منکر نکیر [۱۳]

بقیہ حاشیہ:- اوائل کی تصنیف ہے جب کہ حضرت گیسو دراز کا سالِ وفات ۸۲۵ ہجری یعنی تقریباً پونے تین سو سال پہلے کا ہے اس اعتبار سے اردو زبان کی پہلی تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" ہے تاوقتیکہ کوئی اور تصنیف سامنے آجائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مقدمہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۷۳ء

۱۱۔ مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری۔ معراج العاشقین ص ۲۲ ص ۲۸ ص ۲۵ ص ۲۲

۱۲۔ ان سے قبل کا نمونہ محمد افضل جھنجھانوی کے "بارہ ماسہ" یا "بکٹ کہانی" میں ملتا ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی، وجہی کے معاصر ہیں۔ افضل نے ۱۰۲۵ ہجری میں وفات پائی۔ بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی میں "کر" کی جگہ "کے" استعمال ہوا ہے مثلاً یہ شعر: ارے بھادوں کہاں ساون کہاں رے + ملوٹک آئے کے فانی جہاں رے

شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۳۰۹۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

۱۳۔ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ ص ۱۳، ص ۱۱۶، ص ۱۱۷۔ نقوش پریس لاہور سنہ ۱۹۶۹ء

فائز کا مصرع ہے :- کہ خزاں کرد کھاوے اس کوں بہار [۱۴]

فضلی کی "کربل کتھا" تصنیف ۱۱۴۵ھ کے دو جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

۱۔ شاہِ شاہاں نے اس گدائے بے رتبہ کوں اوس رتبہ علیہ حضور میں باریاب کر امتیاز دیا۔

۲۔ جب کہ مجھے زخموں میں چور کر، گھوڑے سے زمین پر گراویں [۱۵]

تاباںؔ (عبدالحئی تاباںؔ متوفی ۱۱۶۱ یا ۱۱۶۵ھ) کے یہاں 'کر' اور 'کے' دونوں کا استعمال ملتا ہے ملاحظہ ہو :-

؎ کس طرح رنگ کے نہ مرجائے کوئی مل تجھ سے ✦ ایک تو تنگ دہاں تس کے اوپر کم سخنی

؎ تو ہے اقبال مند اے تاباںؔ ✦ میں نے دیکھا ہے خوب کر کر غور [۱۶]

شاہ حاتم (متوفی ۱۱۹۷ھ) کہتے ہیں :-

؎ کروں قربان جی کو اُس گھڑی اس وقت اس پل کے

کہ جس دم ناز سے وہ یار آوے گھر مرے چل کے [۱۷]

---

[۱۴] فائز - دیوانِ فائز - ص ۱۷۸ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب - انجمن ترقی ہند دہلی مطبوعہ جید پریس دہلی سنہ ۱۹۴۶ء

[۱۵] فضلی - کربل کتھا - ص ۲۰۳ - ص ۲۱۴ مرتبہ مالک رام و مختار الدین - دیال پرنٹنگ پریس دلی - اشاعت اول سنہ ۱۹۶۵ء

[۱۶] عبدالحئی تاباںؔ - دیوانِ تاباںؔ ص ۲۰۵ - ص ۱۹۷ مرتبہ مولوی عبدالحق - انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن سنہ ۱۹۳۵ء

[۱۷] شاہ حاتم - حالات و کلام ص ۹۵ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار - مطبوعہ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۴ء

درد کا شعر ہے :-

؎ سب خونِ دل ٹپک ہی گیا لوہو لوہو کر + اے درد بس کہ عشق سے ہیں تھا شکستہ دل ۱۸

میر تقی میر کہتے ہیں :-

؎ مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد + دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا ۱۹

سودا (مرزا رفیع سودا) کا ایک شعر ہے :-

؎ توڑ کر بت خانے کو مسجد بنائی تو نے شیخ + برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا ۲۰

میر امن کی "باغ و بہار" ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء کی تصنیف ہے۔ اس کے دو جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

۱۔ غریب نوازی کر کر اس عاجز کو قبول کیجیے۔

۲۔ جلدی سے قفل توڑ کر مکان کے بھیتر گئے۔ ۲۱

میر شیر علی افسوس نے "خلاصۃ التواریخ" کا ترجمہ ۱۸۰۴ء تا ۱۸۰۷ء مکمل کیا۔ یہ ترجمہ "آرائشِ محفل" کے نام

۱۸؎ خواجہ میر درد۔ دیوانِ درد۔ ص ۸۲۔ زرین آرٹ پریس۔ لاہور۔ ۱۹۶۲ء

۱۹؎ میر تقی میر۔ کلیاتِ میر۔ ص ۲۲ بترتیب جدید مع مقدمہ و فرہنگ۔ باہتمام کیسری داس مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔ ۱۹۲۱ء

۲۰؎ مرزا رفیع سودا۔ کلیاتِ سودا۔ ص ۲۲ مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔

۲۱؎ میر امن۔ باغ و بہار۔ ص ۱۸۲ ص ۲۰۔ حمایت الاسلام پریس۔ لاہور۔ ۱۹۶۸ء

سے ۱۸۰۸ء میں چھپا۔ اس کے دو جملے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ بعد اس کے سلطان شمس الدین التمش کی سلطنت میں اپنے مرشد کے دیدار کا مشتاق ہو کر دلی کی طرف روانہ ہوا۔

۲۔ وے بعد ان کے مرنے کے لباس دلہنوں کا بناؤ سنگار کر، بن ٹھن ار گجا سوند ھا لگا، اس کی لاش کے ساتھ اگر موجود ہو نہیں (ہوتیں) تو اس کا کپڑا ہاتھ میں لے، آگ میں جل جاتی ہیں۔ [22]

شیخ صالح محمد عثمانی کے ترجمے "جامع الحکایات ہندی" (۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء) سے دو جملے درج کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ مگر ایک دو شخص جو وہاں سے اپنے تئیں بچا کر جان لے بھاگے تھے۔

۲۔ اسی طرح بادشاہ مصلحت جان کر رعیت میں سے کسی کو سیاست کرے تو اس بیچارے کے حال پر روے [23]

انشا نے کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی " خالص ہندی (اردو) میں لکھی۔ اس کے دو جملے دیکھیے :۔

۱۔ جو رائی کو پربت کر دکھاؤں۔

۲۔ اور سے اوس کے ماں باپ اور سب گھر کے لوگ کنور اودے بھان کر کے پکار رہے تھے [24]

سر سید احمد خان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کا ایک جملہ ہے :۔

---

[22] میر شیر علی افسوس، ترجمہ "خلاصۃ التواریخ" بعنوان "آرائش محفل" ص ۶۵-۸۴ مرتبہ کلب علی خان فائق۔ زرین آرٹ پریس لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء

[23] شیخ صالح محمد عثمانی۔ ترجمہ "جامع الحکایات ہندی" ص ۱۲۳-۶۵ مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔

[24] انشاء اللہ خان انشا۔ "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" ص ۴۸-۴۶ مرتبہ مولوی عبدالحق مقدمہ سید قدرت نقوی۔ انجمن پریس کراچی اشاعت سوم ۱۹۷۵ء

اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قائم کر دیں گے تو ہماری بڑی نیکنامی گورنمنٹ کی ہوگی ۲۵

اسمٰعیل امروہوی اور افضل جھنجھانوی سے لے کر سر سید احمد خاں تک عطفی "کر" اور "کے" بدستور مستعمل رہا ہے اور آج بھی بعینہ رائج ہے۔ یہی نہیں بلکہ افضل جھنجھانوی سے قبل بھی اگر ہم دیکھنا چاہیں تو اس کے نمونے مل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی ہند کے قدیم ترین شاعر (اردو) امیر خسرو کہے جاتے ہیں (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء)۔ جنہوں نے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کی۔ شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں ان کا جو کلام نقل کیا ہے اس سے دو شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

سیج وچھتی دیکھ کے (میں) روؤں دن رین ⁂ پیا (پیا) کرتی میں پہروں پل بھر سکھ نہ چین

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر ⁂ ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر ۲۶

بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ اشعار امیر خسرو کے نہیں بلکہ کسی اور شاعر کے ہیں اور امیر خسرو سے منسوب کر دیے گئے ہیں تب بھی عطفی "کر" کے استعمال کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ وہ اس کے معینہ استعمال پر دال ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی تصنیف "اردو کی کہانی" میں گیانیشور کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں جن میں کھڑی بولی (اردو) کی جھلک موجود ہے۔ گیانیشور، مہاراشٹر کے یجرویدی برہمن تھے۔ سہیل بخاری نے لکھا ہے کہ ان کا جنم شک سمبت ۱۱۹۷ مطابق ۱۲۷۵ عیسوی ہے۔ ان کی بولی کا جو نمونہ انہوں نے دیا ہے اس میں بھی عطفی "کر" کا استعمال ملتا ہے مثلاً یہ اشعار:۔

---

۲۵ سر سید احمد خان۔ اسباب بغاوت ہند۔ ص ۱۲۶

۲۶ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ ص ۱۲۴

؎ دنیا تج کر کھاک لگائی جا کر بیٹھا بن موں + گمبھیر مُدرا اجر اسن میں دھیان دھرت ہے من موں

؎ تیرتھ کر کے اوٗ مر کوئی جوگ جگت میں ساری + دھن کامن اوگمبر تیاگے جوگ کما یا بھاری

؎ گپت بھئے کر پرگٹ ہووے گورکھ متھرا کاسی + ریدھو بھوے جی بیراں جو نکلے ستیہ لوک کے باسی [۲۷]

نام دیو بھی گیانیشور کے معاصر ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ نام دیو گیانیشور کے چیلے تھے [۲۸] جب کہ ڈاکٹر تارا چند، نام دیو کو وسوبا کھیچر کا چیلا بتاتے ہیں [۲۹] "مشر بندھو ونود" میں ان کا جنم ۱۲۷۰ عیسوی میں اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (اشاعت ۱۹۵۷ء) میں ۱۳۰۰ عیسوی کے لگ بھگ بتایا ہے۔ سہیل بخاری نے ان کا بھی ایسا کلام نقل کیا ہے جس میں کھڑی بولی (اردو) کا عکس نظر آتا ہے مثلاً یہ شعر:-

۱۔ کے من ترنگا رے سنار سا گر بس کو بنا + جھوٹی مایا دیکھ کے بھولا رے منا

۲۔ پانڈے تمری گائتری لودھے کا کھیت کھاتی تھی + لے کر ٹھینگا ٹنگری توری لنگت لنگت جاتی تھی [۳۰]

دونوں شعروں میں سے پہلے میں عطفی "کے" اور دوسرے میں "کر" استعمال ہوا ہے۔ یہ ناشخ سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔

---

[۲۷] ڈاکٹر سہیل بخاری۔ اردو کی کہانی ص ۱۶۱-۱۶۰ ۔ منظور پریس لاہور۔ ۱۹۷۵ء

[۲۸] ایضاً ص ۱۶۵ بحوالہ مشر بندھو ونود حصہ اول ص ۱۸۳

[۲۹] ڈاکٹر تارا چند۔ انفلوئنس آف اسلام ص ۲۲۲

[۳۰] سہیل بخاری۔ اردو کی کہانی۔ ص ۱۷۰-۱۶۹

جب دلی اجڑ کر لکھنؤ آباد ہوا اور دہلی کے مہاجر شعرائے لکھنؤ میں شاعری کی بساط بچھائی اور وہاں شعر و شاعری کے چرچے عام ہوئے تو یہ زمانہ ناسخ کا زمانہ تھا۔ ناسخ کو اساتذۂ لکھنؤ میں بڑا مرتبہ دیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے ہی سب سے پہلے دلی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو مستقل حیثیت سے علیحدہ کیا اور لکھنؤ کی زبان و شاعری کو قواعد و ضوابط کی سند دی ۳۱ ناسخ کے سنِ ولادت کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ وفات کے متعلق البتہ اتفاق ہے کہ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں ہوئی۔ اس زمانے تک اردو زبان کے صرفی و نحوی قواعد بڑی حد تک متعین و منضبط ہو چکے تھے۔

اردو ادب میں اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ناسخ کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے حالانکہ شاہ حاتم، سراج الدین علی خان آرزو اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے بھی اس طرف توجہ کی تھی۔ لیکن ان کی اصلاح کا دائرہ غالباً اتنا وسیع نہیں تھا۔ ناسخ نے اصلاحِ زبان کے سلسلے میں جو کام کیا اس کا اندازہ اس فہرست سے ہو جاتا ہے جو صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرے "جلوۂ خضر" میں دی ہے۔ ابواللیث صدیقی صاحب نے اسے اپنی تصنیف "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں نقل کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ نے زبانِ اردو میں جو اصلاح کی اس کا تعلق صرف و نحو کے بنیادی قواعد سے نہیں بلکہ الفاظ کے ترک و اختیار اور ترتیبِ الفاظ سے زیادہ تھا ۳۲

---

۳۱ ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۰۹۔ حمایت الاسلام پریس، کراچی، لاہور۔ سنہ ۱۹۶۷ء

۳۲ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ۱۔ شوکت سبزواری۔ داستان زبان اردو۔ ۲۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ جامع القواعد (حصۂ صرف)۔ ۳۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ۴۔ شاہ حاتم۔ دیوان زادہ (مقدمہ)

ماخذ

اردو ماضی معطوفہ کے بارے میں شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ یہ اول اول سنسکرت کے نہج پر فعل کے آخر میں "ی"

لگا کر بنائی گئی۔ چنانچہ برج اور قدیم ہندی میں ماضی معطوفہ کی جو مثالیں ملتی ہیں ان کے آخر میں इ یا زیر (ـِـ)

ہے جو ظاہر ہے کہ سنسکرت इत کا بقیہ ہے۔ جیسے گول را آجتی (گوڑ کے راجا کو جیت کر) سنی کگ گرِ (کاغذ یعنی خط

سن کر)۔ یہ کسرہ کثرتِ استعمال سے اردو میں مٹ مٹا گیا اور خالص مادہ مدتوں بطور ماضی معطوفہ استعمال ہوتا رہا۔

جب مادے اور ماضی معطوفہ میں کوئی فرق نہ رہا اور ایک کا دوسرے سے اشتباہ ہونے لگا تو تمیز و تفریق کے خیال سے غالباً

بہت بعد میں "کر" جو خود ماضی معطوفہ ہے مادہ پر اضافہ کر دیا گیا۔ پڑھ کرِ۔ اٹھ کرِ وغیرہ۔ "کرِ" کا کسرہ

بھی زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکا۔ آخر اس نے بھی مٹنا کی راہ لی اور "کر" کی ترکیب سے ماضی معطوفہ بنائی جانے لگی۔

کچھ عرصے بعد توضیح و تعیین کے لیے پھر ایک لاحقے کی ضرورت پڑی۔ اس مرتبہ "کے" اضافہ ہوا۔ چل کر کے۔

پی کر کے۔ "کر" اور "کے" اردو میں ساتھ ساتھ آئے۔ چنانچہ الگ الگ ان میں سے ہر ایک آج فعل کے ساتھ

مستعمل ہے۔ یہ پہلے بھی اسی طرح استعمال ہوتے تھے اور کبھی مزید وضاحت کے لیے دونوں کو جمع کر دیا جاتا تھا[۳۳]

"کے" کو پلیٹس نے پراکرت इक्क سے ماخوذ بتایا ہے۔ ان کے نزدیک इक्क اول "ج" یا "جے" بنا، بعد میں

"ک" سے بدل گیا[۳۴]

۳۳؎ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۰۶ مطبوعہ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ طبع اول جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

۳۴؎ ایضاً ص ۳۰۷ بحوالہ پلیٹس۔ ہندوستانی گرامر ص ۱۳۵۔

بیمز اسے "کر" کا ایک روپ بتاتے ہیں جس کے درمیانی حلقے یہ ہیں :- کرِ - کٙ - کے [۳۵]

شوکت سبزواری [۳۶] کے - کِئِ - کِیٙ - تھا - किअ "شورسینی میں "کے" کہتا ہے کہ "بھنڈارکر کا

بھنڈارکر کی اس رائے کو زیادہ صحیح اور صائب قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک صورت اور بھی ہے وہ

یہ کہ "کے" کو "کیے" سے منتشر مانا جائے جو "کیا" کی ظرفی حالت ہے ۔ جیسے "مے پئے" - رقیب کو لیے" میں پئے اور

لئے - ہمزہ کی تخفیف "کیے" اور "لیے" میں ہی ہوئی یہ "کیے" اور "لیے" تھا۔ "کھا کے چلا گیا" کھانا کیے پر چلا گیا یعنی

کھانا کھائے جانے پر یا کھا کر چلا گیا [۳۷]

"کے" سے متعلق چیٹرجی کا خیال ہے کہ وہ دراصل لاحقۂ مفعول ثانی ہے جو ماضی کی تاکید و توثیق کے لیے

بڑھایا گیا [۳۸]

ولنر کا کہنا ہے کہ "کے" "کرتے" سے وضع کیا گیا تھا۔ "کرتے" پراکرت میں اول किअ ए ہوا اور بعد میں

"کے" یہ کلمہ پراکرت میں "لیے" یا "واسطے" کے معنی میں مستعمل تھا۔ تھا کئے (تیرے لیے) کر پور منجری" ایکٹ ۲

شلوک ۱۰ میں ہے [۳۹]

---

[۳۵] شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا ص ۳۰۷ بحوالہ بیمز - گرامر جلد ۳ - ص ۲۳۱

[۳۶] ایضاً ص ۳۰۷ [۳۷] ~~بحوالہ ... ۲۲۵~~ ایضاً ص ۳۰۷

[۳۸] شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا ص ۳۰۷ . بحوالہ چیٹرجی - بنگالی ص ۱۰۰۷

[۳۹] ایضاً ص ۲۱۷ بحوالہ ولنر - مبادی پراکرت ص ۱۲۵ ۔

بیمز کا کہنا ہے کہ سنسکرت कृत کی اصل حالت कृतेन اور ظرفی कृते ہے۔ یہ کلمہ صرف ان دو حالتوں
میں مفعولی معنے دیتا ہے۔ سنسکرت میں "کرتے" कृते 'لئے'، اور 'واسطے' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعد
"کے" اور "لئے" دونوں قریب قریب ہم معنی ہیں لیکن اردو میں دونوں ساتھ ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ اس
کی وجہ غالباً وہ اشتباہ ہے جو ہماری زبان کے آخری دورِ ارتقا میں مفعولی اور اضافی 'کے' میں ہوا اور اس
پر اضافی معنے غالب آگئے۔ ادھر 'لئے' آزادانہ اسم کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ
مستقل کلمہ ہے لہٰذا ضرورت پڑی کہ کسی حرف کی مدد سے اسے سابق کلمے سے جوڑا جائے۔ یہ کام 'کے' نے انجام
دیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مفعول ثانوی حالت کا وجود مفعولی حالت سے پہلے ہے۔ ان دونوں حالتوں کا فرق
دراصل دو طرح کے افعال کی وجہ سے ہے۔ مفعول ثانی اول اول وہ ہوتا تھا جسے کوئی چیز دی جاتی تھی اس لیے اس
کے بعد 'رات'، یا 'راتے'، (دیا ہوا) آتا تھا۔ حامد راتے (حامد دیا ہوا) یہ دونوں 'دا' بمعنی 'دینا' سے ماخوذ ہیں
اس لیے کہ اس مفعول کا تعلق عطا سے ہوتا ہے اور یہ فعل 'دا' اور اس کے ہم معنی دوسرے افعال کا ہوتا ہے۔
مفعولِ اول باقی دوسرے افعال کا ہوتا تھا جن میں 'کرنا' زیادہ عام اور نمائندہ فعل تھا۔ اس لیے مفعول اول کے
بعد "کرت" (کیا ہوا) یا "کرتم" اضافہ کر دیتے تھے۔ حامد کرت (حامد کیا ہوا) یعنی وہ مفعول (کیا ہوا) جس پر
فعل کرنا کا وقوع ہوا۔ کو، کوں، ک وغیرہ تمام علامات 'کرت' سے بنی ہیں اور اس اسم کو بتاتی ہیں جس

۲۰؎ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۱۴-۲۱۵۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

'کرنا' یا اس قسم کے کسی فعل کا اثر ہوا[1]

اسی پر اگر "کرکے" کو قیاس کیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ "کر" اگر فعل "کرنا" پر دلالت کرتا ہے تو "کے" "کرتے" کا مخفف ہے اور فعل کے ہو چکنے پر دال ہے۔ عطفی 'کر' اور 'کے' کی تعریف بھی یہی کی جاتی ہے کہ یہ دو جملوں میں عطف کے لیے آتا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کام کو ختم کرکے، دوسرے پر عمل کیا گیا۔

پہلے جو مثالیں نمونے کے طور پر درج کی جا چکی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ عطفی "کر" کا کچھ تعلق مفعول و نسبت (اضافت) سے بھی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے 'کر' اور 'کے' کی جگہ 'کو' بھی دیکھنے میں آیا۔ اس سلسلے میں اوپر درج شدہ یہ رائے بھی مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ مفعول اول باقی دوسرے افعال کا ہوتا تھا جن میں "کرنا" زیادہ عام) اور نمائندہ فعل تھا اس لیے مفعول اول کے بعد "کرت" (کیا ہوا) اضافہ کر دیتے تھے۔ حامد کرت (حامد کیا ہوا) یعنی وہ مفعول جس پر فعل 'کرنا' کا وقوع ہوا۔ کو، کوں، کی وغیرہ علامات "کرت" سے بنی ہیں اور اس اسم پر دلالت کرتی ہیں جس پر 'کرنا' یا اس قسم کے کسی فعل کا اثر ہوا۔

اگر بالفرض "کرت" میں 'ت' مکسور تھا تو قیاس کہتا ہے کہ یہ 'کرت' پہلے اول "کر" پھر "کے" اور بالآخر "کے" میں ڈھل گیا ہو۔ "کرت" کے معنے ہیں وہ کام جو کیا جا چکا ہو یعنی ختم ہو چکا ہو۔ عطفی 'کر' کی تعریف بھی یہی ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فاعل نے ایک کام ختم کرکے دوسرے پر عمل کیا۔ "تلسی کرت کاویہ" کا مطلب

---

[1] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۲۸۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

ہے تلسی کی، کی ہوئی شاعری۔ گویا "کرت" میں کسی عمل کے اختتام پذیر ہو چکنے کا اشارہ ملتا ہے۔ "کر" عطفی کی بھی یہی صورت ہے۔ ہو سکتا ہے "کرت" کی 'ت'، گر گئی ہو جیسا کہ زبان کے ارتقائی مدارج میں دوسرے الفاظ کے ساتھ بھی اکثر ہوا ہے کہ آخری حرف گر گیا البتہ اس کی حرکت باقی رہی۔ 'ت' کا کسرہ 'کر' کے 'ر' پر آ گیا اور اس طرح "کر" بنا ہو۔ کثرت استعمال سے یہ زیر مدت مٹا گیا اور صرف 'کر' استعمال ہوتا رہا۔ یا اس نے "کے" اور بعد "کے" کی شکل اختیار کر لی ہو۔ بیمز کا نظریہ قریب قریب یہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ "کر" کو اولیں روپ مان کر اس کے درمیانی حلقے یہ بتاتے ہیں: کرِ، کے، کے۔

"کرت" میں 'ت' کے مکسور ہونے کا خیال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بیمز کا کہنا ہے کہ سنسکرت "کرت" कृत کی آلی حالت कृतेन اور ظرفی कृते۔ آلی اور ظرفی دونوں حالتوں میں 'ت' کے ساتھ یائے مجہول نہیں بلکہ ماترہ کی موجودگی زیر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

ولنسر کا کہنا ہے کہ "کے" "کرتے" سے وضع کیا گیا ہے۔ غالباً یہ "تے" بھی یائے مجہول کے ساتھ نہیں بلکہ مکسور ہوگی۔ ان کا کہنا ہے کہ "کرتے" پراکرت میں اول اول कअए ہوا اور بعد میں "کے"۔ البتہ ان کا کہنا ہے کہ سنسکرت میں "کرتے" कृते 'لئے' اور 'واسطے' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جب کہ شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ 'کے' اور 'لیے' دونوں ایک ہی ڈھنگ سے بنے ہیں اور قریب قریب ہم معنی ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور 'لیے' کو سابق کلمے سے جوڑے جانے کے لیے 'کے' نے حرف رابطہ کا کام دیا۔ غالباً یہی صورت عطفی 'کر' کے ساتھ 'کے' جوڑے جانے کے سلسلے میں پیش آئی ہو۔ بعد میں جب مادۂ فعل کے

اور عطفی 'کر' میں اشتباہ ہونے لگا اور تکرار ناگوار معلوم ہوئی تو عطفی 'کر' گرا دیا گیا صرف 'کے' کو برقرار رکھا گیا ہو
اور اس سے عطفی معنی مراد لیے جانے لگے ۔ یہاں شوکت صاحب کی رائے کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
"'کر' کے کسرہ نے فنا کی راہ لی اور حرف 'کر' (بلا کسرہ) کی ترکیب سے ماضی معطوفہ بنائی جانے لگی ۔ کچھ عرصہ بعد
توضیح و تعیین کے لیے پھر ایک لاحقے کی ضرورت پڑی ۔ اس مرتبہ 'کے' اضافہ ہوا ۔ چل کر کے ۔ پی کر کے ۔ 'کر' اور 'کے'
اردو میں ساتھ ساتھ آئے چنانچہ الگ الگ ان میں سے ہر ایک آج فعل کے ساتھ مستعمل ہے ۔ یہ پہلے بھی اسی طرح استعمال
ہوتے تھے اور کبھی مزید وضاحت کے لیے دونوں کو جمع کر دیا جاتا تھا"

اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ جلوۂ خضر کی یہ رائے درست نہیں کہ ناسخ نے امر پر "کر" بڑھا کر
ماضی معطوفہ بنائی ۔ ادب کے قدیم نمونوں سے اور ماخذ کی بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ماضی معطوفہ
اس وقت سے جب سے ادب کے قدیم نمونے دستیاب ہوتے ہیں، ہمیشہ اسی طرح بنائی جاتی رہی ہے اس میں تغیر دیکھنے
میں نہیں آتا ۔ یہ ایک معینہ قاعدہ ہے جو ناسخ سے بہت پہلے سے موجود و مستعمل رہا ہے ۔

فعلِ امر

امر کے معنے حکم کے ہیں اور حکم چوں کہ مخاطب کو دیا جاتا ہے لہٰذا اس کے دو صیغے ہوتے ہیں یعنی واحد حاضر اور جمع حاضر۔ امر میں حکم کے علاوہ التجا، درخواست اور دعا کو بھی شامل کر لیتے ہیں اس کے لیے بقیہ صیغے (غائب اور متکلم) فعلِ مضارع کے ذریعے بنا لیے جاتے ہیں یا ان صیغوں میں فعلِ حال استعمال کیا جاتا ہے ۔[1]

مصدر سے علامتِ مصدر گرا کر امر واحد حاضر حاصل ہوتا ہے مثلاً کرنا سے کر، جمع حاضر کرو۔ تعظیماً "کریئے" اور "کیجیے" بھی استعمال ہوتا ہے۔ "کیجیے" فصیح ہے۔ "کیجیو" بھی استعمال ہوتا رہا ہے یہی صورت دوسرے افعال میں تھی مثلاً رہیو، کہیو، کریو، بھیجیو وغیرہ۔ لیکن اب یہ متروک ہے۔ شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ یہ صورت دعا کے لیے مستعمل تھی۔ ادبِ اردو سے ان استعمالات و تغیرات کی مثالیں درجِ ذیل ہیں:

"کدم راؤ پدم راؤ" دستیاب منظوم تصانیف میں مقدم ہے (تصنیف ۸۲۵ و ۸۳۹ھ)۔ اس میں فعل امر کا استعمال درجِ ذیل دو طریقوں پر ملتا ہے:۔

۱۔ جو میں تج (تجھ) کیا توں تنھن دور کر

۲۔ نہ پتیا ؤ بھیجو کسر ب مت سر [2]

---

[1] غالباً اسی لیے مولوی عبدالحق نے اسے فعلِ حال میں شمار کیا ہے۔ قواعدِ اردو ص ۱۱۱۔ جی این پریس لاہور۔

[2] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ بیت ۲۲۵ ص ۷۷۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء

شاہ میرانجی شمس العشاق (سنہ ۹۰۲ھ) کے بزرگ ہیں۔ ان سے کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:۔

؎ وہ مغز سنے لیو ۔ سب چھال چھوڑ دیو

؎ جے غواص بودہ سیوے ۔ تو سالم سودھا لیوے

؎ ذاکر سو من دم چلاویں یہ بھی دھیان الب

؎ گھر بھاگا چھوڑ دیجے ۔ چن مانک موتی لیجے

انہی کا مشہور رسالہ "مرغوب القلوب" نثر میں ہے اس کا ایک جملہ ہے:۔

الوں تھے (سے) لوح، الوں تھی (سے) توں رشن، ہور جب نکو اچھہ (اچھا) ۳

مندرجہ بالا اشعار میں سے پہلے شعر میں لیو اور دیو استعمال ہوا ہے، اب اس کے بجائے "لو" اور "دو" مستعمل ہے۔ دوسرے شعر میں سیوے اور لیوے استعمال ہوا ہے۔ استعمال ہند میں یہ استعمال مضارع کے طور پر عام تھا۔ یہی صورت تیسرے مصرع میں ہے چلاویں (واحد، چلاوے)۔ چوتھے شعر میں دیجے اور لیجے آج ہی کی طرح استعمال ہوا ہے۔ گویا یہ استعمال (نسخ قدیم) سے موجود رہا ہے۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م ۹۷۳ ہجری) کے بزرگ ہیں۔ ان کا تعلق گجرات سے ہے۔ ایک شعر دیکھیے:۔

؎ پیو ملا گل لاگ رہی جب ۔ سکھ منہ (میں) دکھ کی بات نہ کیجے ۴

۳۔ شاہ میرانجی شمس العشاق بیجاپوری۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (مولوی عبدالحق) صفحہ ۵۱ - ۵۰ - ۹ - ۴۸

۴۔ مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۵۳ء

شاہ برہان الدین جانم (م ۹۹۰ھ) کے رسالے "کلمۃ الحقایق" کا ایک جملہ ہے :۔

جیتا بکار روپ، وہی دوسرا تن، تو توں نظر کر دیکھ ۵؎

وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) کا ایک مصرع ہے: توں دو کام کر جو تجے کام آئے ۶؎

قلی قطب شاہ کے یہاں بھی یہی صورت ہے مثلاً ان کا یہ مصرع: راکھو تمہارے چھاؤں تل دایم خوشیاں سوں قطب کوں ۷؎

راکھو بجائے رکھو۔ یہ دکنی کی ایک خصوصیت ہے کہ بعض موقعوں پر اشباع کے باعث زبر، الف ہو جاتا ہے۔

رستمی کے "خاورنامہ" (ترجمہ ۱۰۵۹ھ) کا ایک مصرع دیکھیے اس میں "رکھ"، "اج" ہی کی طرح استعمال ہوا ہے :۔

جو لوگاں تھے اس رکھ توں پہناں نگاہ ۸؎

دکنی میں صیغۂ جمع حاضر میں بعض اوقات مادے پر "دو واؤ" کا اضافہ بھی ملتا ہے مثال کے طور پر قلی قطب شاہ کے درج ذیل مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ چڑاوو تیل اب ساتوں سہاگاں

۵؎ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۶۶۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۶۷ء

۶؎ ملا وجہی۔ مثنوی قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) ص ۶۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ ۱۹۵۳ء

۷؎ قلی قطب شاہ۔ کلیات قلی قطب شاہ۔ ص ۳۷۵۔ اعظم اسٹیم پریس۔ دکن۔ ۱۹۴۰ء

۸؎ کمال خان رستمی بیجاپوری۔ خاورنامہ (۱۰۵۹ھ) ص ۲۴۔ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۸ء

۲- بنداو وسا ریاں موتی کنارے

۳- پلا شربت دیو و ہاتھوں میں بیڑے ۹ ؎

معراج العاشقین (جو دراصل بارھویں صدی کے ایک بزرگ کی تصنیف ہے) میں دو واؤ کے بجائے مادۂ فعل پر صرف ایک واؤ کا اضافہ ملتا ہے مثال کے طور پر یہ جملہ :-

مسلمانوں کوں خبر دیو ہور ملکوت کوں تنزکیۂ نفس کے دل کی خبر دیو

دوسرا جملہ دیکھیے :- تمہارا اللہ کا ملنا ہوئے پر یک سجدہ کرو ۱۰ ؎

امر تعظیمی کیجیے، دیجیے وغیرہ کا استعمال ان کے یہاں نہیں چلا۔

قاضی محمود بحری، ولی کے معاصر ہیں ان کا ایک مصرع ہے :-

لیروں ستی سوہ نہ کیجے جل پر راکھیے ہوش ۱۱ ؎

"کیجے" بالکل آج کی طرح ہے، رکھیے میں "ر" کے زبر کا اشباع ہو گیا ہے۔

دکنی میں دعائیہ امر کیجیو، بھیجیو، دیکھیو وغیرہ کا استعمال نہیں ملا۔ امر تعظیمی کا استعمال بھی کم ملتا ہے۔

---

۹ ؎ کلیاتِ قلی قطب شاہ۔ ص ۲۲۵۔ اعظم اسٹیم پریس۔ دکن۔ سنہ ۱۹۴۰ء

۱۰ ؎ معراج العاشقین ص ۲۵ تا ۲۴ منسوب بہ گیسو دراز۔ دکن دارالاشاعت کراچی۔ سنہ ۱۹۶۱ء

۱۱ ؎ قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری ص ۲۲۹۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء۔

البتہ شمالی ہند میں یہ صورتیں عام مستعمل رہی ہیں۔ اسمٰعیل امروہوی شمالی ہند کے ایک قدیم شاعر ہیں۔ ان کی دو مثنویاں دستیاب ہیں پہلی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہ" ۱۱۵ ہجری کی تصنیف ہے اور دوسری مثنوی "معجزۂ انار" ۱۱۲۰ ہجری کی تصنیف ہے۔ ان کی زبان پر بہت کچھ دکنی کا اثر ہے، یہ اثر فعلِ امر کے استعمال میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کی مثنویوں میں امر کے استعمال کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:۔

؎ قریشاں کی عورتاں کوں کہہ بھیجیا + تمن گھر منے آیو میرے ہوا

؎ کچھو پیاری بھی چیز مجھ کوں دیو + اجر اس کا بھی حق کنے سیں لیو

ع بولے وے خدیجہ نہ ڈریو تمن

ع رفاقت خدیجہ کرو جا ابھی۔

ع رکھو فاطمہ نام تم زود تر۔ [۱۲]

آیو (یعنی آؤ)، دیو، لیو، ڈریو بجائے دو، لو اور ڈرو۔ دکنی کی طرح استعمال ہوئے ہیں۔ "کرو" اور "رکھو" یہ استعمال بالکل ایسا ہی ہے جیسے اب واحد وجمع امر حاضر میں استعمال ہوتا ہے۔

فائز کا ایک مصرع ہے:۔ دوری نہ کر کنار سوں میری تو اے ہما ۔۔ انہی کا ایک اور مصرع دیکھیے:۔

دوری نہ کرو ہم سے اس حد [۱۳]

---

[۱۲] اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۲۷ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ اشاعت اول دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء

[۱۳] دیوانِ فائز ص ۱۸۸-۱۸۷ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ مطبوعہ عمدہ پریس دہلی ۱۹۴۶ء

تاباں کے چند مصرعے درج ذیل ہیں :۔

۱۔ ساقی ہے ابر مجھ کو محروم رکھ نہ مے سے

۲۔ نہ گھر بھاتا ہے نے صحرا کہاں کیجے مکاں اپنا

۳۔ تو ہرگز چھوڑ کو مت شعر کہنا

۴۔ دستگیری کیجیو اس وقت میں یا بوتراب ۔[۱۴]

"کربل کتھا" کے چند جملے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ بس دوست رکھو ہم کو، تا ہم ساتھ محشور ہو۔

۲۔ محشور مجھے شہدائے کربلا سے کیجیو ۔ مجھ عاصی کوں بخشیو۔

۳۔ تب آپ زبان اعجاز سے فرمائے، اب تو توں جا، پھر آئیو ۔ [۱۵]

شاہ ظہورالدین حاتم کے یہاں بھی یہی صورت ہے۔ ان کے دو مصرعے یہاں درج کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ نہ کر روشن دلوں کی بزم میں تو شمع کوں روشن

۲۔ تو آنے سے انہوں کے باغباں ڈر لیو کہ یہ لڑکے [۱۶]

---

[۱۴] دیوانِ تاباں ص ۱۳۴، ۱۴۶، ۲۰۲، ۲۰۳ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن ۱۹۳۵ء

[۱۵] کربل کتھا ص ۴۰، ۴۴، ۵۵ ۔ تالیف فضل علی فضلی۔ مرتبہ مالک رام و مختارالدین ۔ دیال پرنٹنگ پریس۔ دہلی اشاعتِ اول ۱۹۶۵ء

[۱۶] شاہ حاتم حالات و کلام ص ۴۷، ۱۲۲ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار - جدید اردو ٹائپ پریس لاہور ۱۹۶۴ء

میر کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد

۲۔ بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو

۳۔ سن لیجیو کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا

۴۔ کیا کہیے کہ دل بھی مجبور رہے ہمارا [۱۷]

درد کے یہاں بھی یہی صورت ہے۔ مثال کے طور پر چند مصرعے یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ بھول جا، خوش رہ، محبت و سے سابقے مت یاد کر۔

۲۔ گلستانِ جہاں کی دید کیجو چشمِ عبرت سے۔

۳۔ دل اس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم راستی

۴۔ رشکِ گلزارِ ارم کہیے گا۔ [۱۸]

سودا کے کلام میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں مثلاً حسبِ ذیل مصرعے:۔

۱۔ ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ۔

---

[۱۷] کلیاتِ میر (بترتیبِ جدید مع مقدمہ و فرہنگ) صفحہ ۲۸، ۳۰، ۲۸، صفحہ ۲۲، باہتمام گیری داس۔ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۱ء

[۱۸] دیوانِ درد۔ صفحہ ۶۴، ۶۶، صفحہ ۶۰۔ مرتبہ ظہیر احمد صدیقی۔ مطبوعہ ناجی پریس الٰہ آباد۔ جولائی ۱۹۶۵ء

۲۔ سودا کبھی نہ مانیو واعظ کی گفتگو

۳۔ یارب نہ کیجیو تو کسی کو وطن سے دور

۴۔ شمع ساں روئیے کیونکر نہ، کہ جہاں بیٹھے ہیں [۱۹]

میر امن کی "باغ و بہار" (تصنیف ۱۲۱۷ھ) میں بھی یہ استعمال اسی طور پر ملتا ہے۔ چند جملے یہاں نقل ہیں:۔

۱۔ مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطر داری کر۔

۲۔ قبلۂ عالم اس تصور باطل کو دل سے دور کرو۔

۳۔ ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کیجیو اور کسی بات کے معترض نہ ہوجیو۔

۴۔ غریب نوازی کرکے، اس عاجز کو قبول کیجیے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجیے [۲۰]

انشاء اللہ خاں انشا (م ۱۲۳۳ھ) کے چند مصرعے دیکھیے:۔

۱۔ مرضی میں تیری کیا ہے اے وحشت اب تو سچ کہہ۔

۲۔ اے بادِ سحر محفل احباب میں کہیو۔

۳۔ خیال کیجیے کیا آج کام میں نے کیا۔ [۲۱]

---

[۱۹] کلیاتِ سودا ص ۲۶۵-۱۸۱-ص ۲۵۰-۳۷، مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ مطبوعہ زرین آرٹ پریس لاہور

[۲۰] باغ و بہار۔ ص ۱۱-ص ۳۲۔ حمایت الاسلام پریس لاہور ۱۹۶۸ء

[۲۱] کلیاتِ انشا ص ۲۷-۳۷-ص ۲۵۷، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی۔ مطبوعہ ایڈ پرنٹنگ پریس لاہور۔

شیخ صالح محمد عثمانی کے ترجمے "جامع الحکایاتِ ہندی" کے چند جملے حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ سوائے اس کے کچھ مانگے تو ہرگز مت دیجیو۔

۲۔ اگر یوں ہی ہے تو لاچار ہوں، تیری خوشی ہو سو کیجیو۔

۳۔ یہ سب دوستی اور الفت دکھلاوے کی کیجیو۔ [۲۲]

انشاؔ کی "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" میں صرف تعظیمی صیغے دیکھنے میں آتا ہے مثلاً یہ جملہ :۔

اب آپ کان رکھ کے، آنکھیں ملا کے، سنمکھ ہو کے، ٹک ادھر دیکھیے [۲۳]

شاہ تمیز کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ کیجیو اس کو رفو سوزنِ مژگاں ایسا

۲۔ دل شامت زدہ ٹک بچ کے رستہ مانگ کا لیجو

۳۔ سرگزشت اپنی کا کیا خاک بیاں کیجیے گا

۴۔ قاصد یہ اسے کہیو زبانی کہ نہیں چین [۲۴]

---

[۲۲] جامع الحکایاتِ ہندی ص ۲۴، ص ۲۶-۳۲، ۴۱-۴۷، مترجمہ شیخ صالح محمد عثمانی (۱۲۳۰ھ) مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر۔ زرین آرٹ پریس لاہور ۱۹۷۵

[۲۳] انشاؔ۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" ص ۲۴ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو پریس کراچی تیسری اشاعت

[۲۴] کلیاتِ شاہ تمیز (جلد اول) ص ۲۱، ص ۱۲۳-۱۹۸-۱۵۱، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ مطبوعہ زرین آرٹ پریس لاہور طبع اول ۱۹۷۱

ماخذ

مندرجہ بالا امثال سے تین صورتیں امر کی، سامنے آتی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:۔

	واحد۔	جمع
۱۔ امر (حکمیہ)	کر	کرو
۲۔ دعا والتجا	کیجیو	کیجیو
۳۔ امر احترامی (تعظیمی)	کیجیے	کیجیے

یہ حاضر کے صیغے ہیں۔ غائب کے صیغے امر، دعا، شرط سب کے لیے ایک سے ہیں۔ وہ کرے، وہ کریں۔ لڑکے سے کہو کہ سبق یاد کرے، لڑکوں سے کہو کہ سبق یاد کریں (امر) خدا اس کی عمر دراز کرے (دعا)، اگر وہ سبق یاد کرے، اگر وہ سبق یاد کریں (شرط).

شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ "ج" کا اضافہ ان افعال کے ساتھ مخصوص ہے جن کے آخر میں 'ی' (معروف و مجہول) یا 'واؤ' ہے۔ جیسے 'دے'، سے دیجیے۔ پی سے پیجیے۔ لے سے لیجیو اور 'ہو' سے ہوجیو۔ لیکن یہ کلیہ نہیں۔ 'سی' سے 'سیو' اور 'چھو' سے 'چھوؤ' سو سے سوؤ بنتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ کسی وقت میں امر اور دعا والتجا کے صیغوں میں فرق کیا جاتا تھا بعد میں یہ فرق اردو کے تسہیلی رجحان کے تحت ختم ہو گیا اور صرف امر واحد و جمع اپنے تعظیمی صیغے سمیت، امر کی تمام حالتوں یا صورتوں، مثلاً دعا، درخواست، التجا و احترام سب کے لیے استعمال ہونے لگا چنانچہ اب صرف کر، کرو، کرے، کریں۔ کیجیے وغیرہ ہی عام مستعمل ہیں۔ کیجیو، آئیو، مانیو، بھیجیو وغیرہ کی جگہ امر تعظیمی استعمال کیا جاتا ہے۔

ان کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ امر کے دونوں صیغے (واحد و جمع) سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ واحد حاضر "کر" سنسکرت صیغۂ امر حاضر کے مطابق ہے۔ البتہ جمع حاضر "کرو" سنسکرت کے صیغۂ جمع حاضر سے ذرا مختلف ہے[۲۵]

بھنڈارکر کے نزدیک یہ صیغہ اپ بھرنش करहु (کرہُ) سے لیا گیا ہے۔ کرہُ - کرءُ - کرو۔ شوکت صاحب کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ واحد کا صیغہ اپ بھرنش میں "کر" نہیں "کری" ہے۔ یہ بعید از قیاس ہے کہ "کر" تو سنسکرت اور پراکرت روپوں کے مطابق ہو اور "کرو" اپ بھرنش "کرھو" سے ڈھالا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو "کرو" اصل میں "کرۃ" تھا جو پالی "کرتھ" سے جو پراکرتی کرۃ کے ڈھنگ پر بنایا گیا تھا۔ "و" سنسکرت گچھتُ اور گچھنتُ پر قیاس کر کے بعد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس قیاس کی مثالیں پراکرت میں بھی ہیں[۲۶]

بھنڈارکر کا دعوی ہے کہ اپ بھرنش اور قدیم ہندی دونوں میں اس کا روپ "کرھو" ہے، ثبوت کے طور پر انہوں نے تلسی داس کا مصرعہ "پاروتی پیتم جانی تم پریم پریکشا لیہو" نقل کیا ہے۔ چند کے یہاں بھی اس کا روپ یہی ہے جیسے "تم لیہو - تم لیہو" (تم پکڑو، تم پکڑو)[۲۷]

---

[۲۵] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا صفحہ ۲۱۳،۲۱۲، مطبوعہ دی کسٹی پریس ڈھاکہ۔ طبع اول جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

[۲۶] ایضاً ص ۲۱۳ بحوالہ ولنر ص ۳۷۔

[۲۷] ایضاً ص ۲۱۳ بحوالہ بیمز جلد ۳۔ ص ۱۰۹۔

قدیم ہندی میں امر حاضر کے آخر میں ے بھی تھی جیسے کرے - دَھرِ ۔ تلسی داس کا مصرعہ ہے :۔

دَھرِ بٹو روپ اودھ پُر جاۓ (لڑکے کا روپ بدل کر اودھ شہر میں جاؤ).

شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ یہ صیغہ فعلِ حال سے مستعار ہے۔ قدیم ہندی میں اکثر حال کے صیغے امر کے معنے میں استعمال ہوتے تھے۔ واحد حاضر کو چھوڑ کر اردو میں بھی امر کے لیے حال ہی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ جاۓ کی اصل سنسکرت یاسِ ہے۔ یاسِ ۔ یاہِ ۔ جاہِ ۔ جاۓ [28]

کریئے اور کیجیے سنسکرت "کرِیات" سے لیے گئے ہیں۔ سنسکرت میں "یا" لاحقہ دعا ہے۔ یہ پالی میں ज्ज اور پراکرت میں ज्ज ہوا۔ "لیجیے" میں "ج" "ی" کا بدل ہے۔ "کریئے" میں "ی" اپنی حالت پر قائم ہے اور کیجیے میں "ج" سے بدل گئی ہے۔ کیجیے اصل میں "کیجے" تھا [29]

ڈاکٹر چیٹرجی کے نزدیک کریئے اور کیجیے، سنسکرت فعلِ دعائی پر خبری ति - اِی - ی - لگا کر بنائے گئے ہیں چیٹرجی، کریو اور دیکھیو کو بھی سنسکرت "کرِیات" اور "ددیات" ہی سے مشتق بتاتے ہیں - کریئے اور دیجیے پر خبری علامت "تی" اضافہ کی گئی تھی اور "کریو" اور "دیکھیو" پر امری علامت "تو" بڑھائی گئی - دیکھیو = درِج (ددیات) + ؤ (ت) [30]

---

[28] اردو زبان کا ارتقا ص ۳۱۶

[29] ایضاً ص ۳۱۶

[30] ایضاً بحوالہ چیٹرجی ص ۹۰۰

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ کریلو، کیجیو، کریئے، کیجیئے، یہ سب صیغے غائب کے ہیں اور سنسکرت غائب کے صیغوں سے ڈھالے گئے ہیں دوسرے یہ کہ کریو، کیجیو اصلاً مفرد ہیں۔ جس طرح یہ غائب کے صیغے ہوتے ہوئے بھی اردو میں حاضر کے لیے استعمال ہوتے ہیں اسی طرح اصلاً مفرد ہوتے ہوئے بھی جمع کے لیے ان کا استعمال کیا جاتا رہا ہے[۳۱] پلیٹس نے "کریئو" کو "کرے" کی جمع بتایا ہے اور اسٹیفر نگٹن کے اس خیال کا رد کیا ہے کہ کرلیو اور کیجیو، کرے اور کیجئے کی طرح مفرد ہیں[۳۲] سب سے بڑا ثبوت اس امر کا کہ یہ صیغے مفرد ہیں "ھو جیو" کا استعمال ہے۔ خدا کی لعنت منکروں پر ہو جیو۔ پراکرت پنگل میں دِجّو (دیجیو)، "سو تھا سنکر د جو موکھا (وہ شنکر تمہیں نجات دے) مفرد بھی ہے اور غائب بھی[۳۳]

بعض ادیب کہتے ہیں کہ امر احترامی سنسکرت امر مجہول سے لیا گیا ہے۔ امر مجہول غائب کا استعمال سنسکرت میں غائب کے مواقع پر ہوتا تھا۔ امر حاضر معروف میں براہِ راست تخاطبہ مخاطب کے درجے اور مقام عالی کے منافی ہے۔ غائب مجہول میں براہِ راست تخاطب نہیں ہوتا اس لیے یہ پیرایۂ بیان رفیع المرتبت اصحاب کے شایانِ شان سمجھا جاتا ہے۔ امر مجہول سنسکرت میں "ی" کی مدد سے بنتا تھا۔ اردو میں بھی "ی" ہی سے کام لیا جاتا ہے جو پراکرت کے عام اصول کے مطابق کبھی इय اور کبھی इज्ज سے بدل جاتی ہے[۳۴] لاحقہ بدستور امر معروف کا "ئ"، یا "آئیے" یڈکا

---

[۳۱] اردو زبان کا ارتقا ص ۳۱۶

[۳۲] ایضاً ص ۳۱۷ بحوالہ اردو گرامر حاشیہ ص ۱۳۶

[۳۳] اردو زبان کا ارتقا ص ۳۱۷ بحوالہ چیٹر جی ص ۹۰

[۳۴] ایضاً ص ۳۱۷ بحوالہ ولنر ص ۴۹ ۔

ہے' ہوتا ہے جیسے :- दीयते - दीइयते - दीजते - दीजिए اور دیجئے - یا -

दीयतु - दीजितु - दीजिउ دیجیو یا دیجو ۳۵

یہ اشتقاق زیادہ واضح ہے اور ساتھ ہی اس سے اردو میں ان صیغوں کے مختلف استعمالات بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً مجہول کی نسبت فاعل کی طرف نہیں ہوتی اس لیے فاعل کے اعتبار سے اس کی وحدت و جمعیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حاضر میں خاص طور سے استعمال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ صیغے امر کے ہیں اور امر میں عام طور سے خطاب ہوتا ہے ۳۶

---

۳۵ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۱۷ بحوالہ ٹیکچرز ص ۲۱۶

۳۶ ایضاً ص ۲۱۸-۳۱۷ -

فعلِ مضارع

حال اور مستقبل

مضارع وہ فعل ہے جو حال اور مستقبل دونوں پر محیط ہوتا ہے یعنی اس میں بیک وقت دونوں زمانے پائے جاتے ہیں حال اور استقبال۔ اس کے مقابلے میں "حالِ مطلق" وہ فعل ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کام زمانۂ موجودہ میں ہوا لیکن اس میں وقت کا صحیح تعین نہیں ہوتا کہ کام ختم ہونے کتنی دیر ہوگی۔ جیسے آتا ہے، جاتا ہے، کھاتا ہے۔ یہ حالیہ ناتمام کے آگے ہے، ہیں، ہو وغیرہ لگا کر بنایا جاتا ہے۔ جب کہ مضارع بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ مادۂ فعل کے آگے "واؤ" اور یائے مجہول بڑھا کر بناتے ہیں۔ جیسے آوے۔ لکھاوے۔ لیوے۔ رہوے۔ کھاوے۔ کہوے وغیرہ۔ بعض اوقات یہ درمیانی واؤ حذف کرکے صرف رہے، کہے وغیرہ استعمال ہوا ہے۔ مضارع کو جب صرف حال سے مخصوص کرنا ہو تو اس پر "ہے" کی گردان لگا دیتے ہیں مثلاً آوے ہے۔ آویں ہیں۔ آؤ ہو۔ آؤں ہوں۔ آویں ہیں اور اگر مستقبل کی طرف اشارہ مقصود ہو تو مضارع پر علامتِ مستقبل "گا" کی گردان لگا دیتے ہیں۔ آوے گا۔ آویں گے۔ آوگے۔ آووں گا۔ آویں گے وغیرہ۔ زمانۂ قدیم ہی سے "مضارع" اور "حالِ مطلق" دو الگ الگ فعل ہیں البتہ قواعد نویسوں نے مضارع کو کہیں تو "فعلِ حال" کی ذیل میں لکھا ہے اور کہیں اسے "حالِ مطلق" میں مدغم کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حالِ مطلق سے الگ اپنی حیثیت رکھتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے مضارع کو "حالِ مطلق" کی قدیم اور اولین صورت قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"سب سے اول وہ سادہ اور قدیم حالِ مطلق ہے جس کی صورت سے اب تک اس کی اصل ظاہر ہے مگر موجودہ حالت میں وہ صاف صاف زمانۂ حال کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ زمانۂ حال کے ساتھ اس میں کسی قسم کے معانی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اردو قواعد نویسوں نے اسے "مضارع" کے نام سے ایک الگ فعل قرار دیا ہے اور ماضی، حال

اور مستقبل تینوں میں سے کسی ایک زمانے کے اندر ہو۔ بعض انگریز قواعد نویسوں نے اسے مستقبل کے تحت میں لکھا ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت یہ "حال" ہے اور اب بھی اس میں حال کے معنے پائے جاتے ہیں۔"

اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"مضارع کی جو موجودہ صورت ہے یہی قدیم حال مطلق تھا مثلاً جائے ہے کچھ عرصہ پہلے بطور "حال مطلق" کے استعمال ہوتا تھا۔۔۔۔ اسی سے موجودہ "حال مطلق" جاتا ہے، بنا ہے یعنی اس کے تغیرات کی صورت یہ ہوئی: جاوے۔ جاوے ہے۔ جائے ہے۔ جاوت ہے۔ جات ہے اور جاتا ہے 'جاتا ہے' موجودہ فصیح حال مطلق ہے۔ موجودہ 'حال مطلق' انہیں سے ترش تراش کر بنا ہے۔" ۱؎

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے نزدیک قدیم حال مطلق 'جاوے' ہے۔ اسی سے بعد میں تغیرات کے ساتھ اور صورتیں ظہور پذیر ہوئیں چنانچہ 'جاوے' سے 'جاوے ہے'، بنا پھر جائے ہے۔ اس کے بعد 'جاوت ہے' اور 'جات ہے' ہوا اس کے بعد موجودہ حال مطلق یعنی 'جاتا ہے' بنا۔ اس پر کسی رائے کے اظہار کے بجائے بہتر ہے کہ ادبِ اردو سے اس کے استعمال کی مثالیں پیش کر دی جائیں تا کہ صحیح صورتِ حال خود بخود واضح ہو جائے۔ لیکن اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں چند اور لسانیین کی آرا بھی یہاں نقل کر دی جائیں۔

صاحبِ جلوۂ خضر نے اپنے تذکرے میں ناسخ کی اصلاحات اور متروکات کی جو فہرست دی ہے اس سے ظاہر

۱؎ مولوی عبدالحق۔ قواعدِ اردو۔ ص ۱۱۰-۱۱۱۔ جی ایف پریس لاہور۔

ہوتا ہے کہ ناسخ سے قبل سودا، میر، انشا، مصحفی، میر حسن وغیرہ تک جو صورتیں مستعمل تھیں وہ مختصراً یہ تھیں:-

ہووے ہے۔ جاوے ہے۔ رہوے ہے۔ کرے ہے۔ دیوے۔ رہے ہے۔ کہیں ہیں۔ ہووے گا۔ لیویں گے۔ ہوگیا۔ دیویں۔ چھپے ہے۔

لوٹوں ہوں۔ اٹھے ہے۔ سہے ہے وغیرہ۔

فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناسخ نے ان مندرجہ بالا صورتوں کو متروک قرار دیا اور درج ذیل کو رواج دیا:-

ہوتا ہے۔ جاتا ہے۔ پھیلتا ہے۔ کرتا ہے۔ دیتا ہے۔ ہے برائے ہوگیا۔ رہتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ہوگا۔ لیں گے۔

دیں۔ چھپتا ہے۔ لوٹتا ہوں۔ اٹھتا ہے۔ سہتا ہے وغیرہ ؎۲ ان قدیم صورتوں کو ناسخ نے متروک قرار دے کر

سختی سے ان کی پابندی کی۔

اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے گویا ناسخ سے قبل حال مطلق کی موجودہ صورت یعنی آتا ہے۔ جاتا ہے وغیرہ

موجود نہیں تھی اور اس کی ابتدا گویا ناسخ ہی نے کی۔ اس کی صحیح کیفیت آئندہ ادب کی مثالوں سے واضح ہوگی۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مضارع اور حال مطلق کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ہمارے خیال میں حال مطلق سے مراد ایسا فعل ہے جس کا وقوع زمانۂ حال میں یعنی زمانۂ بالفعل

میں پایا جائے۔ مثلاً آتا ہے۔ پڑھتا ہے۔۔۔۔۔۔ اس صیغے میں بھی مختلف ادوار میں لسانی تغیر ہوا

؎۲ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ص۳۳۲-۳۳۶ بحوالہ صفیر بلگرامی۔ تذکرہ جلوۂ خضر

ہے۔ تدریجی منازل یہ ہیں :۔ قدیم دورِ متقدمین میں : آؤتا ہے ۔ جاؤتا ہے ۔ دورِ متوسطین میں : آوے ہے

جاوے ہے ۔ دورِ متاخرین میں : آئے ہے جائے ہے ۔ عصرِ حاضر میں : آتا ہے ۔ جاتا ہے [۳]

اس بیان سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ لسانی ارتقا کے تین ادوار سے گزر کر حالِ مطلق کی موجودہ

صورت متعین ہوئی ہے ۔ اسے مختصراً اس طرح بیان کر سکتے ہیں :۔

آؤتا ہے، جاؤتا ہے ۔ آوے ہے، جاوے ہے ۔ آئے ہے، جائے ہے ۔ آتا ہے، جاتا ہے ۔

یعنی قدیم ترین صورت آؤتا ہے، جاؤتا ہے، تھی ۔ اس میں دور بدور تبدیلی آئی یہاں تک کہ یہ آتا ہے،

جاتا ہے میں ڈھل گیا ۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب مزید لکھتے ہیں :۔

"ایک اور صورت اس حالِ مطلق یا مضارع کی متقدمین کے یہاں یائے مجہول کے اضافے کے ساتھ

ملتی ہے ۔ آتیا ہے، جاتیا ہے ۔ اڑاتیا ہے ۔ انشا کے دور تک، غالباً کتابی اور فصیح روزمرہ کی

حیثیت سے یہ صورت ترک ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ علاقائی صورتیں اور بھی ہیں جو بعض علاقوں

میں اب بھی موجود ہیں مثلاً آوت ہے اور آوت ہے بجائے آتا ہے " ۔ [۴]

---

[۳] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔ جامع القواعد، حصۂ صرف ص ۲۰۸

[۴] ایضاً ۔ ص ۲۰۹

فتح محمد خاں جالندھری نے مضارع، حال اور مستقبل کی بحث الگ الگ کی ہے۔ وہ حال اور مستقبل کو الگ فعل کی حیثیت دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مضارع کی یہ تعریف کرتے ہیں: "جس میں حال اور استقبال دونوں زمانے پائے جائیں"۔ ۵ے

اس کے بعد مضارع بنانے کے قاعدے سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مضارع مصدر سے بنتا ہے۔ اس طرح سے کہ علامتِ مصدر گرا کر حرفِ اخیر کو دیکھو۔ اگر الف یا واؤ ہو تو ہمزہ اور یائے مجہول آخر میں زیادہ کرو جیسے لائے۔ سوئے۔ متقدمین ہمزہ کی جگہ واؤ زیادہ کرکے لاوے اور سووے، کہتے تھے مگر متاخرین لاوے اور سووے نہیں بولتے اور حقیقت میں لاوے اور سووے کی نسبت لائے اور سوئے فصیح ہے۔ لیکن 'ہونا' کے مضارع میں بجائے ہمزہ، واؤ ہی زیادہ کرتے ہیں اور 'ہووے' کہتے ہیں ...... اگر حرفِ اخیر یائے مجہول ہو تو بس اسی لفظ کو مضارع سمجھو جیسے 'دے' اور 'لے'۔ مگر جس طرح متقدمین الف اور واؤ کی حالت میں، واؤ اور یائے مجہول بھی بڑھاتے تھے اسی طرح یائے مجہول کی حالت میں بھی یہ حرف بڑھا کر 'دے'، کو 'دیوے'، اور 'لے' کو 'لیوے'، کہتے تھے۔ متاخرین نے بھی بضرورت ایسے صیغے استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ذوق ایک قصیدے میں لکھتے ہیں کہ تو دیوے اگر پاس حفاظت پڑا۔ اور اگر ان حرفوں میں سے کوئی حرف نہ ہو تو صرف یائے مجہول بڑھاؤ جیسے پڑھنا سے

۵ے فتح محمد خاں جالندھری۔ مصباح القواعد (حصۂ صرف) ص۶۲۔

پڑھے، کرنا سے کرے...... اگر علامتِ مصدر کے حذف کرنے کے بعد حرفِ صحیح یا 'یائے معروف' رہے تو اس پر
ضمہ دے کر 'واؤ معروف' اور نون غنہ زیادہ کرو (واحد متکلم میں) جیسے کرنا سے کروں۔ پینا سے پیوں، اور اگر
الف یا واؤ باقی رہے تو ایک ہمزہ بھی زیادہ کرو جیسے لاؤں۔ کھوؤں۔ اور اگر یائے مجہول رہے تو حذف کردو
جیسے دینا سے دوں۔ لینا سے لوں وغیرہ" ؎۶

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ماضی مطلق سے بالکل الگ ایک فعل ہے جو حال اور استقبال پر محیط ہے اور اس (مضارع) کے بنانے کا طریقہ بھی حالِ مطلق سے مختلف ہے۔

"واؤ" بڑھانے کے سلسلے میں انشاء اللہ خاں انشاؔ لکھتے ہیں:۔

"بعضے صاحبان در صیغۂ حال آن واؤ ماقبل یائے مجہول زیادہ کنند۔ مانند 'آوے ہے' 'دکھوے ہے' و 'ہووے ہے' و 'رہوے ہے'، بجائے 'آئے ہے' 'دکھے ہے'، 'ولے ہے' و 'رہے ہے' این زیادتی واؤ اگرچہ کہ زبانِ شاہجہاں آبادیانِ اردو دان است لیکن بغیر واؤ فقط حسنے نہ دارد، و رہے و کہے ہم دور از فصاحت است مگر با حرفِ شرط استعمالِ آن روزمرۂ فصیحان باشد" ؎۷

گویا انیسویں صدی کے نصف اول تک کم از کم دہلی میں 'آوے ہے'، 'جاوے ہے' کو فصیح اور درست مانا جاتا تھا۔

؎۶ فتح محمد خان جالندھری۔ مصباح القواعد (حصہ صرف) ص ۶۵-۶۶

؎۷ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ جامع القواعد (حصہ صرف) ص [illegible] بحوالہ انشاء اللہ خان انشا۔ دریائے لطافت۔

شوکت سبزواری نے "افعال کی گردان" کے ذیل میں لکھا ہے کہ اردو کی گردانیں دو طرح کی ہیں (الف) جو اصل مادے میں کسی قدر تصرف کر کے حاصل کی گئی ہیں (ب) جو اسم حالیہ، اسم مفعول یا اور کسی معاون فعل کا نتیجہ ہیں۔ پہلی قسم کی گردانیں تین ہیں ۱۔ مضارع۔ ۲۔ مستقبل۔ ۳۔ امر۔ وہ کہتے ہیں کہ ان میں مضارع کو قدیم ہند ایرانی گردانوں کا بقیہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی تاریخ مسلسل اور مربوط ہے۔ یہ سنسکرت "لٹ لکار" (فعل حال) کی "پرسمے پد" گردان سے ماخوذ ہے اور پراکرت و اپ بھرنش عہد سے گزرتا ہوا اردو میں آیا ہے۔ ذیل میں اس کی گردان سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش روپوں کے ساتھ دی جا رہی ہے:۔

	سنسکرت	پراکرت	اپ بھرنش	اردو
مفرد	متکلم - چلامی	چلامی	چلؤوں	چلوں
	حاضر - چلسی	چلسی	چل ہی - چلہی	چلے
	غائب - چلتی	چلئی	چلئی - چلہی	چلے
جمع	متکلم - چلامہ	چلامُو	چلہوں	چلیں
	حاضر - چلتھ	چلہا	چلہو	چلو
	غائب - چلنتی	چلنتی	چلہیں	چلیں [۸]

مندرجہ بالا گردان میں مضارع کی حالیہ صورت اور قدیم روپ تو دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے تغیرات نہیں دیے گئے ہیں۔ شوکت سبزواری، مضارع سے بحث کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ :۔

۸۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ۳۲۰۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

"مضارع کے صیغے سنسکرت فعلِ حال سے لیے گئے تھے اور قریب قریب تمام جدید آریائی زبانوں میں ملتے

ہیں اور افعال کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم اردو میں ان صیغوں پر "ہے" اور اس کے

دوسرے تغیرات لگا کر فعلِ حال کی گردان کی جاتی تھی...... ناسخ کی تحریکِ اصلاح سے پہلے یہ صیغے عام

طور سے شستہ اور معیاری زبان میں رائج تھے ناسخ نے ان کو ٹکسال باہر قرار دیا اور ان کی جگہ

'اسم حالیہ' پر 'ہے' بڑھا کر فعلِ حال بنایا" [9]

اس اقتباس سے چند باتوں کا استخراج ہوتا ہے اول یہ کہ مضارع، سنسکرت فعلِ حال سے ڈھلا ہے لیکن اس کے باوجود

فعلِ حال اور مضارع دونوں دو الگ الگ فعل ہیں۔ دوسرے یہ کہ قدیم اردو میں مضارع کے صیغوں پر 'ہے'، اور اس

کے دوسرے تغیرات لگا کر فعلِ حال کی گردان کی جاتی تھی۔ ناسخ کی تحریکِ اصلاح زبان سے قبل یہ صیغے عام طور سے

شستہ اور معیاری زبان میں رائج تھے۔ تیسرے یہ کہ ناسخ نے تحریکِ اصلاح کے تحت انہیں ٹکسال باہر قرار دیا اور

ان کی جگہ 'اسم حالیہ' پر 'ہے' لگا کر فعلِ حال بنایا۔ گویا ناسخ سے قبل اردو میں 'اسم حالیہ'[10] تو موجود تھا لیکن اس سے

فعلِ حال نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ مضارع کے صیغوں پر 'ہے' اور اس کی دیگر صورتیں (ہیں، ہو، ہوں وغیرہ) بڑھا کر

'فعلِ حال' بنایا جاتا تھا۔

---

[9] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۲۲-۳۲۱

[10] آتا۔ کھاتا۔ رہتا۔ لڑتا وغیرہ۔

اس مطالعے کا مقصد یہی دیکھنا ہے کہ اردو میں مضارع اور حال ایک ہی ہے یا ان میں فرق و امتیاز کیا جاتا تھا۔ اگر کیا جاتا تھا تو کس طریقے یا علامت کے ذریعے۔ فعلِ حال، مضارع پر "ہے" اور اس کی دوسری صورتیں ہی لگا کر بنایا جاتا تھا یا اس کے علاوہ بھی فعلِ حال کے لیے الگ کوئی صورت مستعمل تھی۔ مضارع پر "ہے"، "اور گا"، کا اضافہ کس وقت سے ملتا ہے۔ نیز یہ کہ اردو میں ناسخ سے قبل "اسم حالیہ" پر "ہے" بڑھا کر "فعلِ حال" بنانے کی کوئی مثال ملتی ہے یا نہیں۔ اگر ناسخ سے قبل بھی یہ استعمال موجود تھا تو کس زمانے سے۔ اور کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ناسخ سے قبل اسم حالیہ پر "ہے" بڑھا کر فعلِ حال بنانے کی مثالیں نہیں ملتیں، اور یہ کہ یہ ناسخ کا اضافہ ہے۔ ان تمام امور کا غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لینے کے لیے ادبِ اردو کے نمونے درج ذیل ہیں تاکہ کسی نتیجہ تک پہنچا جا سکے۔

نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ سوئی فخر دیں کوں دیا دے جس + جو ہر بار سو دھن کیا وے الس

۲۔ بھرے سند میں جیو بھریا ایک ماٹ + جنہ کھالیں ادھک ہورے گھریں نہ گھاٹ

۳۔ کہ جے راجہ مجہ کوں کہے کھول کر + ہنوں بول کا بول دیوں اُتر

۴۔ اُجگر دہوں جگ سو ہورے جن + جو ہر بار دیکھت ہے مائی بہن ۔۔۔ ۱۱

"اسم حالیہ" کے ذیل میں دو مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۱۔ فخر دیں نظامی دکنی۔ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ص ۸۱، ص ۹۱، ص ۷۷، ص ۸۱۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۳ء

ع   بنی سار کی ڈھیر لیتی اُمّت

ع   نہ کرتا جے ہوں (دنیا) آکھو رسوں [۱۲]

دوسرے مصرع میں 'کرتا' کو 'ہوں' کے ساتھ ملا ئیں تو 'کرتا ہوں'، فعلِ حال ہو جائے گا لیکن درحقیقت یہ اس طرح نہیں ہے۔ 'کرتا' اسم حالیہ ہے اور 'ہوں'، فعل 'ہونا' سے شکلم واحد کا صیغہ ہے۔

قلی قطب شاہ کے یہاں حسبِ ذیل قسم کی مثالیں عام ملتی ہیں :-

۱۔ ع   حیات ہور بخت دولت سوں خطر تمنے جلاتے ہیں

۲۔ ع   تو سرج اس رنگ تھے ہر رات جاوے لاج لاج

۳۔ ع   تجھے دارو کے مست سوں شغل کے جام دیوے گا

۴۔ ع   تم مسانی کے گناہاں کا رقم کرتے ہیں کی۔

۵۔ ع   تج محمد ناٹوں تھے سیتا ہے تاجِ احمدی

۶۔ ع   نیَن کرتے ہیں تمہارے ہمن سوں بات صیح۔ [۱۳]

مندرجہ بالا مصرعوں میں مضارع اور حال پہلو بہ پہلو ملتے ہیں جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ ان دونوں

---

[۱۲] فخر دین نظامی۔ کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۲۱۷ - ۲۰۱ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول ۱۹۷۳ء

[۱۳] قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ۔ ص ۳۶، ص ۱۲، ص ۲۰۲، ص ۳۸۲، ص ۱۰۲، ص ۹۹ مرتبہ محی الدین قادری زور۔ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء

افعال میں فرق و امتیاز کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بعض جگہ مضارع صرف مادے پر یائے مجہول بڑھا کر بنایا گیا ہے اور بعض جگہ "واؤ زائد" بھی ملتا ہے۔ (دے۔ کرے۔ دیوے۔ آوے۔ ہووے وغیرہ)۔ تیسرے یہ کہ اسم حالیہ پر "دے" اور "گا" بڑھا کر "حالِ مطلق" اور "فعلِ مستقبل" بنائے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مضارع پر بھی حال اور مستقبل کی علامات کے اضافے سے فعلِ حال اور فعلِ مستقبل بنا لیے گئے ہیں مثلاً کرتے ہیں، دیوے گا، سنتا ہے، پڑتا ہے وغیرہ۔ مزید برآں مضارع کا استعمال حال اور مستقبل دونوں پر محیط ہے یعنی اس میں دونوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کے استعمال میں زمانے کا تعین سیاق (Context) سے ہوتا ہے۔

مضارع کے استعمال کی چند مثالیں حسن شوقی کے یہاں دیکھیے :۔

۱۔ نہ چھوڑے جو پاوے کدھیں کام دھیان

۲۔ بٹھاویں مجے (مجھے) رائے ستی بھنڈار

۳۔ سمدر کے تیں میٹ دیوے ادھار

۴۔ نہ کھاوے کدھیں ماس توں گھاس کا [۱۴]

مضارع اور اسم حالیہ کا پہلو بہ پہلو استعمال بھی ملاحظہ ہو۔ حسن شوقی کا شعر ہے :۔

؎ بٹھاویں مجے باج حاجب سنگات ⁎ نظامیاں تخاین سوں کرتا لفات [۱۵]

۱۴-۱۵ حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۷۱ء

انھی نے فعلِ حال' کی مثال دیکھیے :-

ے تپ تپ ہوا ہوں تب سیں ترے وصال کارن + جب جپ کیا ہوں جپنا ہردم کتا (کہتا) ہوں اب اب

مضارع کے ساتھ علامتِ مستقبل لگا کر مستقبل سے مختص کرنے کی مثال :

ع لگاوے گی کر او پا ہنی جا کر چھپیا نرگس بھیتر

ع یتی دیک (دیکھ) جو سی یوں کہیں عشاق کا ہوئے گا کھتر ۱۶ے

قلی قطب شاہ اور حسن شوقی ہم زمانہ ہیں حسن شوقی کا زمانہ ۹۴۸ و ۱۰۵۰ ہجری ہے۔ اسی دور کی دو اور تصانیف قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) اور سب رس (۱۰۴۵ھ) ہیں۔ "قطب مشتری" سے مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ے بنی آج ہمارے یہاں آئیں گے + ہمیں سب اِنوں کا درس پائیں گے۔

ے وہی ایک کرتا ہے بہو دھات بھیں + کہ یک رات ہو وے کدھیں ہو وے دیں

ے ہوا حرص جو دور کرتے اہیں + بڑا مرتبا سب میں دھرتے اہیں

ے سو راکس دیکھے دورتے آوتا + دو نا سعد جیوں رعد ار ڈراوتا

ع تو جیوں گیند امانت لیوے جھیل کر ۱۷ے

۱۶ے حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۱ء

۱۷ے ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص۱۰ ص۵ ص۶ ص۲ ص۸۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

مندرجہ بالا امثال میں شغلِ حال اور شغلِ مستقبل، مضارع کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

ملا وجہی کی نثری تصنیف "سب رس" سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

جملہ نمبر ۱:۔ بصحت و سلامت خدا تجھے تیری مرادکوں اپڑاوے

۲:۔ خدا جو پادشاہوں کوں پادشاہی دیتا ہے خلق کوں کیوں پالتے کر خبر نیں لیتا ہے۔

۳:۔ کیا تھا کیا ہے کیا ہوئے گا۔

۴:۔ تمیں کون ہیں، کیا نام دھرتے ہیں کیا کام کرتے ہیں۔ ۱۸

مضارع کے ساتھ ساتھ ان دونوں امثال کا ملنا اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ شغلِ حال اور شغلِ مستقبل زمانہ قدیم سے اپنی موجودہ صورت میں استعمال ہو رہے تھے اور ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا لہذا اس کے لیے الگ باب مخصوص کرنے کی ضرورت نہیں، مضارع کی بحث ہی میں ضم کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ مضارع کا تعلق بھی بہرحال شغلِ حال اور مستقبل سے ہے۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی کے یہاں بھی یہ استعمال اسی طور پر دیکھتے ہیں ۲ مثالیں مثال کے طور پر:۔

۱۔ مصرع تو کرے تلعے میں سرا حکم چلاوے عقل

۲۔ مصرع بارے کتا دکھتا ہوں اِتا چند سخن خوش وزن

۱۸۔ ملا وجہی۔ سب رس۔ صفحہ ۱۱۸-۲۱-۲۹۲ صفحہ ۸۱۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۶ء

۳۔ ع پیاسا تھ ریجھ رہنا لذت اسے کہتے ہیں

۴۔ ع گیا سیر نگ کا سب رنگ دیکھت کمل کا پھتر۔ [۱۹]

ابنِ نشاطی کی مثنوی "پھول بن" سے بھی چند مصرعے یہاں نقل ہیں:۔

۱۔ ع سعادت مشتری جم تجھ سوں پاوے

۲۔ ع تیری قدرت پو دیتی ہے گواہی

۳۔ ع کہ پھول لگے تو جیوں آ تا اُتے پھل

۴۔ ع شجاعت کا دیکھت تجھ سکے پو (یہ) پانی۔ [۲۰]

کمال خاں رستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" سے کچھ مثالیں درجِ ذیل ہیں:۔

ے جو اس تکتے تھے سو ہوے دولت منجے + بلندی دیکوے سو ور رحمت منجے

ع اسی کچھ ہتی پو دلیریں گواہ۔

ے جتی خلق پاکی سوں بندگی کریں + کریں یاد حق کوں سو ور سر بُفیں دھریں

ع شب و روز پو رتا ہے یک جائے پر۔

---

[۱۹] علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی ص ۱۲۳ تا ۱۵۰ تا ۱۰۰ مرتبہ سید مبارز الدین رفعت۔ محبوب پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۲ء

[۲۰] ابنِ نشاطی۔ مثنوی پھول بن ص ۱۱ تا ۶ تا ۱۳ تا ۱۱۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۵ء

؎ جو اس سرج تھے چاند کوں لیاؤتا + گہر دُرج تھے لیاؤ دکھلاؤتا ۲۱؎

قاضی محمود بحری کی مکلیات سے بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

؏ غیب کے او پر لاویں منزا غائب ہو کر جائیں

؏ گرچہ رویت کے بدل روتے ہیں ہر ہر گھر سا لوگ

؏ سلامت کر نیاریاں کوں سلامت حق رکھے دایم

؏ اگر نظر دھرے تو ساتہ سمدر کے تیں سب خشک کرے

؏ مناؤتا ہے آپ تریجن لے گر دل میں کوپ دھرے۔

؏ گر مرے گا تو منہ پر سی کام کچھ غسال کا۔

؏ غم سوں تیرے اے پری روتا ہے بحری یوں مدام ۲۲؎

ولی کے بھی کچھ مصرعے دیکھیے :-

؏ بعید سے یوں کر بیوے اس کو تیری آشنائی کا۔

؎ جس گھر دُ ہیر پاؤں رکھیں تیرے زُولاں + اس گرد کو میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

؏ تب سوں انگاروں پہ لوٹتا ہے ولی -

۲۱؎ کمال خاں رستمی بیجاپوری - خاور نامہ - ص ۸۲۴ ص ۵ ص ۲ ص ۱ ص ۱۵ ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

۲۲؎ قاضی محمود بحری - مکلیاتِ بحری ص ۱۳۱، ۲۵، ۷۵، ۱۶۷، ۱۲۴، ۲۳۹ - نولکشور پریس لکھنؤ - سنہ ۱۹۳۶ء

ع تری مجلس میں لیاوے جام روشن ماہ یمیں کا

ع شوق اس خط کا غبار آلود رکھتا ہے ہنوز ۲۳

دکنی و گجراتی اردو کی ان تمام مثالوں سے ظاہر ہے کہ :-

۱۔ اردو میں جب سے ادب کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں، مضارع کا استعمال ملتا ہے۔

۲۔ مضارع اور حال مطلق دو الگ الگ صیغوں کے طور پر پہلو بہ پہلو مستعمل رہے ہیں۔

۳۔ فعل حال دو طریقوں پر بنایا گیا ہے ① مضارع پر 'ہے' اور اس کی دوسری صورتیں اضافہ کرکے، اور ② اسم حالیہ پر 'ہے' کا اضافہ کرکے۔ (ہے، ہیں، ہوں وغیرہ)

۴۔ مضارع کی مختلف صورتیں جو پہلو بہ پہلو مستعمل رہیں، یہ ہیں :-

ہووے، لاوے، لیوے، لائے، دھرے، دھرے، کہے، کھیلے وغیرہ۔

۵۔ اسم حالیہ دو صورتوں میں استعمال ہوا ہے ایک تو موجودہ صورت ہی ہے یعنی آتا، جاتا، کہتا، کرتا، لاتا وغیرہ۔ دوسری صورت میں ایک ہمزہ اور واؤ زائد ملتا ہے مثلاً لاؤتا، آؤتا، اڑاؤتا، مناؤتا وغیرہ

۶۔ مضارع کی ایک اور صورت 'لاحقہ سی' کے استعمال کے ساتھ ملتی ہے خصوصاً سب رس میں مثلاً آسی جاسی، کرسیں، ہوسی، پڑسی وغیرہ۔

---

۲۳ ولی - کلیات ولی - مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت سوم ۱۹۵۴ء

شمالی ہند میں کیا صورت تھی، یہ دیکھنے کے لیے نمونے درج کیے جاتے ہیں۔ اول اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں سے کچھ مثالیں دیکھیے:۔

ع رزق دیوے موافق قدر ہر کسی

ع تیرا نام ہر دم کوئی لیوتا ✦ ٹھکانہ جنت بیچ اوس دیوتا

ع اگر روک لیشوں بھوت و دیو کو۔

ع کئی پھیرے (پھیر) یا رب میں کیونکر اٹھوں ✦ کہ رسوائی ایسی میں کیونکر سہوں

ع یکس کے سنتر عاقبت پائے گا

ع کہا میں مدینے میں رہتا ج ہوں ✦ یہی بات سچ مان کہتا ج ہوں O

ع کتا (کہتا) ہے جبا کہنہ دیتا مجھے۔ ۲۴

فائز کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

ع ہجر میں تیرے آہ کرتا ہے

ع یا قوت کو لاوے نہیں خاطر میں کبھی وہ

ع تری گالی مجھ دل کو پیاری لگے۔

---

۲۴ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں صفحات ۱۵۴-۱۶۶، ۱۳۶، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۶، ۱-۱ مرتبہ نائب حسین نقوی، نوجوان پریس لاہور طبع اول دسمبر ۱۹۶۹

؎ بھلا دیوے دو نینوں کو آرام سب + جیسے زلفوں سیں سیہ رات لگے ۔ ۲۵

تاباں کے دیوان میں ان استعمالات کی حسبِ ذیل صورت ہے :-

؏ بہت چاہا کہ آوے یار یا اس دل کو صبر آوے

؏ لگ جائے ہے دل میرا ہر یوسفِ ثانی سے ۔

؎ جاتا ہوں تیرے در سے صنم نا امید ہو + پھر منہ ترا کبھی نہ دکھاوے خدا مجھے ۔

؎ پاس تو سوتا ہے جنھوں ہر گلے لگتا نہیں + منتیں کرتے ہی ساری رات ہو جاتی ہے صبح ۲۶

شاہ حاتم کے کلام سے مثالیں ملاحظہ ہوں :-

؎ کون جانے ہے بغیر حق تجھ بن + جیسا حاتم کا حال ہوتا ہے

؏ کون ہووے مجھ نہ ہووے تو مرا

؏ دیکھیے جیتا بچے ہے کون اور مرتا ہے کون

؏ تصدق تجھ او پر کرتا ہوں جوں بلبل گلوں او پر

؏ سب کی دعا سنتا ہے کرے گا خدا سمیع ۲۷

---

۲۵ فائز - دیوانِ فائز ص ۱۸۰ - ص ۱۸۰ - ص ۱۵۹ - ص ۷۹ / مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب - مطبوعہ عمدہ پریس دہلی۔ سنہ ۱۹۴۶ء

۲۶ میر عبدالحئی تاباں - دیوانِ تاباں ص ۲۶ - ص ۱۶۴ - ص ۱۹۰ - ص ۲ مرتبہ مولوی عبدالحق - انجمن ترقیٔ اردو، اورنگ آباد دکن۔ سنہ ۱۹۳۵ء

۲۷ شاہ حاتم - شاہ حاتم، حالات و کلام ص ۸۴ - ص ۸۱ - ص ۷۹ - ص ۷۴ - ص ۷۳ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار - جلیل اردو مکتب پریس لاہور سنہ ۱۹۶۴ء

دردؔ کے چند مصرعے حسبِ ذیل ہیں :۔

ع لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو

ع شب و روز اس طرح گزرے ہے اپنی تو کچھ اے ساقی

ع جوں کاغذِ باد اہلِ ہوس دیچ میں پیچ گئے

ع دردؔ مرتا ہے کوئی اس کی دوا کرتا نہیں

ع کیسی تم کو بھاوت ہیں اور کیسے تو سکھ بادشاہیں

ع یہ پھلواری دردؔ ہمیں کچھ اور سمجھ دکھلاوت ہیں ٢٨

اب میرؔ کا کلام دیکھیے :۔

ع نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا

ع منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا

ع چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ع جب کوئی میرا طرح سے دیوے سب تن من حملہ

ع ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں ٢٩

---

٢٨ خواجہ میر دردؔ - دیوانِ دردؔ ص ١٢٥-١٢٥-٩٦-٤٩-٧-١٢٢ - زرین آرٹ پریس لاہور، سنہ ١٩٦٢ء

٢٩ میر تقی میرؔ - کلیاتِ میرؔ ص ٢٤-٧ ص ٤ ص ٦-٢ بترتیب جدید مع مقدمہ و فرہنگ - باہتمام کیسری داس - مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ١٩٤١ء

فضلی کی کربل کتھا" کے جملے دیکھیے :-

۱- ذوالجناح گھوڑا پانی میں منہ نہ ڈالتا اور کہتا نہ پیوں جب لگ خاوند (مالک) میرا نہ پیوے جو کے (پی ملے)۔

۲- اور جو کوئی بیٹھے اوس مجلس میں کہ جس میں احوال ہمارے اور مناقب اور احادیثیں ہماری بیان کرتے ہوئیں (ہوں)

۳- ایسا مریض کہ بغیر کونجی (کنجی) دروازہ کھولے اور بغیر ہتھیار جان لیوے

۴- اگر دروازہ اوس پر موندیں، دیوار سے آوے اور جس گھر میں آوے دھنوا (دھواں) اوس گھر سے اوٹھاوے

۵- پھر رو کر کہی اے پدر، جان میرا قربان تیرے، کیوں جواب نہیں دیتا۔

۶- مدینہ میں دادا کی قبر پر پہونچیاں تا درد دل اپنا اوس قبر سے کہتیاں۔

۷- اے باپ یتیموں کے اور اے پناہ بیکسوں کے اور غریبوں کے اور بیچاریوں کے، ہم بغیر تیرے دنیا میں کیونکر پھریں گیاں اور

بغیر تیرے دیدار کے کیونکر زندگی کریں گیاں

۸- راوی لکھتا ہے کہ پھر ایک مرتبہ حضرت نے اپنے تئیں دریا پر پہونچایا۔ [۲۰]

"سحرالبیان" کے چند مصرعے دیکھیے :-

کہ ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں

کہ پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں۔

---

[۲۰] فضل علی فضلی۔ کربل کتھا ص ۲۰۵، ص ۸۹-۸۹، ص ۶۲، ص ۶۶، ص ۶۶، ص ۵۱، ص ۲۰۵ (تصنیف ۱۱۴۵ھ) مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دہلی اشاعت اول سنہ ۱۹۶۵ء

۲۱

۵ ۔۔ کہ تا راز اس کا نہ ہووے عیاں [۳۱]

میر امن کی "باغ و بہار" (تصنیف ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء) کے کچھ جملے یہاں نقل ہیں:۔

۱۔ اتنا ملک جو لیا تیرے کس کام آوے گا۔

۲۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھاؤ۔

۳۔ آدمی سے ایسے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔

۴۔ اگر بلکہ غریب نوازی اور مسافر پروری سے حضور میں بلاویں اور سیر دیکے باہر پھلاویں۔

۵۔ دو پیادے اٹھائے لیے جاتے ہیں اور آپس میں بتیاتے ہیں۔ [۳۲]

میر شیر علی افسوس نے "گلستان سعدی" کا ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے کیا۔ چند جملے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ چشم عبرت بیں اس کی، یہ ہے دیکھتی

۲۔ کہتے ہیں کہ دس فقیر ایک کملی میں چین سے سوویں۔

۳۔ تھوڑے سے تغیر حال میں اپنے مخدوم قدیم سے پھر جاوے اور برسوں کی نعمتوں کے حقوق کھو دیوے۔

۴۔ ایک بیمار سے پوچھا کہ دل تیرا کیا چاہتا ہے کہا اس نے یہ چاہتا ہے کہ کچھ نہ چاہوں۔ [۳۳]

---

[۳۱] میر حسن۔ سحر البیان مد ۵۷ مت ۲۰ ص ۲۰ (تصنیف ۱۱۹۹ھ)۔ نامی پریس لاہور۔ طبع اول دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء

[۳۲] میر امن۔ باغ و بہار ص ۱۵-۲۷-۳۲-۲۱-۸ / [۳۳] میر شیر علی افسوس۔ باغ اردو ص ۱۱۴-۳۷-۲۲-۱۹

شیر علی افسوس کی "آرائشِ محفل" (ترجمہ خلاصۃ التواریخ) کا ایک جملہ ہے :۔

۳۲ حمام میں نہانے کو لے جاتیاں ہیں خاوند کو اصلاً و مطلقاً خاطر میں نہیں لاتیاں ۔ [۳۴]

"اسم حالیہ" کی جمع کا یہ استعمال (صیغۂ جمع مونث میں) بعض دوسروں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ یہ اس زمانے کے چلن کے مطابق ہے۔

انشا کہتے ہیں :۔

ع کن محلے میں رہتے ہو، ہے کہاں کا وہ خبیث ۔

ع کوئی شیطان ہووے گا جس نے کہ ذکر ایسا کیا

ع نہ کیونکر بن کے بن ٹیسو کے پھولوں کے نظر آویں

ع کس طرح سے مجھ سے تم سے ہووے باہم اختلاط

ع بھکالیوں ہوں کرکے رہ کا رواں غلط [۳۵]

انشا کی نثری تصنیف "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" سے چند جملے یہاں نقل ہیں :۔

۱۔ آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں

۲۔ جیتے رہے اونھیں سبھوں کا آسرا اور ان کے گھرانے کا رکھتا ہوں ۔

۳۴۔ شیر علی افسوس ۔ آرائشِ محفل ص ۲۳۱ (ترجمہ ۱۲۲۳ھ) مرتبہ کلب علی خاں فائق۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ طبع اول اپریل ۱۹۶۳

۳۵۔ انشاء اللہ خاں انشا۔ کلیاتِ انشا ۔ ص ۱۱۹، ص ۱۸۹، ص ۶۸، ص ۸، ص ۸۰ مرتبہ جلیل الرحمٰن داؤدی۔ ریڈنگ پرنٹنگ پریس۔ لاہور

۳- جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں۔

۴- ان پھولوں کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے کس کس روپ کے پھول اگلتا ہوں۔ ۳۶؎

شیخ صالح محمد عثمانی نے جوامع الحکایات کا ترجمہ "جامع الحکایاتِ ہندی" کے نام سے کیا، اس کے چند جملے دیکھیے:-

۱- داد خواہ بنا روک ٹوک اس کی زنجیر پکڑ کر ہلاوے۔

۲- بے مقدوری کے سبب دشمن مجھ پر ٹھٹھا ماریں طعنہ مہنا دیویں۔

شاہ تغیر کے بھی چند مصرعے درج ذیل ہیں:-

ع کرتا ہوں قصد ہاتھ اس زلف کو جب میں لگانے کا

ع چلا آتا ہے اے دل سوز سر پر وقت رخصت کا

ع بے محل کیونکر نہ ہووے اس کی وحشت میں تغیر

ع کھینچے ہوئے جاتا ہے سر رشتۂ الفت

ع بساط میں یہ ڈر رشا ہوا رکھتا ہوں۔ ۳۷؎

سر سید احمد خان کی تصنیف "اسباب بغاوتِ ہند" سے چند جملے ملاحظہ ہوں:-

---

۳۶؎ انشاء - کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی، ص ۱۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن پریس کراچی، طبع سوم ۱۹۷۵

۳۷؎ شیخ صالح محمد عثمانی - جامع الحکایاتِ ہندی، ص ۱۶-۲۹ (ترجمہ ۱۲۰۵ھ) مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، زرین آرٹ پریس لا

۱۔ جب کمپنی کسی ملک کو فتح کرتی تھی جس کا بیان آگے آوے گا۔

۲۔ ناواقف رہنا گورنمنٹ کا، رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گزرتے تھے ۳۸

غالب اپنے ایک خط (بنام حاتم علی بیگ مہر) لکھتے ہیں:۔

مثنوی کے اشعار میں نے دیکھے، کیا کیوں کیا حظ اٹھایا۔

اگر کسی انداز پر انجام پاوے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اردو کہلاوے گی۔

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں کرتا۔ یاد کیا آوے لیٹا ہوا ہوں۔ دم بدم پاؤں (پاؤں) کے ورم کی ٹیس

ہوش اڑائے دیتی ہے۔

منشی بنی بخش حقیر کے نام لکھتے ہیں:۔

ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں۔ جس کی شدت سے جلا جاتا ہوں۔ ۳۹

لکھنؤ کے پنڈت رتن ناتھ سرشار (م ۱۹۰۲ء) کی تصنیف "فسانۂ آزاد" سے چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

۱. یہ واہیہ وہ بلا ہے جو صورت بناوے اور سناوے، حس و حرکت دکھاوے، چلاوے، پھر اوے۔

۳۸ سرسید احمد خان۔ اسباب بغاوت ہند۔ صہ ۱۰۱-۱۰۱

۳۹ غالب۔ خطوط غالب۔ صہ ۲۰۲-۲۰۳ صہ ۸۹-۹۰ مرتبہ غلام رسول مہر۔

۲۔ کوئی ہم پر ہلاوے تو جائیں اور یوں گپ اڑانے کو کہئے تو ہم بھی بے پر کی اڑانے لگیں۔

۳۔ آزاد نے اس لحیم و شحیم آدمی کو ڈھونڈ نکالا جو دعویٰ کرتے آئے تھے کہ بھلا ہم پر تو کوئی پرند (بھوت) ہلاوے۔[۱]

سرشار کے یہاں مثلِ مضارع کا یہ استعمال ناسخ کی اصلاح کے بہت بعد کی بات ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود اس کے، کہ ناسخ نے اسے ترک کرکے صرف "تا ہے" (اسم حالیہ پر "ے" بڑھا کر) مثلِ حال اختیار کرنے کی تاکید کی اور خود بھی پابندی کی، لیکن پھر بھی مضارع کا استعمال مل جاتا ہے۔ گویا یہ استعمال ناسخ کے کہنے کے ساتھ ہی ترک نہیں ہو گیا تھا بلکہ بعد کے نثر نگار تک اسے استعمال کرتے رہے تھے۔ وہ بھی جنہیں اپنے لکھنوی ہونے پر ناز تھا۔

شمالی ہند کے نمونوں سے جو امور سامنے آتے ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جن کا ذکر دکنی و گجراتی اردو کے نمونوں کے ذیل میں کیا گیا یعنی :۔

۱۔ حالِ مطلق، اسم حالیہ پر "ے"، "ہیں"، "ہوں" وغیرہ بڑھا کر بنانے کا طریقہ رائج تھا۔

۲۔ مضارع کا استعمال، مثلِ حال سے الگ ہے۔

۳۔ مضارع کی دو صورتیں ہیں (۱) مادے پر حرف یائے مجہول کے اضافے سے (۲) مادے پر یائے مجہول سے قبل ایک واؤ زائد کے ساتھ۔

۴۔ اسم حالیہ بھی دو طرح پر ملتا ہے (۱) مادے پر حرف "تا" کے اضافے کے ساتھ اور (۲) مادے پر "تا" کے اضافے سے قبل ایک واؤ

---

[۱] رتن ناتھ سرشار - فسانۂ آزاد ص ۹۸-۹۷-۱۵۔

زائد کے ساتھ جیسے لاؤتا۔ لیوتا۔ دلیوتا (لانا، لینا، دینا) وغیرہ۔

۵۔ اسم حالیہ کی ایک صورت اور بھی نظر آتی ہے، یہ مادے پر "نا" کی جگہ صرف "ت" کے اضافے کے ساتھ ملتی ہے مثلاً پاوت، کھلاوت، لیکھت، دیکھت، دھرت وغیرہ۔ دکنی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔

۶۔ مضارع پر گا، گے، گی، کے اضافے سے مستقبل بنایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا قواعد کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک بار پھر ان قواعد نویسوں کی آرا کا جائزہ لے لیا جائے جن کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ مولوی عبد الحق کا کہنا ہے کہ "مضارع کی جو موجودہ صورت ہے یہی قدیم حال مطلق تھا مثلاً جائے ہے ---- اسی سے موجودہ حالِ مطلق "جاتا ہے" بنا ہے۔ یعنی اس کے تغیرات کی صورت یہ ہوئی :۔ جاوے، جاوے ہے۔ جائے ہے، جاوت ہے اور جات ہے ـــ اور جاتا ہے۔ 'جاتا ہے' موجودہ فصیح حالِ مطلق ہے اور انہیں سے تراش تراش کر بنا ہے" [1]

ابواللیث صدیقی صاحب نے بھی مضارع اور حالِ مطلق کو ایک ہی فعل قرار دیتے ہوئے اس کے تغیرات یہ بتائے ہیں :۔ آوے ہے۔ آئے ہے۔ آتا ہے۔ ـــــــ [2]

صاحبِ "جلوۂ خضر" صفیر بلگرامی کے خیال میں آوے ہے، آئے ہے وغیرہ کو ناسخ نے ترک کیا اور اس کی جگہ "آتا ہے"

---

[1] مولوی عبد الحق۔ قواعدِ اردو۔ ص ۱۱۱ تا ۱۱۰

[2] ابواللیث صدیقی۔ جامع القواعد (حصۂ صرف) ص ۲۰۸

(اسم حالیہ "پڑھتے" کے اضافے کے ساتھ) کو رواج دیا۔

ان مراحل کا ادب کے قدیم نمونوں کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ محض ایک غلط فہمی ہے کہ مضارع اور حال مطلق ایک ہی فعل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک قواعد نویس کے کہنے پر دوسروں نے بھی صاد کیا اور اس طرح اس غلط فہمی کا اعادہ ہوتا رہا۔ اس ضمن میں مولوی فتح محمد خاں جالندھری کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ادب کے نمونوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ زمانۂ قدیم ہی سے حالِ مطلق اور مضارع دو الگ الگ فعل تھے۔ مضارع کا استعمال ایسے موقعوں پر ہوتا تھا جب کوئی ایسی بات کہی جاتی جو حال اور مستقبل دونوں پر منطبق ہو سکتی۔ البتہ جب کسی ایسی بات کا اظہار مقصود ہوتا جو حال میں وقوع پذیر ہوئی ہو تو اس کے لیے حالِ مطلق استعمال کیا جاتا تھا جس کے بنانے کے دو طریقے رائج تھے۔ اسم حالیہ "پڑھتے" بڑھا کر (جو موجودہ فصیح حال مطلق کہا جاتا ہے) اور دوسرے مضارع کے معنے کو حال پر منطبق یا مخصوص کرنے کے لیے اس پر "ہے" بڑھا لیا جاتا تھا۔ اسی طرح جب اسے مستقبل سے مخصوص کرنا ہوتا تھا تو اس پر علاماتِ استقبال گا، گے، گی، کا اضافہ کر کے اسے مستقبل کے معنوں میں محدود کر لیا جاتا تھا۔ ان استعمالات سے جہاں اس حقیقت کا یقین ہوتا ہے کہ مضارع اور حالِ مطلق میں ابتدا ہی سے فرق و امتیاز کیا جاتا تھا وہاں اس دعویٰ کی بھی خود بخود تردید ہو جاتی ہے کہ اسم حالیہ "پڑھتے" کے اضافے سے حال مطلق ڈھالنے کا سہرا ناسخ کے سر ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جس طرح ولی سے لے کر حاتم، مظہر، آرزو، میر اور سودا وغیرہ نے زبان میں تھوڑی بہت تراش خراش اور ترک و اختیار کی کوششیں کیں تاہم ان پر عمل کرنے کی شعوری سعی کے باوجود پرانے روزمرہ اور محاورہ، نیز بعض الفاظ متروک کو استعمال کرتے رہے یہی صورت ناسخ کے دور میں بھی پیش آئی۔ انہوں نے بعض الفاظ و استعمالات کو غیر فصیح سمجھ کر منسوخ و متروک قرار دیا اور ان کی متبادل صورتوں کو اختیار کیا اور کہیں مستعمل صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو برقرار رکھا، باقی کو ترک کر دیا۔ البتہ ان متروکات کا دائرہ بہ نسبت دوسرے شعرا کے، زیادہ وسیع تھا۔ لیکن چونکہ زبان کو یکلخت تبدیلی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ اہلِ زبان کے استعمال پر منحصر ہے کہ وہ کب اس جانب راغب ہوتے ہیں کہ متروکات کو آہستہ آہستہ بالکل ہی ترک کر دیں۔ ترک و اختیار کا یہ مرحلہ بتدریج طے ہوتا ہے۔ ناسخ کی اصلاحات کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ غالب لکھتے ہیں:

"ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا تھا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان

ایک ہوئی وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے۔" ۴۳

عام نہ ہونے سے یہ مراد نہیں کہ ان قاعدوں کو قبولیتِ عام حاصل نہیں ہوئی بلکہ غالباً یہ ہے کہ ان اصلاحات کو اختیار
کرنے کی روش اس قدر تیز نہ تھی کہ فوری طور پر تمام اصلاحات اپنائی جاتیں اور تمام متروکات کو فوراً ترک کر دیا
جاتا۔ بلکہ یہ ترک و اختیار بتدریج واقع ہوا۔ اس طرف شعرا و اُدبا کی توجہ مبذول کرانے میں بلاشبہ ناسخ کا بڑا
ہاتھ تھا۔ کیونکہ زبان میں ترک و اصلاح کے قواعد بڑے پیمانے پر انہوں نے ہی منضبط کیے لیکن یہ فوری طور پر خود لکھنؤ
میں بھی رائج نہ ہو سکے یہی سبب ہے کہ ناسخ نے اگرچہ آوے، جاوے وغیرہ کو متروک قرار دے کر ان کی جگہ صرف آتا ہے
جاتا ہے کو برقرار رکھنے (اختیار کرنے کو نہیں، کیونکہ زبان میں یہ قاعدہ ناسخ سے بہت پہلے سے موجود چلا آ رہا تھا
لہٰذا 'برقرار رکھنا' زیادہ مناسب ہے) پر زور دیا تھا۔ اس کے باوجود شرح نسخۂ 'آزاد' میں یہ استعمال مل
جاتا ہے۔ تلاش سے اور بھی بہت مثالیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناسخ نے زبان میں خلا
مضارع کے ساتھ حال اور مستقبل کو پہلے سے موجود پایا جو اردو کے اختصار پسند رجحان کے خلاف تھا۔ ناسخ نے بھی
اسے بے ضرورت سمجھا کہ جب حال اور مستقبل کے افعال موجود ہی ہیں تو مضارع کو بھی باقی رکھا جائے۔ لہٰذا انہوں نے مضارع کو
ترک کرنے میں مضائقہ نہ سمجھا۔ اس سے اختصار پیدا ہوا اور جس طرح بعض دوسرے الفاظ و حروف کی متعدد صورتوں
کے ساتھ کیا گیا تھا کہ بہت سی صورتوں میں سے کسی ایک کو قائم رکھا جائے باقی کو متروک کر دیا جائے یہی قاعدہ ناسخ
نے مضارع اور حال مطلق کے ساتھ روا رکھا۔ مولانا عبدالحئی "گلِ رعنا" میں لکھتے ہیں:۔

"زبان کی تراش خراش کرکے بد مزہ اور ناگوار الفاظ جو ان (ناسخ) کے زمانے میں
مروج تھے، ترک کر دیے۔ آئے ہے، جائے ہے، ان سب کو خلافِ فصاحت قرار
دیا جن کو بالآخر دلی والوں کو بھی ماننا پڑا۔" ۴۴

دلی والوں کی تقلیدِ لکھنؤ کے سلسلے میں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی لکھتے ہیں:۔

---

۴۳ محمد باقر شمس۔ لکھنؤ کی زبان ص ۱۲۰ (بحوالہ غالب) مطبوعہ ضیا برقی پریس کراچی۔

۴۴ ایضاً ص ۱۱۲ بحوالہ عبدالحئی۔ گلِ رعنا۔

"جو لوگ دہلی کے شعراء و نقاد و مالکِ زبان و مسلم ہیں ان کا کلام لکھنؤ کی زبان سے مطابقت
رکھتا ہے کس وجہ سے کہ جب سے میر و سودا لکھنؤ میں آ کر رہ پڑے اسی زمانے سے دلی گوش بر آوازِ
لکھنؤ ہو گئی تھی۔ پھر انشاء اللہ خاں (انشا) اور جرأت کے کلام نے ان کی توجہ کو ادھر سے پھرنے
نہ دیا۔ بعد ان کے آتش، ناسخ کے شاعروں نے متوجہ کر لیا بلکہ شاہ نصیر و ذوق نے تو کلام
کا رنگ ہی بدل دیا۔ آخر میں میر صاحب کے مرثیوں نے خاص و عام سب کی زبان پر اثر
ڈال دیا۔" ۲۵؎

غرض اہلِ زبان شعرائے دہلی سے ہجرت اور لکھنؤ میں قیام کے باعث اہلِ دہلی تقلید کے سلسلے میں لکھنؤ کی جانب متوجہ
ہوئے۔ چنانچہ ناسخ نے جب زبان میں ترک و اختیار کے قواعد منضبط کیے تو دہلی والوں نے بھی انہیں اختیار کیا۔ ہاں
یہ ضرور ہے کہ زبان پر جو قدیم رنگ چڑھا ہوا تھا اسے رفتہ رفتہ ہی ترک کیا جا سکا۔ زبان میں ترک و خراش اور
شستگی و رفتگی کا یہ عمل بتدریج کارفرما رہا۔ غالب کے زمانے تک یہ اصلاحات عام نہ ہوئی تھیں۔ ان کے
بعد کے زمانے میں ان کا زیادہ اثر ہوا۔ چنانچہ نواب مرزا داغ دہلوی نے (جن کی زبان خاص قلعۂ معلیٰ کی
زبان تھی) لکھنؤ کی تقلید میں بہت سے الفاظ ترک کر دیے۔ نظم طباطبائی لکھتے ہیں :-

"دو شخصوں نے اپنے استادوں کی زبان کو ترک کیا اور لکھنؤ کی ترکیب و بندش اور طریق
کو اختیار کیا۔ ان میں اول اصغر علی خاں نسیم شاگردِ مومن، دوم داغ، شاگردِ ذوق" ۲۶؎

ناسخ و آتش کے شاگردوں کے تلامذہ کا دور آیا تو وہ بھی ناسخ ہی کے اصول پر زبان کی درستی کرتے رہے۔
لکھنؤ کے باکمال شاعر سید محمد مصطفیٰ خورشید مرحوم نے "افادات" میں اپنے متروکات کی جو فہرست لکھی ہے اس سے
واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی زبان کی اصلاح ناسخ ہی کے اصول پر کی ہے مثلاً پیار، پیاس با اظہار یائے معروف،
آخرش اشتعال ری، رات و دن، ولیک، ولیکن، نے باشباع بتلانا یاں، واں کو متروک قرار دیا ۲۷؎

۲۵؎ محمد باقر شمس ص ۱۱۵-۱۱۶ لکھنؤ کی زبان (بحوالہ نظم طباطبائی)۔ مطبوعہ ضیا برقی پریس کراچی۔
۲۶؎ ایضاً۔ ص ۱۱۴ / ۲۷؎ ایضاً ص ۱۱۵۔

نواب سید بنیاد حسین جاہ مرحوم نے اپنے دیوان کے مقدمے میں جو اپنے متروکات لکھے ہیں ان سے بھی ناسخ کے اصول کی پیروی ظاہر ہوتی ہے جیسے سیتی، سُبھا، ہر کہیں، خود رفتہ وغیرہ کو متروک قرار دیا ہے اور ان سب سے اکثر کی پیروی اہلِ دہلی نے کی ہے۔ اس طرح لکھنؤ اور دہلی کی زبان تقریباً ایک ہو گئی۔ چنانچہ دہلی کے مشہور انشا پرداز آزاد لکھے ہیں "اب جو زبان دہلی میں بولی جاتی ہے وہ گو یا انہیں (اہلِ لکھنؤ) کی زبان ہے۔" [۴۷]

اس تمام بحث سے اندازہ ہوا کہ ناسخ کی اصلاحات بتدریج اختیار کی جاتی رہیں اور قدیم الفاظ و استعمالات کو رفتہ رفتہ ترک کیا جاتا رہا۔

مضارع کی قدیم صورت آوے، جاوے، کیجے، رہیے وغیرہ دہلی میں قدیم زمانے سے رائج تھی۔ انشا نے اسے شاہجہاں آباد کے اردو والوں کی زبان بتایا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"بعضے صاحبان در صیغۂ حال آن واؤ ما قبل یائے مجہول زیادہ کنند، مانند آوے ہے و لکھوے ہے، و ہووے ہے و رہوے ہے، بجائے آئے ہے و کہے ہے و لیے ہے و رہے ہے۔ ایں زیادتیٔ واؤ اگرچہ کہ زبانِ شاہجہاں آبادیانِ اردو دان است لیکن بغیر واؤ قباحتے نہ دارد۔ و رہے و کہے ہم دور از فصاحت است مگر با حرفِ شرط استعمال آں روزمرۂ فصیحاں باشد۔" [۴۸]

اس اقتباس سے واضح ہے کہ آوے، رہوے اور آئے، رہیے، کہے وغیرہ پہلو بہ پہلو موجود و مستعمل تھے۔ یہاں سے اردو زبان کے ساتھ دکن گئے اور استعمال ہوتے رہے۔ کچھ یہی صورت اسم حالیہ کے ساتھ رہی، اور دیگر صیغوں کے استعمال کی ہے۔

شمالی ہند کے قدیم ترین شاعر (ہندوی، اردو) امیر خسرو کہے جاتے ہیں (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء)، ان کا ایک شعر ہے :-

یا رہنیں دیکھتا ہے سوئے من + بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھ (روٹھا) ہے [۴۹]

---

[۴۷] محمد باقر شمس۔ لکھنؤ کی زبان ص ۱۱۵۔ بحوالہ آزاد۔

[۴۸] ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ جامع القواعد (حصۂ صرف) ص ۲۰۹ بحوالہ انشا۔ دریائے لطافت۔

[۴۹] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۲۵۔ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کا ایک کچھ منذرہ مشہور ہے، اس کا ایک ٹکڑا دیکھیے:

ہمیں ساکی دعرث ہوں۔ ۵۰

شیخ فرید الدین گنج شکرؒ بارھویں صدی کے بزرگ ہیں شیرانی نے "سیر الاولیاء" سے ان کا درجِ ذیل مقولہ نقل کیا ہے:

پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے۔ ۵۱

شوکت سبزواری نے اس قسم کی مثالیں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم اردو میں حال کے لیے عام طور سے اسم حالیہ "ے" اور اس کے تغیرات کے ساتھ استعمال ہوتا تھا اور شاید اردو کا اصلی روپ یہی ہے۔ اس لیے ناسخ نے جاتے ہے اور رکھاتے ہے وغیرہ افعال کو غیر فصیح سمجھ کر چھوڑ دیا"۔ ۵۲

ادبِ اردو کی قدیم مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اردو کی اپنی چیز صرف "اسم حالیہ" ہی ہے، اور اس کے تغیرات کے ساتھ دیگر صیغے ہیں۔ اس حقیقت کے تحریری ثبوت موجود ہیں کہ حالِ مطلق کی موجودہ صورت کے علاوہ، قدیم اردو میں مضارع استعمال ہوتا رہا ہے۔ انشا کا دریائے لطافت میں یہ بیان کرنا کہ یہ شاہجہان آباد کے رہنے والوں کی زبان ہے اور مادے پر یائے مجہول کے ساتھ واؤ کا اضافہ فصیح قرار دینا، اس کا واضح ثبوت ہے کہ یہ صورت اردو میں قدیم سے مستعمل رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انشا "دریائے لطافت" میں اس کا ذکر نہ کرتے۔

شوکت سبزواری نے آدی گرنتھ کے مصنفین کے حوالے سے فعلِ مضارع کے استعمال کی مثالیں نقل کی ہیں ان میں سے چند درجِ ذیل ہیں:-

۱۔ گرو ملے پری منی دستے سبھائی۔ (گرو ملے پر جری من میں بسے)

۲۔ ونوستی گرو پریتی نہ آوے۔ (بناست گرو ایمان نہ آوے)

۵۰۔ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۱۲۵ ۔ اشرف پریس لاہور ۱۹۷۲ء

۵۱۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۲۶ ۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

۵۲۔ ایضاً۔ ص ۳۲۶ ۔

۳- سینے سکھ نہ پاوے۔ (سینے میں سکھ نہ پاوے)

اس قسم کی امثال سے شوکت سبزواری اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ملئے، وسٹے، آوے اور پاوے، سب فعلِ حال کے صیغے ہیں اور ان کا ترجمہ انہوں نے "وسئے" سمجھا تا ہے، "آوے" آتا، "پاوے" پاتا کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس قدیم زمانے میں اسم حالیہ بھی فعل معاون (ہے، ہیں وغیرہ) سے خالی ہے ؎۵۳ شوکت صاحب کا خیال ہے کہ اسم حالیہ اور مضارع، دونوں روپ قدیم ہیں اور قدیم زمانے سے برابر استعمال ہوتے چلے آئے ہیں لیکن ابتدا میں ان پر فعل معاون (ہے) کا اضافہ نہیں کیا جاتا تھا یہ اضافہ بعد میں ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ فعلِ معاون "ہے" کا اضافہ اول اول اسم حالیہ پر ہوا بعد میں فعلِ مضارع پر بھی اسے بڑھا دیا گیا۔ اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے آدی گرنتھ سے مندرجہ بالا مثالوں کے علاوہ خسرو اور احمد دکنی کے دو شعر بھی نقل کیے ہیں۔ خسرو کا مصرعہ ہے :-

خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب ؎۵۴

اور احمد دکنی کا شعر یہ ہے :-

مجھے لوگ کہتے کہ تُو چھوڑ دے پیرت + پیرت چھوڑ دینی کسے ہے سکت ؎۵۵

ماخذ کی بحث

شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ "مضارع" قدیم ہند ایرانی گردانوں کا بقیہ ہے۔ یہ سنسکرت فعلِ حال سے ماخوذ ہے اور پراکرت و اپ بھرنش عہد سے گزرتا ہوا اردو میں آیا ہے۔ اس سلسلے میں مضارع کی گردان پہلے دی جا چکی ہے (سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش روپوں سمیت)۔ اس کے ذیل میں شوکت صاحب وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اپ بھرنش روپوں کی "ہ"، سنسکرت کے قدیم لاحقے "اسی" وغیرہ کے "س" کی نشانی ہے۔ کسی قدیم زمانے میں یہ لاحقے سنسکرت مادوں

؎۵۳ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۳۲۵ ۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

؎۵۴ ایضاً ص ۳۲۵ بحوالہ شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۱۲۷

؎۵۵ ایضاً ص ۳۲۵ بحوالہ اردوئے قدیم ص ۲۲

کے آخر میں جوڑے جاتے تھے۔ بعد میں دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔

ان صیغوں کا ارتقا واضح ہے۔ صرف دو میں کسی قدر الجھن ہے ایک تو اپ بھرنش "چل ءوں" میں سنسکرت اور پراکرت کے "کا" "ءُ" سے بدل جانا بظاہر بعید نظر آتا ہے دوسرے اپ بھرنش "چلیوں" (جمع شکل) سے اردو "چلیں" نہیں بنتا۔

بیمز کا خیال ہے کہ اپ بھرنش "چلئوں" سنسکرت صیغۂ جمع شکل "چلامہ" سے متاثر ہوا ہے۔ چلامہ۔ چلا مُو۔ چلا ؤں۔ چل ءُوں۔ چلوں اور اردو "چلیں"؛ سنسکرت "چلامی" سے چلامی۔ چلا ءُں۔ چلئیں۔ چلیں [56]

ایک صیغے کا دوسرے سے متاثر پذیر ہونا لسانیات میں بہت عام ہے مثلاً "میں" مفرد ہے اور ضمیر جمع سے لیا گیا ہے۔ "ہم" جمع ہے لیکن اس کا ماخذ ضمیر مفرد ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اردو "چلوں" یا اپ بھرنش "چلئوں" "چلامی" سے اس طرح بنے ہوں کہ اول "می" کی "ی" حذف ہوئی اور بعد میں "م" غنہ کر دیا گیا۔ جیسے گرام سے گاؤں اور نام سے ناؤں [57]

اردو مستقبل کے صیغے وہی ہیں جو مضارع کے ہیں۔ ان پر گا، گے اور گی بڑھا دیے گئے ہیں۔ لسانیین کا خیال ہے کہ اردو مستقبل کے صیغے سنسکرت مثلِ مستقبل سے بخت صوتی کے زیر اثر بنے تھے۔ "چلشیتی" پراکرت میں "چلیس سئی" ہوا۔ اس سے اپ بھرنش "چلیسئی" یا "چلیئی" اور پھر "چلے" بنے۔ بعد میں مضارع سے تمیز دینے کے لیے "گا" "علامتِ استقبال" اس پر اور اضافہ کر دی گئی [58]

علامتِ استقبال کے سلسلے میں "س" کے استعمال کا ذکر کرتے ہوئے شوکت صاحب لکھتے ہیں کہ مضارع پر "گا" لگا کر مستقبل بنانے کے علاوہ قدیم اردو میں پراکرت کا تالیفی مثلِ مستقبل بھی تھا لیکن لاحقہ استقبال "س" کو "گا" کی طرح کلمے سے الگ کر کے کسی قدر تحلیلی بنا لیا گیا تھا۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش زبانوں میں فاعلی لاحقے سی، سس یا

---

[56] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۲۰-۳۱۹ بحوالہ بیمز۔ تقابلی گرامر۔ جلد ۳ پارہ ۳۲۔

[57] ایضاً ص ۳۲۱-۳۲۰۔

[58] ایضاً ص ۳۲۱

"س" کے بعد جوڑے جاتے تھے اور مادہ بدستور اپنی حالت پر قایم رہتا تھا۔ مگر اردو میں اصل مادے کو گرا دیا جاتا تھا اور اس پر "س" اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ عام اور مطرد نہ تھا۔ اپ بھرنش کی طرح "س" کے بعد بھی فاعلی لاحقہ دیکھا گیا ہے (جو یا مادے کے علاوہ لاحقے میں بھی مادے کے مطابق تبدیلیاں ہوئیں)۔ شوکت صاحب کا خیال ہے کہ یہ استعمال گجراتی اور دکنی میں تھا شمالی ہند میں اس کی جگہ "گا" مستعمل تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ روپ دکنی اردو میں گجراتی سے آیا ہوگا۔[59]

سکھوں کے گرنتھ میں دو طرح کے مستقبل ملتے ہیں ایک "گا" کے اضافے سے، دوسرا "سا"، "سیں"، اور "سی"، لگا کر۔ جو پراکرت "سامی" (مثلاً "سی"، اور "سیدی"، کے مطابق ہیں۔[60]

"سی"، کا استعمال دکنی و گجراتی اردو میں عام ملتا ہے مثلاً چل سی، پڑسی، کھل سی وغیرہ۔ احمد دکنی کا شعر ہے:۔

کدھیں بیچ سکھ سنگ چل سی نہ منجہ + کدھیں من کمل پھول کھل سی نہ منجہ[61]

"سب رس" میں ہے: ؎ جوں لگن توں سب تے بے طمع نا ہوسی + عشق میں آئے بغیر خاطر جمع نا ہوسی[62]

بحری کا ایک مصرع ہے:۔ گر مرے گا تو نہ پڑسی کام کچھ غسال کا[63]

محمود شیرانی نے "سی"، کا استعمال مستقبل کے تحت لکھا ہے اور بتایا ہے کہ:۔

"یہ مستقبل، امر اور مضارع کے آمیزے سے بنتا ہے۔ جس میں امر اپنی اصلی حالت پر رہتا ہے اور مضارع میں تصریف ہوتی ہے۔"[64]

---

[59] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۲۳۔ ڈی سی پریس۔ ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

[60] ایضاً ص ۳۲۶، بحوالہ ٹرمپ، مقدمہ گرنتھ صاحب ص ۶۰

[61] ایضاً ص ۳۲۳

[62] ملا وجہی۔ سب رس ص ۲۰۔ اسی کا جملہ ہے: "خدا کوں ان نظر سوں دیکھیا نا جاسی، نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر نا آسی" ۱۹۵۰ء

[63] بحری۔ کلیات بحری۔ ص ۱۳۱۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

[64] حافظ محمود شیرانی۔ مقالات حافظ محمود شیرانی (جلد اول) ص ۲۲۳۔ شفیق پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۶ء

گویا یہ مستقبل، امر یعنی 'مادۂ فعل'، (علامت مصدر ہٹا کر جو کچھ باقی بچتا ہے مادۂ فعل کہلاتا ہے اور یہی فعلِ امر صیغہ 'واحد حاضر ہوتا ہے) اور 'سی' کے اضافے سے بنتا ہے اور گردان کرتے وقت 'سی' میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ محمود شیرانی نے "جواہر اسرار اللہ" شاہ علی جیو گام دھنی گجراتی، سے انتخاب کر کے اس فعل کے حسبِ ذیل صیغے لکھے ہیں :۔

کریسو (کرے گا) جاسی (جائے گا) ملاسی (ملائے گا) یہ واحد غائب کے صیغے ہیں۔

واحد حاضر کے صیغے دیکھئے :۔ دیکوسی توں (تو دیکھ سکے گا) توں کرسیں (تو کرے گا)

واحد متکلم کے صیغے :۔ جان نہ دے سوں (جانے نہ دوں گا) دھرسوں (دھرے گا) ملے سوں (ملے گا)

ملوں سوں (ملوں گا) کروں سی (کروں گا) ۶۵

یہ استعمالات گجراتی و دکنی میں یکساں ملتے ہیں۔ ہمارے نزدیک 'یہ سی' علامتِ مستقبل 'گا' کے مقام پر اضافہ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ 'مضارع' کی ایک صورت تھی۔ "جواہر اسرار اللہ" سے شیرانی نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان کا ترجمہ 'گا' کر لیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں 'یہ سی' 'گا' کی جگہ اضافہ کیا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ وہ اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ یہ مستقبل، امر اور مضارع سے مل کر بنتا ہے، امر اپنی جگہ ایک ہی حالت پر رہتا ہے اور مضارع میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ امر اور مضارع سے بننے والا فعل نہیں ہے بلکہ مستقبل ہے ہی نہیں یہ مضارع ہے (اور یاد رہے کہ مضارع بیک وقت حال اور مستقبل دونوں پر محیط ہوتا ہے، صرف سیاق سے اس کے زمانے یعنی حال یا مستقبل سے منسلک ہونے کا پتہ چلتا ہے) جو مادے پر 'سی' علامتِ مضارع بڑھا کر بنایا جاتا تھا چنانچہ "جواہر اسرار اللہ" سے جو مثالیں اوپر نقل کی گئیں ان کا ترجمہ یہ ہوگا :۔

کریسو (کرے) جاسی (جائے) ملاسی (ملائے) دیکوسی (دیکھے) کرسی (کرے) نہ دیسوں (نہ دے) دھرسوں (دھرے) ملے سوں (ملے) ملوں سوں (ملوں) کروں سی (کروں، کروں ہوں)

شیرانی نے لکھا ہے کہ :۔

---

۶۵ حافظ محمود شیرانی۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی ص ۲۳۱۔ شفیق پریس لاہور ۱۹۶۶ء

دوسرا قسم کے مستقبل کے علاوہ جو پنجابی اور اردو میں عام ہے پنجابی میں ایک اور مستقبل ہے

جو 'سی' کی تصریف سے بنتا ہے" ۶۶

اس کا محاکمہ کرتے ہوئے جناب ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں :۔

"پنجابی میں 'سی' کی تصریف سے بننے والے مستقبل کی مثالیں شیرانی صاحب نے الگ کر کے نہیں دکھائیں۔ لاہور کی پنجابی میں آج بھی 'سی' بجائے مستقبل کے 'ماضی مطلق' کے امدادی فعل 'تھا' کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ کہندا سی (کہتا تھا) آیا سی (آیا تھا) ۶۷

اگر اردو (دکنی و گجراتی اردو) میں 'سی' کا استعمال پنجاب اثرات کا نتیجہ ہوتا تو ہمارے خیال میں اپنے اصل معنی سمیت ہوتا لیکن قدیم اردو میں اس کا استعمال ماضی کے بجائے مستقبل اور حال سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہاں شوکت سبزواری کی اس رائے کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 'مضارع پر 'گا' لگا کر مستقبل بنانے کے علاوہ قدیم اردو میں پراکرت کا تالیفی فعل مستقبل بھی تھا لیکن لاحقہ استقبال 'س'، 'گا' کی طرح کلمے سے الگ کر کے کسی قدر تحلیلی بنا لیا گیا تھا۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش زبانوں میں فاعلی لاحقے 'سی'، 'سس'، یا 'س' کے بعد جوڑے جاتے تھے اور مادہ بدستور ایک حالت پر قایم رہتا تھا مگر اردو میں اصل مادے کو گردانا جاتا تھا اور اس پر 'س' اضافہ کر دیا جاتا تھا لیکن یہ عام اور مطرد نہ تھا۔ اپ بھرنش کی طرح 'س' کے بعد بھی فاعلی لاحقہ دیکھا گیا ہے مثلاً 'دھرسوں' جو اپ بھرنش 'دھرسّوں' یا 'دھرسئوں' کے مطابق ہے ۶۸ شوکت صاحب نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ استعمال چونکہ گجراتی اور دکنی میں تھا، جبکہ شمالی ہند میں اس کی جگہ 'گا' مستعمل تھا لہذا قیاس کہتا ہے کہ یہ روپ دکنی اردو میں گجراتی سے آیا ہوگا۔ ۶۹

لاحقہ 'سی' کا استعمال ہندوستان کی کئی زبانوں میں ملتا ہے مثلاً گجراتی، مارواڑی، جیپوری، نیماڑی

---

۶۶ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ جامع القواعد (حصہ صرف) ص ۶۳ بحوالہ شیرانی۔

۶۷ ایضاً ص ۶۳

۶۸ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۲۳

۶۹ ایضاً ص ۲۲۳۔

اور ملتانی ۔ مثالیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں ۔ ملاحظہ کیجیے : ۔

۱ ۔ گجراتی :۔

ہوں مارس ۔ تو مارسے ۔ تے مارسے ۔ ہم ماری سوں ۔ تے مارسو ۔ تیو مارسے ۔

۲ ۔ مارواڑی جیلمیری :۔

ہوں مارس ۔ تو مارس ۔ او مارسے ۔ مہے مارساں ۔ تھے مارسو ۔ او مارسے ۔

۳ ۔ جیپوری :۔

ہوں مارشوں ۔ تو مارشی ۔ او مارشی ۔ مہے مارشاں ۔ تھے مارشو ۔ او مارشی ۔

۴ ۔ نیماڑی : ۔

ہوں مارس ۔ توں مارس ۔ وو مارسے ۔ ہم مارساں ۔ تم مارسو ۔ وو ماروسے ۔

۵ : ۔ ملتانی : ۔

میں مریساں ۔ توں مریسیں ۔ او مریسی ۔ اساں مریسوں ۔ تو ساں مریسو ۔ او مریسن [70]

شیرانی صاحب کے نزدیک "سی" کا استعمال دکنی میں راجپوتانہ سے آیا ہوگا لیکن ابواللیث صدیقی صاحب کے نزدیک چونکہ دکنی کی اور شکلوں میں کہیں راجستھانی کا اثر نظر نہیں آتا لہٰذا یہ قیاس بحث طلب ہے ۔ ہمارے نزدیک یہ استعمال گجراتی یا مارواڑی سے لیا گیا ہوگا ۔ اس کے اثرات اردو کے بعض دوسرے الفاظ و حروف پر بھی نظر آتے ہیں لیکن چونکہ یہ اردو کی اپنی چیز نہ تھا لہٰذا بتدریج متروک ہو گیا البتہ جس زبان سے لیا گیا تھا اس میں باقی رہا ۔ جواہر اسرار اللہ سے جو صیغے اوپر نقل کیے گئے ہیں ان پر گجراتی کا اثر نظر آتا ہے ۔ اردو کا اپنا مضارع مادے پر یائے مجہول اور کہیں واؤ قبل یائے مجہول کے اضافے سے بنتا تھا لہٰذا وہ بعد تک برقرار رہا ۔ چنانچہ چنانچہ مثالوں سے ثابت ہے کہ ناسخ کی اصلاحات کے بعد بھی آوے ، جاوے بالکل متروک نہیں ہو گیا بلکہ بعد تک اس کی مثالیں ملتی رہیں ، اس کے ترک کا سبب یہ نہ تھا کہ یہ اردو کی اپنی چیز نہ تھا بلکہ اس کا سبب زبانِ اردو کا تسہیلی اور اختصار پسند رجحان تھا

---

[70] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔ جامع القواعد (حصۂ صرف) ۔

فعلِ معاون

اردو میں ماضی بعید، فعلِ حال اور فعلِ مستقبل کی گردان کے لیے معاون افعال "تھا" تھے، تھی، ہے، ہو، ہیں، گا، گے اور گی، استعمال کیے جاتے ہیں۔ یعنی اصل فعل پر ان میں سے کسی ایک کا اضافہ (باعتبارِ زمانہ) کیا جاتا ہے مثلاً کھاتا تھا، کھاتا ہے، کھائے گا، کھایا تھا، کھایا ہے وغیرہ۔ ماضی استمراری کی صورت میں کھا رہا تھا وغیرہ۔ قدیم اردو میں اس کے استعمال کے سلسلے میں بہت تھوڑا تغیر دیکھنے میں آتا ہے مثلاً ہے اور تھے پر ایک الف کا اضافہ۔ یا مثال کے طور پر "تھی" کی جمع اتھیں اور اتھیاں وغیرہ۔ مستقبل کے سلسلے میں اس کے سوا کوئی تغیر نہیں ملتا کہ گا، گے، گی کے علاوہ "سی" کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس معاملے میں لسانیین کی آراء اختلافی ہیں بعض نے اسے فعلِ مستقبل کے تحت شمار کیا ہے اور بعض کو اعتراض ہے، ان کے نزدیک یہ امر و مضارع سے ترتیب پانے والی صورت ہے (سی کا استعمال) اس کی بحث "مضارع، حال اور مستقبل" کے باب میں گزر چکی ہے لہٰذا یہاں حذف کی جاتی ہے۔

دکنی اردو میں فعلِ معاون (تھا، تھے، ہے، ہیں) سے قبل الف زائد کا استعمال اس کی دکنی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ شمالی ہند میں اس کا استعمال شاذونادر ہی ملتا ہے۔ دکنی اردو سے کچھ مثالیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔ "کدم راؤ پدم راؤ" کا ایک مصرعہ ہے:۔ (تصنیف ۸۲۵ و ۸۳۹ھ)

جہاں تجھ لیپوا نکھ پیتے اہیں [1]

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" تصنیف ۱۰۱۸ھ کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ اتھے تو، اتھاتو، اتھے کا تیں

۲۔ اپی بیچے آپی خریدار اتھے۔

۳۔ بڑا مرتبا (مرتبہ) سب میں دھرتے اہیں۔

۴۔ رتن یو اتھے دل کیرے کھان میں

۵۔ ملایک جو خدمت کرن آئے تھے۔

---

[1] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی طبع اول ۱۹۷۳ء

۶۔ اٹھاحوض ہوروان اتھیاں سندریاں

۷۔ کہ اچھیاں اہیں یاں کدھر بھی پریاں ؎۲

ملاوجہی کی نثری تصنیف "سب رس" (۱۰۴۵ھ) میں حسب ذیل صورتیں :۔

جملہ ۱ :۔ ظاہر کی صورت تماری (تمہاری) دیکھتے ہیں۔

۲ :۔ ہمیں عبث کہتے تھے ۔

۳ :۔ ہر ایک کام اپے سنبھالتا آتا ہے ۔

۴ :۔ اگر پیچھے (بھی) وجہ مطلق کچھ نا دستا تو ہرگز خدا تھے، کر نا کہتے ؎۳

اس میں "سی" کا استعمال عام ملتا ہے۔ دو ایک مثالیں دیکھیے:۔

۱۔ کیا عورت کیا مرد، جس میں عشق کا کچھ درد، اس کتاب کو سینے پر سے ہلا سی نا، اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت گنوا سی نا ۔

۲۔ مجھے یو کام بغیر آرام نا ہوسی ۔ تا یو کام نا ہوسی ؎۴

قلی قطب شاہ کہتے ہیں:۔

۱ :۔ بادشاہاں کرتے ہیں اپ مل ہر جگہ میں بڑائی

۲ :۔ بندہ نبی کا جم اچھے سچی ہے سلطانی منجے

۳ :۔ تو داس ہور ہیا ہے محمد کے گھر اکاس

حسن شوقی کے بھی چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ جنن کا اتھا صدق صادق یقین

؎۲ ملا وجہی۔ مثنوی قطب مشتری (تصنیف ۱۰۱۸ھ) مرتبہ ۵۰-۲۱ ۱۸-۱۲ ۶-۲ ۱۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی سنہ ۱۹۵۳ء

؎۳ ملا وجہی۔ سب رس (تصنیف ۱۰۴۵ھ) ص ۱۹-۱۴۶ ۸۰-۱۱۸ ۔ انجمن پریس۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

؎۴ ایضاً۔ ص ۱۹۔

۲ ۔ کہ تم نے کم دو جو تر کوں تھے کم

۳۔ سو شمشیرن میں اتا ول اتھے ۵ے

کمال خاں رستمی بیجاپوری نے "خاور نامہ" (ترجمہ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء) میں درجِ ذیل صورتیں استعمال کی ہیں:۔

۱:۔ رکھیا یوں جو ہر ایک کوں رکھنا اتھا

۲:۔ اگر غنچہ لہو دل کا کھایا اتھے

۳:۔ کتیاں کا تراشیا تھا یہی اور سر۔

۴:۔ مارے تھے وہاں بھی یتا کچھ شکار

۵:۔ شُنے (سونے) کیاں شمع جلتیاں تھیاں وان چہار ۶ے

علی عادل شاہ ثانی شاہی کے چند مصرعے دیکھیے:۔

۱:۔ صحن کے چاروں طرف چمن میں اگر چندن کا اتھا کنارہ

۲:۔ بہار سہورہے شم تلے ڈونگر اتھے جب کھڑ بڑے

۳:۔ فرشتیاں بکانہ تھا بھیرا تداں تھا نور سو تیرا

۴:۔ قرن شندر کے جوبن پر سبزہ والا اڑھایا اتھے

۵:۔ جتیاں اتھیاں سب کیاں سکھیاں کئی لاکھ عرفت کرنا ۷ے

ملا نصرتی (م ۱۰۸۳ھ) کے دو مصرعے ہیں:۔

۱:۔ اتھا کن وزیراں میں ایسا امیٹ

۲:۔ دو موذی نہ کچھ جیو کوں ڈرتے اتھے ۸ے

۵ے حسن شوقی ۔ دیوانِ حسن شوقی ۔ مرتبہ جمیل جالبی ۔ انجمن پریس کراچی ۔ طبع اول سنہ ۱۹۷۱ء

۶ے کمال خاں رستمی بیجاپوری ۔ "خاور نامہ" ص ۲۰۴-۳۹-۲۰۲-۲۰۶-۲ ، ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

۷ے علی عادل شاہ ثانی شاہی ۔ کلیاتِ شاہی ۔ ص ۱۴۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۱۷-۱۳۰ ، انجمن ترقی ہند علی گڑھ ، سود پرنٹنگ پریس دہلی

۸ے ملا نصرتی ۔ دیوانِ نصرتی ۔ مرتبہ جمیل جالبی ۔ مطبع توسین لاہور طبع اول سنہ ۱۹۷۲ء جمیل جالبی نے سن وفات ۱۰۸۵ھ لکھا ہے (مقدمہ دیوانِ نصرتی)

دکنی کے کلام میں یہ صورت نہیں ہے لہٰذا مثالیں حذف کی جاتی ہیں۔

شمالی ہند میں، اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہ" تصنیف ۱۱۰۵ھ میں البتہ وہی دکنی اثرات نمایاں ہیں، چنانچہ ان کے چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

۱:۔ دو یتیمیں نکیہ اتھے وہ عجب

۲:۔ خواب میں گویا چاند روشن اتھا

۳:۔ غلاماں پر یک مہار پکڑے جو تھا

۴:۔ دیکھا گو ر کھو دی اتھے یس بشر

۵:۔ پوچھا تبلہ تم کاں گئے تھے ابھی ۹

"تھیاں" اور "اتھیاں"، (فعلِ معاون "تھی" کی جمع مونث) کا استعمال نہیں ملا

حاتم اور تاباں کے یہاں یہ الف زاید ملتا ہے اور نہ ہی فعلِ معاون کی مونث جمع کی صورتیں۔ کربل کتھا میں بھی اور بعد کے دور میں بھی عام صورتیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکنی شاعر ہی میں اور اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی میں الف زاید کا استعمال ضرورتِ شعری کے تحت کیا گیا۔ جہاں اس کی ضرورت نہ تھی (یعنی اس الف زائد کے بغیر شعر کا وزن پورا ہو جاتا تھا وہاں الف حذف کرکے صرف "ہے" اور "تھا" استعمال کرتے تھے) وہاں الف گرا دیتے تھے اور دہلوی اردو کے مطابق بغیر الف کے، تھا، ہے وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ اسی لیے اس قسم کی مثالیں پہلو بہ پہلو درج کر دی گئی ہیں۔

ماخذ

"ہے" سنسکرت "اَس" (ہونا) سے فعلِ حال کا صیغہ واحد غائب ہے۔ یہ اصل میں "اَستی" تھا۔ اَستی۔ اَسے۔ اَہے۔ اور پھر ہے ۱۰ قدیم اردو میں "ہے" کے پہلو بہ پہلو "اہے" کا استعمال ہوتا رہا ہے۔

---

۹ اسمٰعیل امروہوی۔ مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہ ص ۱۳۶-۱۳۱-۱۱۲ ص ۱۱۴ (اردو کی دو قدیم مثنویاں) نقوش پریس لاہور طبع اول ۱۹۶۹

۱۰ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۹۹۔ دکن پبلشرز ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

ڈاکٹر چیٹرجی کا کہنا ہے کہ "اس" سے فعلِ حال "اَستی" ہے۔ جس سے پراکرت "اَتھی" بنا۔ یہ ادبی پراکرت میں مستعمل تھا۔ "اَستی" سنسکرت میں اور "اسئی" پراکرت میں کوئی صیغہ نہیں۔ اردو "ہے"، اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ دوسرے "اَستی" کا "س"، "ہ" سے نہیں بدل سکتا کیونکہ سنسکرت میں "س"، کا "ہ" سے تبادل عام نہ تھا۔ یہ سراسر تکلف ہے کہ "ہے"، جیسے عام اور کثیر الاستعمال صیغے کو "استی"، کی پیداوار بتایا جائے۔

کچھ علما نے "ہے" کو سنسکرت "بھو" (فارسی "بو") سے نکالا ہے۔ ان کے خیال میں "ہے"، اصل میں "بھوتی" تھا۔ بھوتی - ہوتی - ہے - یہ اس کے مختلف مدارج ہیں۔

شوکت سبزواری نے ہوئرنلے کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ بھی خالی از تکلف نہیں۔ اول اس وجہ سے کہ سنسکرت الفاظ کے شروع میں تغیر بہت کم ہوتا ہے [11] دوسرے اس وجہ سے کہ "ہے"، اور "ہوتی"، اردو میں جدا جدا دو صیغے ہیں۔ "ہے"، کھڑی کا ہے اور "ہوتی" برج اور اودھی کا۔ صوتی طور سے بھی یہ مختلف صیغے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے ایک، دوسرے سے ماخوذ نہیں ہو سکتا اور اگر "ہے"، کھینچ تان کر "ہوی"، سے نکال بھی لیا جائے تو اس کے قدیم روپ "اہے"، کا کیا ہوگا۔ [12]

دراصل "ہے"، "بھو" اور "اس"، کے علاوہ ایک اور مادے "ہو" سے وضع ہوا ہے۔ اس کے دو روپ ہیں "ہو" اور "ہے"۔ [13] یہ دونوں روپ پالی میں تھے اور "بھو"، "اس"، کے ساتھ ساتھ ان کی پوری گردان کی جاتی تھی۔ "ہو"، "بھو" سے متفرع نہیں ہوا ورنہ اس سے تخفیفِ صوتی کے زیرِ اثر وجود میں آیا۔ یہ مستقل اور آزاد مادہ ہے اور اتنا ہی قدیم ہے جتنا "بھو"، اور "اس"۔ کسی زمانے میں یہ سنسکرت میں بھی تھا لیکن بعد میں غالباً "بھو"، اور "اس"، نے اسے نکال باہر کیا۔ اس کے دو بڑے قرینے ہیں۔ ایک یہ کہ "ہو"، عبرانی اور کلدانی میں بھی ہے اور وہاں اس کے یہی معنے ہیں۔ دوسرے پالی اور پہلوی میں یہ "ہو"، اور "اس"، کے پہلو بہ پہلو استعمال ہوا ہے۔

---

۱۱ شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا ص ۲۹۹ بحوالہ ہوئرنلے، پارہ ۴۹۴ (۲)

۱۲ ایضاً ص ۳۰۰-۲۹۹

۱۳ "ہے" کی گردان اس طور پر ہے، غائب: وہ ہے، وہ ہیں۔ حاضر: تو ہے، تم ہو۔ متکلم: میں ہوں۔ ہم ہیں۔

پہلوی میں اس کو اس طرح گردانا گیا ہے :-

	مفرد	جمع
غائب :-	ھوات	ھواند
حاضر :-	ھوای	ھوایت
متکلم :-	ھوام	ھوایم

یہ پالی کی مسبِ ذیل تصریف کے مطابق ہے :-

ھوتی - ھونتی - ھوسی - ھوتھ - ھومی - ھوم

"ھو" پہلوی میں "بوتن" سے پالی، جو سنسکرت "بھو" کا بھائی ہے، داخل ہوتا تھا اور عام افعال کی طرح "بوتن" کو ماضی قریب بناتا تھا۔ اردو "ہے"، اس مادے کے دوسرے روپ "ہے" سے لیا گیا ہے۔ اردو میں "ہو" بھی ہے لیکن یہ فعلِ ناقص ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل، ان تمام زمانوں میں اس کی گردان کی گئی ہے۔ ہوا۔ ہوا ہے ہوگا۔ ہوا تھا۔ ہوا ہوگا وغیرہ۔ ان صیغوں میں "ہے" اور "تھا" فعل معاون کے طور پر استعمال ہوئے ہیں "اہے" کا الف یا تو "ھوات" سے لیا گیا ہے یا "اتھا" پر قیاس کرکے بعد میں بڑھا دیا گیا ہے [14]

"تھا" کے ماخذ کے سلسلے میں بھی علمائے لسانیات کا اختلاف ہے۔ شیام سندر اور دھیریندر اسے سنسکرت "ستھا" (ٹھہرنا) سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ وہ سنسکرت مادہ "اس" کے صیغۂ جمع حاضر "ستھ" (تم ہو) کی پیداوار ہے۔

اس پر شیام سندر کو اعتراض ہے کہ اردو "تھا" ماضی کا صیغہ ہے اور مفرد ہے۔ وہ "ستھ" سے، جو فعلِ حال سے جمع کا صیغہ ہے، کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اسے "ستھا" کے صیغۂ واحد غائب (ماضی معروف)، "استھات" (وہ ٹھہرا) سے منحوت مانا جائے۔

---

[14] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۳۰۱ تا ۳۰۰۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

شوکت سبزواری کے نزدیک یہ دونوں اشتقاق حقیقت سے بعید اور خلافِ قیاس نظر آتے ہیں۔ "تھا" بھی "ہو" سے بنا ہے اور ماضی سے واحد غائب کا صیغہ ہے۔ یہ اصل میں "ہوتھا" تھا: "ہو"، بحیثیت صوتی رکن زندہ رہا۔ "تھا" بچ رہا۔ اردو ماگدھی میں "ہوتھا"، "تھا" کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ اس میں غائب، حاضر، متکلم، مفرد اور جمع کا فرق نہ تھا۔ سب کے لیے "ہوتھا" استعمال ہوتا تھا [۱۵] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کلمہ پراکرت عہد ہی میں بطور فعلِ معاون استعمال ہونے لگا تھا۔ "اتھا"، کا الف "ہ" کا قائم مقام ہے۔ دہلی کے قریب بعض دیہات میں "تھا" کی جگہ "تھا" آج بھی بولا جاتا ہے جیسے "گیا تھا" (گیا تھا) یہ "تھا"، "تھا" کا ایک روپ ہے اور اس سے بگڑ کر بنا ہے۔ پنجابی "سی"، غالباً "اسیت" سے ڈھالا گیا ہے۔

بیمز نے "تھا" کو स्थित سے مختصر مانا ہے۔ جو سنسکرت اسم مفعول ستھت (ستھتہ) کا ایک روپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "دیا"، اور "گا" "گر کرتہ" اور "گتہ" سے ماخوذ ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ "تھا" کو "ستھتہ" سے مشتق نہ مانا جائے [۱۶] اس صورت میں اس کے تغیرات یہ ہوں گے:- ستھتہ - تھاہ - تھا - تھیا - تھا۔ پروفیسر محمود شیرانی نے "تاریخ فیروز شاہی" سے سندھیوں کا ایک جملہ نقل کیا ہے اس میں "تھیا" موجود ہے۔ وہ جملہ یہ ہے: برکت شیخ تھیا۔ ایں موا ایک تھا (تھا گا) [۱۷]

"گا" کے باب میں سب متفق ہیں کہ وہ جدید الاصل ہے اور اردو میں مستقبل کے معنے ادا کرنے کے لیے حسب قاعدہ "گم" (جانا) سے وضع کیا گیا تھا۔ سنسکرت فعلِ مستقبل "داسیتی" (وہ دے گا) کی تحلیلِ لغوی اس طور پر کی گئی ہے "دا" (دینا) "سی" (علامتِ استقبال) "تی" (وہ، ~~علامتِ فاعل~~، ضمیر واحد غائب)۔ "سی"، "س"، اور "ی" سے مرکب ہے۔ "س"، مختصر ہے "اس"، (ہونا) کا۔ اور "ی"، "یا" (جانا) کا۔ اس تحلیل کے مطابق "داسیتی" کا لفظی ترجمہ ہے: دینا ہونا جانا وہ۔ یعنی دینے کا اس کی طرف سے ہونا یا دیا جانا۔ اسی نہج پر اردو بولنے والوں نے بھی

---

[۱۵] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۰۱۔ بحوالہ وولنر۔ مبادی پراکرت حاشیہ ص ۱۶۱

[۱۶] ایضاً ص ۳۰۲ تا ۳۰۱ بحوالہ بیمز جلد ۳۔ ص ۲۰۹

[۱۷] اردوئے قدیم کے مطالعے سے بھی یہ امر واضح ہے کہ بعض مقامات پر "تھیاں"، اور "تھیاں"، بھی استعمال ہوا ہے جو صیغۂ جمع مونث ہے

جانے کے ایک روپ "گم" سے یہ کام لیا۔ "گا" اصل میں "گتہ" (گیا ہوا) تھا۔ یہ مصدر "گم" کا اسم مفعول ہے۔ گتہ۔ گاہ۔ گا۔ یہ اس کی کڑیاں ہیں۔ "دے گا" کا لفظی ترجمہ "دینا گیا ہوا" ۱۸

"دے" کی قدامت کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے میں دستیاب ادب سے شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے الفاظ اور اشعار دیکھیے:۔

ایک موقع پر شیخ فریدؒ نے فرمایا: اگر آنکھ آئی ہے ایں راچہ بستہ اید ۱۹

اسی طرح ان کی نظم جس کے دو شعر درج ذیل ہیں، اس کی ردیف "دے" ہے "اے"، ہمیں دیکھنے میں نہیں آیا۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے ٭ خیز دراں وقت کہ برکات ہے ۲۰

عشق کا ر سوز نیارا ہے ٭ جز مرد دلیر کے نہ چارا ہے ۲۱

اسی طرح ان کے یہاں "اتھا" کی جگہ "تھا" ملتا ہے۔ مثلاً یہ مصرع دیکھیے:۔ گوسٹی جو پایا کوئی سو اصل تھا ۲۲
شیخ فرید الدینؒ گنج شکر کی وفات ۶۶۴ ہجری میں ہوئی۔ اس اعتبار سے "دے" اور "تھا" (بغیر الف زائد) کے استعمال کی یہ قدیم ترین مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔

شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) کا مصرع ہے: یہ فیتنی کیا کس ملتی ہے ۲۳ اسی طرح شاہ میراں جی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ) کی نثر سے چند جملے ملاحظہ کیجیے:۔

۱۔ پیغمبر کہے جے کچھ (کچھ) کام کرے گا کوئی خدا کا نانوں لے کر تو او کام پائمال ہوے گا ۲۴

۱۸۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۰۲ (بحوالہ بنڈارکر ص ۱۲)

۱۹۔ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۳۰ (بحوالہ جواہر فریدی ص ۲۰۸)

۲۰۔ ایضاً ص ۳۱

۲۱۔ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۱۱۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۷ء

۲۲۔ ایضاً ص ۱۱

۲۳۔ ایضاً ص ۳۳ / ۲۴۔ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵۵ بحوالہ رسالہ "مرغوب القلوب"

۲۔ سر انا نور زنا خدا کوں بہوت کم او یا النہار رہے عالم کا۔

۳۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ کہے خدا کی آشنائی جے کوئی بوجتا ہے انگلیاں توں رہ کر الوں تجے بوج۔

۴۔ خدا کہیا "تحقیق مال اور بچڑے تمہارے دشمن ہیں"۔ [۲۵]

شاہ برہان الدین جانم، حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ ان کی نثر سے کچھ نمونہ یہاں دیا جاتا ہے:

۱۔ جدھاں کچھ نہیں تھی تھا تہیں، دوجا شریک کوئی نہیں۔

۲۔ یہ تن الا دھا دِستا، ولیکن جیتا ہکار لوٹتے نہیں بلکہ سنتر ہکار روپ دِستا ہے۔ [۲۶]

شاہ امین الدین اعلیٰ (م ۱۰۸۶ھ)، شاہ برہان الدین جانم کے فرزند اور جانشین ہیں۔ ان کی نظم و نثر دونوں میں "ہے"، اور "ہیں"، بغیر الف زاید، استعمال ہوا ہے مثلاً یہ مصرع:۔ راہِ صراط پل جوں سر مانگ جو چھیں ہے۔

انہی کی نثر کا بھی نمونہ دیکھیے:۔

امین شاہد کہتے ہیں۔ یہ دونوں ذات کے دو طور ہیں۔ ذات نے اپس کو دیکھا اسے نظر کہتے ہیں۔

دیکھو گواہی دیا اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔ [۲۷]

سید میراں حسینی شاہ (م ۱۱۰۷ھ)، شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔ ان کی نثر سے چند جملے یہاں نقل کیے ہیں:۔

سوا ئے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نوا ز نہار رہا ہے اور اس کا اجالا جا النہار رہا ہے۔ ولے اس کا

محبت اسے ڈگرانا ہے یعنی معشوق کا محبت عاشق کو گھلاتا ہے اس کے فراق میں۔ [۲۸]

ایسے نمونوں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً "ہے"، "ہیں" اور "تھا" بغیر الف زاید، زیادہ قدیم ہے اور الف کا اضافہ ضرورتِ شعری کے سبب کرتے ہوں۔ نثر بول چال کی زبان کے زیادہ قریب ہوتی ہے اور نثر میں الف زاید کی موجودگی مفقود ہے۔

---

[۲۵] مولوی عبدالحق - اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۵۵-۵۶، بحوالہ رسالہ مرغوب القلوب۔

[۲۶] ایضاً ص ۶۶۔

[۲۷] ایضاً ص ۶۶۔

[۲۸] ایضاً ص ۶۶۔

علامتِ فاعل "نے" کا مطالعہ

اردو قواعد کی رو سے 'نے'، فاعلی علامت ہے۔ قدیم اردو ادب میں اس کا استعمال کس طور پر ہوا ہے
یہ دیکھنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ان علمائے لسانیات کی رائے پہلے پیش کر دی جائے جو
اب سے پہلے اس کے استعمال کی تحقیق کر کے ایک نظریہ قائم کر چکے ہیں۔ اس ذیل میں کئی نام آتے ہیں مثال کے
طور پر جارج گریرسن، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری وغیرہ

جارج گریرسن کا کہنا ہے کہ 'نے'، کے استعمال کے تحو اثر سب سے پہلے سنہ ۱۷۷۸ء میں مرتب ہو گئے [۱]
جب کہ مولوی عبدالحق نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ "'نے'، فاعل کی علامت کے طور پر قدیم ہندی میں کہیں
استعمال نہیں ہوا ..... اس کا استعمال اس طور پر غالباً اس وقت شروع ہوا ہے جب کہ اردو نے
اپنا سکہ جمایا ہے" [۲] گویا ان کے نزدیک 'نے'، کا فاعلی علامت کے طور پر استعمال اس زمانے
کی بات ہے جب اردو بول چال کی زبان کے طور پر قبولِ عام کی سند پا چکی تھی۔ اس سلسلے میں حافظ
محمود شیرانی نے ایک نسبتاً مختلف بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "دکنی 'نے'، کے استعمال میں بالکل بے قاعدہ
ہے۔ اس زمانے میں وہ فاعل اور مفعول دونوں کے لیے آتا ہے" [۳] اس طرح شیرانی نے
گریرسن اور مولوی عبدالحق کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے 'دکنی' میں 'نے' کے وجود کو تسلیم تو
کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا ہے کہ 'دکنی' میں 'نے'، صرف 'فاعل' کے لیے نہیں 'مفعول' کے لیے بھی
استعمال ہوتا رہا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ قدیم ہندی تو کیا،
اردو ادب میں بھی اس کا وجود نہیں۔ لکھتے ہیں: "قدیم ہندی یا اردو ادب میں 'نے'، علامتِ فاعلی
کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا" [۴]

۱۔ جارج گریرسن۔ جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۸۹۴ء

۲۔ مولوی عبدالحق۔ قواعدِ اردو۔ ص ۱۸۴ مطبوعہ جی الیف پریس لاہور۔

۳۔ حافظ محمود شیرانی۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد اول) ص ۲۲۹ مطبوعہ شفیق پریس لاہور سنہ ۱۹۶۶ء

۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو۔ ص ۱۶۱، مطبوعہ مطبعِ عالیہ لاہور، پہلا پاکستانی ایڈیشن سنہ ۱۹۶۶

مذکورہ بالا لسانیین کی آراء سے مجموعی طور پر جو نظریہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ قدیم ہندی یا اردو ادب میں "نے" موجود نہیں تھا۔ شیرانی کے خیال میں یہ حرف دکنی میں موجود تھا اور بڑی بے قاعدگی سے استعمال ہو رہا تھا یعنی فاعل کے ساتھ بھی اور مفعول کے ساتھ بھی۔ گویا ان کے نزدیک اس وقت یہ امر متعین نہیں ہو پایا تھا کہ یہ "نے" علامتِ فاعل ہے یا علامتِ مفعول۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا جہاں تک تعلق ہے، ممکن ہے انہوں نے اپنا نظریہ قایم کرتے ہوئے "دکنی" کو قدیم اردو ادب میں شامل نہ کیا ہو اور ان کی مراد صرف شمالی ہند کے اردو ادب سے رہی ہو۔ تاہم یہ کہنا درست نہیں کہ شمالی ہند کے قدیم اردو ادب میں "نے" سرے سے استعمال ہی نہیں ہوا۔ شمالی ہند میں "اردو" (ہندی، کھڑی) کے قدیم ترین شاعر امیر خسرو ہیں۔ ان کا زمانہ تیرھویں صدی کا نصف آخر اور چودھویں صدی کا ربع اول یعنی $\frac{725}{1325}$ ہے۔ ان کا ہندی کلام عام طور سے دستیاب نہیں ہوتا لیکن جو کلام دستیاب ہوا ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ ان کا نہیں، ہم اسے ان کے کلام کے طور پر تسلیم کر سکتے ہیں اور اس سے لسانی نتائج نکال سکتے ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے ان کے نام سے ایک غزل اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں نقل کی ہے۔ اس میں یہ شعر بھی ہے:

میرا جو من غم نے لیا، تم نے اٹھا غم کو دیا

غم نے مجھے ایسا کیا، جیسا پتنگا آگ پر [۶]

اس شعر میں تین جگہ "نے" استعمال ہوا ہے اور بالکل موجودہ قاعدے کے مطابق۔ یعنی فاعلی علامت کے طور پر۔

محمد افضل جھنجھانوی سولھویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں۔ جھنجھانہ، ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا زمانہ اور اردو کے قدیم شاعر وجہی کا زمانہ ایک ہے۔ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق افضل نے ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا۔ ان کی ایک مشہور نظم "بارہ ماسہ" یا "بکٹ کہانی" ہے۔ شیرانی نے اس کا طویل اقتباس "پنجاب میں اردو" میں نقل کیا ہے۔ اس میں ایک شعر یہ بھی ہے:۔

---

۵ ـ یہ خیال اس لیے ہوا کہ مسعود حسین خاں نے گجراتی اور دکنی میں "نے" کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "نے گجراتی میں علامتِ مفعول کے طور پر قدیم زمانے سے مستعمل ہے جب کہ دکنی میں "نے" قدیم زمانے سے علامتِ فاعلی اور مفعولی دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔" مقدمہ تاریخ زبان اردو ط ۱۹۱۔

۶ ـ حافظ محمود شیرانی ـ پنجاب میں اردو۔

پیارے کر بچھڑ کر سوں لگائی
تمامی آگ تن من کی بجھائی ۷؎

اس میں بھی "نے" موجود ہے اور فاعلی علامت کے طور پر ہی ہے ۔

چندر بھان برہمن، عہد شاہجہانی کا ایک مشہور فارسی شاعر ہے ۔ پنڈت کیفی کا خیال ہے کہ سب سے پہلے شمالی ہند میں اردو میں غزل اسی نے کہی ۔ اس غزل کا مطلع ہے :

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے ۸؎

یہاں بھی "نے" استعمال ہوا ہے اور بطور علامت فاعل آیا ہے ۔

اسمٰعیل امروہوی بھی شمالی ہند کے قدیم شاعر ہیں ان کی دو مثنویاں دریافت ہوئی ہیں ۔ پہلی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہ" ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳ء کی تصنیف ہے ۔ اس کا ایک مصرع ہے :۔

جو آواز ہاتف نے دی سن امیر ۹؎

دوسری مثنوی "معجزۂ انار" پہلی مثنوی کے پندرہ برس بعد کی تصنیف ہے یعنی ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء کی ۔ اس میں بھی "نے" کا استعمال ملتا ہے جو موجودہ قواعد کے عین مطابق ہے ۔ اس مثنوی کا ایک مصرع ہے :۔

خدا نے حسن بہوت (بہت) دیتا جمال ۱۰؎

شاہ حاتم، بارھویں صدی ہجری کے شاعر ہیں (م ۱۱۹۷ھ) ۔ ان کے یہاں بھی "نے" کا استعمال قاعدے کے مطابق ہے ۔ ان کا ایک مصرع ہے : ڈھونڈا سبھی پہ ہم نے نہ پایا یا انہوں کا کھوج ۱۱؎

۷؎ محمود شیرانی ۔ پنجاب میں اردو ص ۲۹ بحوالہ محمد افضل جھنجھانوی "بارہ ماسہ" یا "بکٹ کہانی"

۸؎ عباد اللہ گیانی ۔ گرو گرنتھ اور اردو ۔ سویرا آرٹ پریس لاہور ۔ سنہ ۱۹۶۶ء

۹؎ اسمٰعیل امروہوی ۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں ۔ مرتبہ نائب حسین نقوی ۔ نقوش پریس لاہور ۔ طبع اول دسمبر ۱۹۶۹ء

۱۰؎ ایضاً ۔

۱۱؎ شاہ حاتم ۔ شاہ حاتم، حالات و کلام ۔ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار ۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۷ء

اسی طرح درد، سودا، میر وغیرہ کے یہاں بھی "نے" موجود ہے اور فاعلی علامت کے طور پر ہے۔

شمالی ہند میں اگر اردو کے صرف قدیم ترین ادب کو لیں تو سنت سادھوؤں وغیرہ کا کلام ملتا ہے۔ امیر خسرو کی ایک آدھ غزل، پرتھی راج کے کچھ فرامین، چند بردائی کی تصنیف "پرتھی راج راسا" وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سنت سادھوؤں میں کبیر کا نام بہت مشہور ہے۔ کبیر کا زمانہ چودھویں صدی کا آخری یا پندرھویں صدی عیسوی کا پہلا چوتھائی حصہ بتایا گیا ہے [۱۲]۔ ان کے کلام کا جو نمونہ سہیل بخاری نے "اردو کی کہانی" میں نقل کیا ہے اس میں یہ مصرع بھی ہے: مال جنہوں نے جمع کیا سوداگر ہمارے جاتے ہیں۔

ناگری پرچارنی سبھا نے پرتھی راج کے شاہی پروانوں کا پتہ لگایا ہے۔ ان پروانوں (فرامین) سے پرانی کھڑی بولی کی شکل جھلکتی ہے۔ بارھویں صدی کے ایک پروانے میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں: "تم نے کاکا جی کے دوائی ۲ رام جیتو۔" [۱۳]

اس کے بعد چند بردائی کی تصنیف "پرتھی راج راسو" کو لیجیے۔ ہندی کے سب سے پہلے اور بڑے شاعر ہونے کا فخر چند بردائی (۱۱۵۹ء تا ۱۱۹۲ء) کو حاصل ہے۔ یہ دہلی کے آخری ہندو راجہ، پرتھوی راج کا دوست، وزیر اور درباری شاعر تھا۔ "پرتھی راج راسو" ڈھائی ہزار صفحوں کی ضخیم کتاب ہے۔ قدیم زمانے میں جتنے بھی چھند (بحریں) رائج تھے وہ سب اس میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کی قدامت و اصلیت کے بارے میں محققین نے اختلاف آرا کا اظہار کیا ہے۔ گریرسن اس کی قدامت تسلیم کرتے ہیں تو ڈاکٹر بولر اسے فرضی قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف پنڈت موہن لال وشنو لال پنڈیا مختلف دلایل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ چند کی اصل تصنیف ہے تو دوسری جانب جودھپور کے مراری دھن اور اودے پور کے شیامل داس نے اس کے خلاف مضامین لکھے۔ رائے بہادر پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے نہایت مضبوط دلایل کے ذریعے اس کتاب کو جعلی قرار دیا ہے اگرچہ اس کے بعض حصوں کی قدامت کے وہ بھی منکر نہیں لیکن پنڈت ہر پرشاد شاستری جیسے زبردست عالم (جنہوں نے

۱۲؎ ڈاکٹر سہیل بخاری۔ اردو کی کہانی ص ۱۶۰۔ مطبوعہ منظور پریس لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۱۳؎ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ص ۸۰۔ مطبع عالیہ لاہور ۱۹۶۶ء

راجپوتانہ میں قدیم کتب کی کھوج میں کئی سال گنوائے ہیں) اسے قدامت کی سند دیتے ہیں۔ البتہ پروفیسر شیرانی، شیامل داس جی کی رائے کو مستند مان کر "راسو" کو مشتبہ تصنیف قرار دیتے ہیں [۱۴]۔ ان کے خیال میں یہ سولہویں یا سترھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ ابھی تک کسی مورخ نے بھی "چند" کو سولہویں یا سترھویں صدی عیسوی کا شاعر نہیں بتایا ہے۔ تاریخ کی ہر کتاب میں پرتھوی راج اور چند کا ذکر ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ چند اگر سولہویں یا سترھویں صدی کا شاعر ہوتا تو سورداس اپنا سلسلۂ نسب اس سے نہ ملاتے۔ سورداس اپنے اور اس کے درمیان کئی پیڑھیوں کا فرق بتاتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ "چند" ان سے بہت پہلے گزرا ہوگا۔ لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو خود اس تصنیف کے اندر بعض ایسی لسانی اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں جن کو ابھی تک رد نہیں کیا جا سکا۔ اس کی زبان کا جہاں تک تعلق ہے یہ کبھی نئی زبان کے سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی ہے اور کہیں پراکرت اور اپ بھرنش کی قدیم روایات میں جکڑی ہوئی ہے [۱۵]۔ "راسو" کے ان حصوں کو جو پراکرت اور اپ بھرنش کی قدیم روایات لیے معلوم ہوتے ہیں، ہم لسانی نتائج نکالنے کے لیے بدرجۂ مجبوری استعمال کر سکتے ہیں۔ علامتِ فاعلی کے طور پر "نے" کا قدیم استعمال کیا رہا ہوگا، "راسو" کے درج ذیل شعر سے اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے:۔

بیٹھن حکم راجانِ کیے + کری سلام بہتو نرپے [۱۶]

اس شعر کے پہلے مصرعے میں "راجان" بمعنی "راجانے" ہے۔ یہ "ن" بطورِ علامتِ فاعل ہے۔ یہ گویا "نے" کی قدیم شکل ہے جو چند کے زمانے میں مستعمل رہی ہوگی۔ اگر اسے سولہویں یا سترھویں صدی عیسوی کی تصنیف مان بھی لیا جائے تو اس کی کیا توجیہہ ہوگی کہ پرتھی راج راسو ہی میں "نے" کی یہ شکل ملتی ہے جو اس کی قدامت کی دلیل ہے جب کہ سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی کی کسی دوسری تحریر میں حرف "ن" بطورِ علامتِ فاعل نہیں

۱۲۳

۱۴ اس سلسلے میں شیرانی نے تنقید پرتھی راج راسا میں بہت سے تاریخی دلائل پیش کیے ہیں۔ دیکھیے پرتھی راج راسا" انجمن ترقی اردو ہند

۱۵ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو ص ۷۵ تا ص ۷۷۔ مطبع عالیہ۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۶۶ء

۱۶ پروفیسر حافظ محمود شیرانی۔ پرتھی راج راسا (مطالب و تنقید و تبصرہ) ص ۱۹۱، بحوالہ پرتھی راج راسو، چھند ۱۳۰، ۲

ملا۔ اگر سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی میں یہ استعمال عام ہوتا تو ضرور اس کے کچھ نہ کچھ نمونے سولھویں سترھویں صدی عیسوی کی تحریروں میں ملتے۔

ہندی (اردو) کے اس قدیم ترین نمونے میں علامتِ فاعلی کے طور پر "ن" کا لاحقے کی صورت میں استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ قدیم ہندی کے دور میں بھی "نے" موجود تھا یہ الگ بات ہے کہ اس کی شکل (ہمارے نزدیک اسے "املا" کہیں تو مناسب ہوگا) موجودہ شکل سے مختلف و مختصر تھی۔ "نون" کو فاعلی علامت ماننے کا جہاں تک تعلق ہے، شوکت سبزواری کی رائے سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اپنی کتاب "لسانی مسائل" میں "نے" کے استعمال سے بحث کرتے ہوئے شوکت صاحب لکھتے ہیں کہ "اصل علامت "ن" ہے۔ "نا" اور "نے"، اس کے دو روپ ہیں"۔[۱۷]

شمالی ہند کے اردو ادب کے اس جائزے سے واضح ہے کہ یہاں فاعلی علامت کے طور پر "نے" کا استعمال اس وقت سے موجود و مستعمل رہا ہے جب سے ادب کے تحریری نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہاں اس کے دو روپ "ن"، "نا" اور "نے"، ملتے ہیں۔ اس سے جہاں اس خیال کا بطلان ہوتا ہے کہ قدیم ہندی یا اردو ادب میں "نے" فاعلی علامت کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا، وہاں اس نظریے کی بھی خود بخود تردید ہو جاتی ہے کہ "نے" کا استعمال اس طور پر (علامتِ فاعلی کے طور پر) غالباً اس وقت شروع ہوا ہے جب کہ اردو بنا سنوارا جا رہا ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی نادرست قرار پاتی ہے کہ "اس کے استعمال کے قواعد سب سے پہلے ۱۷۴۸ء میں منضبط ہوئے"۔ حقیقت یہ ہے کہ فاعلی علامت کے طور پر "نے" کے استعمال کے قواعد کا انضباط اٹھارویں صدی عیسوی سے منسوب کرنا صحیح نہیں۔ اس کے انضباط کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کا قاعدہ ٹھیک موجودہ طریق پر شروع ہی سے موجود و مستعمل تھا۔ جس کا ثبوت ہمیں قدیم نمونوں سے مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے جو نظریہ قائم کیا ہو سکتا ہے اس کی بنیاد انہوں نے مولوی عبدالحق کے قول پر رکھی ہو اور مولوی عبدالحق نے اس بارے میں گریرسن کی رائے کو اہمیت دی ہو۔ اس مسلسل استفادے ہی نے اس گمراہی کو جنم دیا کہ فاعلی علامت کے طور پر قدیم ہندی

۱۷۔ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل مضمون بعنوان "نے" کی سرگزشت"، صـ ۶۹، حاشیہ۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۶۲ء

"نون" کا فاعلی علامت ہونا اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ اسم فاعل باضافۂ "نون" بنایا جاتا تھا جیسے من موہن (دل موہ لینے والا)، من ہرن (دل چرانے والا) من بھاون (من کو بھا جانے والا)۔ اس قسم کے اسم فاعل قدیم اردو میں بہت عام ہیں۔

میں "نے" موجود نہیں تھا۔ اس پر مزید اضافہ کرنے کے لیے مسعود حسین خاں نے یہ انوکھا انکشاف کیا کہ قدیم ہندوی کی
کجا، خود قدیم اردو ادب میں بھی اس کا وجود نہیں ملتا۔ اپنے پیشروؤں کے خیال کو بلا تحقیق قبول کر لینا اور نہ
صرف تائید بلکہ اس پر بلا تحقیق اضافہ، مناسب بات نہیں۔ ضرور تھا کہ دلائل و شواہد سے تائید و تصدیق کی جاتی
نیز یہ بھی واضح کیا جاتا کہ قدیم اردو ادب کا دائرہ ان کے نزدیک کہاں تک ہے۔ بہرحال، شمالی ہند کے دستیاب اردو
ادب کا جائزہ سطور بالا میں پیش کیا جا چکا ہے اور چونکہ دکنی و گجراتی دور بھی اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا
ذیل میں اس کے دستیاب ادب کا مطالعہ مقصود ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دکنی اور گجراتی اردو میں "نے" کا
وجود تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو یہ بطور علامت فاعل تھا یا مفعولی حالت کا اظہار کرتا تھا، یا یہ کہ فاعلی اور
مفعولی دونوں حالتوں میں مستعمل تھا؟ جیسا کہ شیرانی کے نظریے سے ظاہر ہے۔

قاضی محمود بحری ولی دکنی کے معاصر ہیں، عہد اورنگ زیب کے شاعر ہیں۔ ان کا ایک مصرع ہے:-

اے سکھین میں نے دیکھیا سنگ کر کے یار کا [18]

اس میں "نے" موجود ہے اور فاعلی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ بعض اوقات "نے"
محذوف ہوتا تھا، اس کے علاوہ جہاں کہیں "نے"، استعمال ہوا ہے قاعدے کے مطابق ہوا ہے۔ ولی سے قبل نصرتی
(م ۱۰۸۳ھ) کے یہاں "نے" کا استعمال دیکھیے: طبیعت حق نے بخشی ہے نکی کوں قدر نئیں ذرہ [19]
ان سے قبل امین الدین اعلیٰ (م ۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء) کی نثر کو لیجیے۔ مولوی عبدالحق نے ان کی نثر سے کچھ اقتباس اپنی کتاب
"اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں نقل کیا ہے۔ اس کا ایک جملہ یہ بھی ہے: "ذات نے اس
کو دیکھا اسے نظر کہتے ہیں۔" [20] ابن نشاطی ایک اور دکنی شاعر ہے جس نے ۱۰۷۶ھ میں اپنی مشہور
مثنوی "پھول بن" لکھی۔ اس کا ایک مصرع یہ بھی ہے: جتنے دو حرف میں ظاہر کیا اسرار پنہانی۔ یہاں "جتنے"

18۔ قاضی محمود بحری۔ کلیات بحری (مع مقدمہ و تشریح) مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حنیف۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔
19۔ ملک الشعرا ملا نصرتی۔ دیوان نصرتی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبع قوسین لاہور۔ طبع اول سنہ ۱۹۷۲ء
20۔ مولوی عبدالحق۔ "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

درا صل جنؔ اور نےؔ ، ب - نون کا یہ ادغام اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ سید شاہ ہاشم علوی بیجا پوری (م ۱۰۵۹ھ) نے بھی اسی طرح استعمال کیا ہے: ہاشم جی کی سنئے بات ٭ جنے رکھی باسی بھات [۲۱]

کمال خاں رستمی بیجا پوری شاعر ہے۔ اس نے فارسی "خاور نامہ" کا اسی عنوان سے دکنی اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۰۵۹ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کا ایک مصرع یہاں نقل کیا جاتا ہے: -

مار یا پنجہ بھی شیر نے گاؤ پر۔ [۲۲]

یہ نےؔ، بھی قاعدے کے مطابق ہے -

عادل شاہی دورِ حکومت کا مشہور فرمانروا علی عادل شاہ ثانی شاہی نہ صرف شعر و ادب کا دلدادہ تھا بلکہ خود بھی شعر کہتا تھا (دورِ حکومت، ۱۶۵۶ تا ۱۶۷۲ء)۔ اس کا کلام بھی نےؔ، کے استعمال سے خالی نہیں ایک مصرع ہے: لیا شہ نے قلعہ کوں تل میں رگڑ۔ [۲۳] حسن شوقی، قطب شاہی دور کا مشہور شاعر ہے اس کا زمانہ ۹۲۸ تا ۱۰۲۲ھ بتایا جاتا ہے۔ اس کے یہاں بھی نےؔ، کا استعمال فاعلی علامت کے طور پر ہوا ہے جیسے یہ مصرع: - دیا تھا خدا نے جنن کوں شجاعت [۲۴]

دکنی فرمانروا قلی قطب شاہ (دورِ حکومت ۹۷۳ تا ۱۰۲۰ھ) اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے اس کے یہاں بھی نےؔ، کے استعمال میں بے قاعدگی نہیں۔ اس کا ایک مصرع ہے: -

جنے کامل کیا ہے دین اپنا [۲۵]

شہاب الدین قریشی کی "بھوگ بل" قدیم تصانیف میں سے ہے - یہ ۱۰۲۳ھ میں، حیدرآباد دکن میں لکھی گئی۔ اس میں نےؔ، کا استعمال دیکھئے ع خدا نے قریشی کوں فرصت دیا [۲۶]

---

[۲۱] شمس اللہ قادری - اردوئے قدیم ص ۳۵ - مطبع نولکشور لکھنؤ - سنہ ۱۹۳۰ء

[۲۲] کمال خاں رستمی بیجا پوری - خاور نامہ - ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

[۲۳] علی عادل شاہ ثانی شاہی - کلیاتِ شاہی - مسعود پرنٹنگ پریس دہلی - مطبوعہ سنہ ۱۹۶۲ء

[۲۴] حسن شوقی - دیوانِ حسن شوقی - مرتبہ جمیل جالبی - انجمن پریس کراچی - طبع اول سنہ ۱۹۷۱ء

[۲۵] قلی قطب شاہ - کلیاتِ قلی قطب شاہ - مرتبہ سید محی الدین قادری زور - اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۰

[۲۶] شہاب الدین قریشی - بھوگ بل - مخطوطہ نمبر ۱/۱۸ - نیشنل میوزیم - کراچی۔

ملا وجہی ایک اور دکنی شاعر ہے۔ اس نے ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے شاعری میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ اور گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعرا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور کے اردو شعراء میں وجہی سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا۔ اردو نثر میں وجہی کی دو کتابیں اب تک دستیاب ہو چکی ہیں۔ "سب رس" اور "تاج الحقائق"۔ "سب رس" بہت مشہور تصنیف ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں، ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں قلم بند ہوئی۔ اس کتاب سے "نے" کے استعمال کے سلسلے میں چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ "ان نے سینا کہ دل اتال جاتا ہے۔" یہ استعمال قواعد کے مطابق ہے۔

۲۔ "غمزے نے نظروں اپنے گھر لے کر گیا۔" یہاں "نے" زائد اور بلا ضرورت معلوم ہوتا ہے لیکن بہر حال غمزے کے فاعل ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی فاعلی علامت کے طور پر ہی ہے، اسے مفعولی نہیں کہہ سکتے۔

۳۔ "بے نمک کھانے تے آدمی نے کیا سواد پانا۔"[۲۷] یہاں "پانا"، فعلِ مجہول ہے، اور اس کا فاعل "آدمی" آلی حالت میں ہے۔ موجودہ اردو میں اس موقع پر "نے" نہیں لایا جاتا البتہ جس زبان نے اردو کو بالواسطہ طور پر متاثر کیا ہے اس میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ سنسکرت میں فعلِ مجہول کی صورت میں ہی فاعل کا ذکر کیا جاتا تھا اور فعلِ مجہول کا یہ فاعل آلی حالت میں ہوتا ہے۔ سنسکرت میں اس کی علامت "ین" ہے۔ جیسے رامین، یعنی رام نے۔ یعنی رام کے ذریعے اور اس کے واسطے سے[۲۸] اس لحاظ سے "سب رس" میں "نے" کا یہ استعمال صحیح ہے۔ "سب رس" کے دو ایک جملے اور دیکھیے:-

۱۔ پادشاہاں نے دنیا کا حظ چھوڑے خلق کا دل توڑے۔

۲۔ اس خاطر زلیخا نے کیا کری۔[۲۹]

ان دونوں جملوں میں "نے" فاعلی علامت کے طور پر ہی ہے نہ کہ مفعولی۔ البتہ حرفِ عاملہ کے طور پر اس کا اثر

---

[۲۷] ملا وجہی۔ سب رس۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۴۷ء

[۲۸] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ص ۲۲۵، دی کے پریس ڈھاکہ۔ طبع اول سنہ ۱۹۵۶ء

[۲۹] ملا وجہی۔ سب رس۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۴۷ء

نظر نہیں آتا۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کر کے، مفعول کے ساتھ قایم کر دیتا ہے لیکن مندرجہ کے دونوں جملوں میں فعل کا تعلق بدستور اپنے فاعل کے ساتھ ہے، چنانچہ فاعل واحد مونث ہونے کی صورت میں فعل بھی واحد مونث ہے اور فاعل جمع مذکر کی مطابقت میں فعل جمع مذکر آیا ہے۔ تاہم اس "نے" کو مفعولی ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ یہ فاعلی علامت ہی کے طور پر ہے اور فاعل کی فاعلیت ظاہر کر رہا ہے۔ (موجودہ قواعد کی رو سے جب فاعل پر "نے" داخل کیا جاتا ہے تو فعل جنس و عدد میں مفعول کی مطابقت کرتا ہے نہ کہ فاعل کی)۔ "نے" کا اس قسم کا استعمال "معراج العاشقین" [30] میں بھی عام ہے۔ اس کے دو جملے ملاحظہ ہوں:—

۱- خدائے تعالیٰ نے حدیثِ قدسی میں فرمائے ہیں۔

۲- ہور حضرت نے تمام آج کی خبر بولے۔ [31]

دونوں جملوں میں فعل اپنے فاعل سے مطابقت رکھتا ہے۔ گویا حرفِ عاملہ کے طور پر اس کا اثر تو موجود نہیں البتہ اس کا استعمال فاعلی علامت ہی کے طور پر ہوا ہے۔ اسے مفعولی نہیں کہہ سکتے۔

قطبِ عالم گجرات کے مشہور بزرگ ہیں۔ ۸۵۷ ہجری میں انہوں نے انتقال کیا۔ شمس اللہ قادری نے ان کا یہ قول درج کیا ہے:— چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی [32]۔ یہ "نے"، فاعلی علامت کے طور پر، اردو کے موجودہ قواعد کے مطابق ہے۔

---

[30] "معراج العاشقین" کو ایک عرصے تک خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کر کے اردو کی قدیم ترین تصنیف مانا جاتا رہا لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م ۸۲۵ھ) کی تصنیف نہیں بلکہ ان کے بہت بعد کے دور کی ہے۔ اس کے مصنف مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں جنہوں نے گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر یا بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں "تلاوۃ الوجود" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ "معراج العاشقین" اسی کا خلاصہ ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے "معراج العاشقین" کو تاریخی نام کہا ہے جس سے سنہ ۱۱۷۶ھ نکلتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو "تیوبن" سے ایک صدی بعد کی تصنیف ہے (مزید دیکھیے: مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ - از جمیل جالبی)۔

[31] مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری - معراج العاشقین (منسوب بہ گیسو دراز) - دکن دارالاشاعت، کراچی سنہ ۱۹۶۱ء

[32] شمس اللہ قادری - اردوئے قدیم - ص ۲۴ - نولکشور پریس لکھنؤ - سنہ ۱۹۳۰ء

دکنی زبان کی قدیم ترین دستیاب تصنیف فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے جو ۸۲۵ھ اور ۸۳۹ھ کے درمیانی زمانے کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک شعر درج ذیل ہے :-

جو ایک سیت پا کر بجانے جنے + نہ کچا نہ پکا بچھانے جنے

اسی کا ایک مصرع یہ بھی ہے : بجر انگ اچن آنے بند دھار۔ [۳۳]

پہلے شعر میں دو جگہ "جنے" استعمال ہوا ہے (جن + نے)، دوسری جگہ "اُنے" (اُن + نے)۔ دونوں جگہ "نے" کا استعمال فاعلی علامت کے طور پر ہوا ہے۔

اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم اردو ادب کے دکنی و گجراتی دور میں بھی "نے" کا وجود تھا اور ٹھیک علامتِ فاعلی ہی کے طور پر تھا۔ اس کا مفعولی استعمال نہیں ملتا۔ کیونکہ مفعول کے اظہار کے لیے علامتِ مفعول موجود تھی اور علامتِ مفعول "کو" کا وجود اسی قدر قدیم ہے جتنا خود "نے" کا وجود۔ چنانچہ دستیاب اردو ادب میں "کوں" کا وجود "نے" کے ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ لہٰذا "نے" کو مفعولی علامت کے طور پر استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اگر قدیم شعرا و اُدبا "نے" اور "کو" میں فرق و امتیاز نہیں کرتے تھے (جیسا کہ شیرانی کے نظریے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی میں "نے"، فاعل اور مفعول دونوں کے لیے آتا ہے) تو اس کا کیا سبب ہے کہ وہ فاعل کے ساتھ "نے" استعمال کرتے رہے اور مفعول کے ساتھ "کوں"؟ حقیقت یہ ہے کہ قدیم شعرا و ادبا ان دونوں میں فرق و امتیاز کرتے تھے البتہ کہیں لوشتی کے سبب اور کہیں ضرورتِ شعری سے مجبور ہو کر "نے" کو حذف بھی کر دیا کرتے تھے۔ یہ صورت دکنی ہی سے مخصوص نہیں شمالی ہند میں بھی دیکھنے میں آئی ہے یہی سبب ہے کہ میر و سودا کے یہاں بھی "نے" کا جہاں استعمال ملتا ہے وہاں اس کے حذف کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا ترک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت سودا کے استاد حاتم کے ایک واقعے سے بھی ملتا ہے۔ جیسے حاتم کے عزیز شاگرد "رنگین" نے "مجالس" میں لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حاتم

---

۳۳ فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی۔ طبع اول سنہ ۱۹۷۳ء

نے ایک شعر کہا:

سر کو پیٹا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے + رات ہم ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

دوسرے مصرع میں "نے" چھوٹ گیا (ضرورتِ شعری کے سبب)۔ رنگین نے استاد کو اس جانب متوجہ کیا اور کہا کہ اگر یہ مصرع اس طرح ہوتا "ہم نے شب ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے" حاتم نے نہ صرف اس ترمیم کو گوارا کر لیا بلکہ شاگرد کی تحسین بھی کی۔[۳۲] اگر حیرت و مرزا کے زمانے تک "نے" کے استعمال کے قواعد منضبط نہیں ہوئے تھے اور اس کے استعمال میں بے قاعدگی پائی جاتی تھی تو رنگین نے اس کے ترک کر دینے پر استاد کو ترمیم کرنے کا مشورہ کیوں دیا اور حاتم نے اس مشورے کو قبول کیوں کر لیا۔ اگر ۱۷۷۱ء تک اس کے استعمال کے قواعد منضبط نہیں ہوئے تھے تو اس ترک پر اعتراض کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ عام چلن کی وجہ سے اس بے قاعدگی کو گوارا کر لیا جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ "نے" کا استعمال بہت پہلے سے معین صورت میں موجود تھا۔ دکنی میں بھی شمالی ہند میں بھی۔ شعرا اور ادبا اسے ٹھیک قاعدے کے مطابق استعمال کرتے رہے۔ یہ استعمال فاعلی علامت کے طور پر تھا مفعولی علامت کے طور پر نہیں۔ یہ استعمال قدیم زمانے سے اسی طرح چلا آ رہا ہے اور واضح کرتا ہے کہ یہ کہیں اور سے درآمد نہیں کیا گیا۔ یہ اردو کی اپنی چیز ہے جو سنسکرت سے کچھ تصرف کے ساتھ لے لی گئی ہے۔ سنسکرت میں اس کا اظہار "ـــ ین" سے ہوتا تھا۔ اردو میں اس کی شکل کچھ تبدیل ہو کر "نے" ہو گئی۔ یہ "نے" دستیاب اردو ادب کے قدیم ترین نمونوں میں تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔

جارج گریرسن، مولوی عبدالحق، پروفیسر حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کی آرا سے بحث کرنے کے بعد اور ایک قطعی نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور صاحب کی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کر دیا جائے۔ یہ پروفیسر امان اللہ ہیں جو مرے کالج سیالکوٹ کے استاد ہیں۔ انہوں نے رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ایک مضمون لکھا، عنوان تھا "نے، علامتِ فاعل؟" اس میں انہوں نے

---

۳۲ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۶۲ء، بحوالہ سعادت یار خاں رنگین، "مجالسِ رنگین"

نئی بات کہنے کے شوق میں بہت سے عجیب و غریب انکشافات کیے ہیں اور واضح کیا ہے کہ آج تک "نے" کے استعمال کے سلسلے میں تمام نحوی اور لسانیین سخت غلط فہمی کا شکار رہے ہیں وہ اس طرح کہ ابتدا سے آج تک کبھی قواعد نویس (اور ماہرینِ لسانیات "نے" کو اردو میں فاعل کی علامت قرار دیتے آئے ہیں جبکہ امان اللہ صاحب کے نزدیک "نے" سرے سے علامتِ فاعل ہے ہی نہیں۔ اس سلسلے میں ان کے اہم انکشافات سے بحث کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مضمون کے ان اہم انکشافات کو ذیل میں درج کر دیا جائے۔

۱۔ مولوی عبدالحق کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"مولانا عبدالحق بھی اتنا تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم آریائی زبانوں میں، جن کا تعلق اردو کے شجرۂ نسب سے قریب یا بعید کا ہے "نے" کا سراغ نہیں ملتا اور آج بھی مغربی ہندی (جس میں اردو اور برج بھاشا شامل ہیں) پنجابی بولیوں اور غالباً سندھی کے علاوہ، ہندوستان کے کسی خطے کی بولی میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ قدیم اردو میں بھی جو کتابیں دکن میں تصنیف ہوئیں "نے" کے استعمال سے خالی ہیں۔" ۳۵

۲۔ "اردو میں "نے" کا استعمال صرف فعلِ متعدی کے ساتھ آتا ہے اور وہ بھی مندرجہ ذیل پانچ ماضیوں میں:۔

ماضی مطلق : مثلاً میں نے کھایا

ماضی قریب : میں نے کھایا ہے

ماضی بعید : میں نے کھایا تھا

ماضی احتمالی : میں نے کھایا ہوگا

ماضی تمنائی : میں نے کھایا ہوتا (ماضی تمنائی بلا "نے" بھی آتی ہے جیسے میں کھاتا)" ۳۶

وہ مزید لکھتے ہیں کہ "اب سوال یہ ہے کہ جب دنیا کی تمام زبانوں میں (اور خود اردو میں) فعل اپنی جنس (تذکیر و تانیث)، عدد (واحد و جمع) اور خطاب (حاضر و غائب) کے اعتبار سے فاعل کا تابع ہوتا ہے نہ کہ مفعول کا تو آخر صرف اپنی پانچ ماضیوں میں یہ قاعدۂ کلیہ کیونکر بدل گیا؟ یعنی "ہم نے کھایا"، "میں نے کھایا" واحد مذکر غائب

۳۵-۳۶ پروفیسر امان اللہ۔ رسالہ اردو۔ جنوری سنہ ۱۹۵۲ء ص ۹۰۔

کا صیغہ اور "ہم نے روٹی کھائی" میں "کھائی" واحد مونث غائب۔ حالانکہ اگر ان دونوں جملوں میں "ہم" فاعل ہے تو فعل "کھایا" اور "کھائی" کے بجائے "کھائے" دونوں جملوں میں آنا چاہیے تھا۔ چنانچہ جن جملوں میں "نے" نہیں آتا وہاں فعل واقعی فاعل کا تابع ہوتا ہے مثلاً "میں کھانا کھاتا ہوں" یا "ہم روٹی کھاتے ہیں" وغیرہ" ۳۷

۳۔ "قدیم اردو پر نظر ڈالیے تو وہاں متعدی افعال کی بھی پانچوں ماضیاں اپنے حقیقی فاعل کی تابع ہوتی تھیں اس زمانے میں جب "نے" زبان میں داخل نہیں ہوا تھا یہ پانچ جملے اس طرح بولے جاتے تھے:

① میں کھایا (واحد متکلم مذکر)	① میں کھائی (واحد مونث متکلم)	① ہم کھائے (جمع متکلم)
② میں کھایا ہوں	② میں کھائی ہوں	② ہم کھائے ہیں۔
③ میں کھایا تھا	③ میں کھائی تھی	③ ہم کھائے تھے۔
④ میں کھایا ہوں گا	④ میں کھائی ہوں گی	④ ہم کھائے ہوں گے۔
⑤ میں کھایا ہوتا	⑤ میں کھائی ہوتی	⑤ ہم کھائے ہوتے

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم اردو میں "نے" نہیں تھا اور فعل اپنے فاعلِ حقیقی کا تابع ہوتا تھا لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آج کل "نے" کے داخل ہو جانے سے فعل اپنے فاعل کا تابع کیوں نہیں ہوتا؟ کیا آج کل لوگ از روئے قواعد غلط اردو بولتے ہیں؟ اس کا جواب ہے کہ "نہیں"۔ اردو آج بھی از روئے قواعد صحیح بولی جاتی ہے اور آج بھی فعل اپنے فاعل ہی کا تابع ہوتا ہے فقط قواعد نویسوں کی غلط فہمی ہے کہ جسے وہ فاعل بتاتے ہیں نہ وہ فاعل ہے اور نہ "نے" علامتِ فاعل!" ۳۸

۴۔ "گریرسن اور شیڈل ان جملوں کو جن میں "نے" آتا ہے طورِ مجہول (Passive Voice) بتاتے ہیں ان کی رائے ہے کہ "میں نے کھانا کھایا" میں "کھانا" قائم مقام فاعل ہے۔ "میں" مجرور اور "نے" حرفِ جر (Preposition) ہے۔ اس طرح اس جملے کی ترکیب یوں ہوگی: "میں" مجرور، "نے" حرفِ جر، جار و مجرور مل

---

۳۷ پروفیسر احسان اللہ، مضمون "نے علامتِ فاعل؟" شائع شدہ رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۲ لکھنؤ۔ ص ۹۱

۳۸ ایضاً ص ۹۳

متعلقاتِ فعل، "کھانا" قائم مقام فاعل، "کھایا (گیا)" فعلِ متعدی مجہول۔ "فعل" اپنے فاعل اور متعلقات سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔ اب اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر "کھایا" فعلِ متعدی ہے تو اس کا مفعول کہاں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "فعلِ متعدی" مجہول ہو کر "لازم" ہو جاتا ہے۔ مثلاً "پیٹنا" فعلِ متعدی ہے۔ لیکن "وہ پیٹا گیا" میں اگرچہ حقیقتاً "پیٹے جانے" کا فعل "وہ" پر ہوا، اور لہٰذا "وہ" مفعول ہے مگر چونکہ اس جملے میں "وہ" "پیٹنا" قبول کرتا ہے اس لیے قائم مقام فاعل ہوا۔ اصل فاعل، مجہول (لامعلوم) ہے۔"[۳۹]

اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"چونکہ انگریزی زبان میں طورِ مجہول اس طرح بھی ہوتا ہے اس لیے انگریز نحو اعد نویس یہ نکتہ سمجھ گئے۔ پس حقیقت میں "میں نے کھانا کھایا" کا صحیح انگریزی ترجمہ "I took Meal" نہ ہوگا بلکہ "Meal was taken by me" اس طرح اس جملے کی صحیح ترکیبِ نحوی ہو جاتی ہے اور وہ اعتراض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ "فعل" اپنے فاعل کا تابع کیوں نہیں۔ معلوم ہوا کہ فعل واقعی اپنے فاعل ہی کا تابع تھا لیکن ہمارے "نحوی" غلطی سے قائم مقام فاعل کو مفعول سمجھے اور فاعلِ حقیقی ہی کو (جو اس طرح کے جملوں میں "مجرور" ہوتا ہے) "فاعل" قرار دینے لگے۔ حالانکہ جو "اسم" مجرور ہو وہ فاعل کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔"[۴۰]

۵۔ "ایک اعتراض البتہ اور یہاں ہو سکتا ہے، اگر "فعل" طورِ مجہول میں ہے تو اس کے لیے "ماضی"، نہیں "حالیہ تمام" (Past Participle) کا صیغہ آنا چاہیے۔ سو یہ اس طرح رفع ہو جاتا ہے کہ درحقیقت یہاں "حالیہ تمام" ہی کا صیغہ ہے صرف "حالیہ تمام" کی علامت محذوف ہے۔ یعنی اصل جملہ یوں تھا "میں نے کھانا کھایا گیا" "کھایا" لیکن "گیا" یا "ہوا" ساقط کر دیا گیا اور صرف "کھایا" پورے "حالیہ تمام" کے معنی دیتا ہے ...... اس سے ملتی جلتی مثال سے شاید وضاحت ہو سکے :

۱۔ احمد نے ایک شیر مارا۔ ۲۔ ایک شیر احمد کے ہاتھ سے مارا گیا۔

---

[۳۹] پروفیسر امان اللہ مضمون "نے علامتِ فاعل؟" رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۲ء ص ۹۴

[۴۰] ایضاً ص ۹۵۔

دونوں جملوں کا مفہوم بالکل ایک ہے اور طور کلام بھی ایک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں فقط "نے" سے وہ مطلب پورا ہو گیا ہے جو دوسرے میں "کے ہاتھ سے" ادا ہوا ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ "نے"، بمعنی "ذریعہ" یا "واسطہ" استعمال ہوا ہے۔ دوسرا یہ نکلا کہ "نے" کے ساتھ فعلِ ماضی دراصل حالیہ تمام کی مخفف شکل ہوتی ہے۔ یعنی یہ جملہ دراصل یوں تھا "احمد نے ایک شیر مارا گیا" یا "مارا ہوا"۔ اسی طرح "میں نے کھانا کھایا" بھی درحقیقت "میں نے کھانا کھایا گیا" یا "کھایا ہوا" تھا۔[۱]

۶۔ اوپر ہم نے دو نتیجے نکالے تھے جن میں سے ایک بڑا اہم اور قابلِ غور ہے۔ یعنی "نے"، بمعنی "ذریعہ" یا "واسطہ" آتا ہے۔ اس کو مدِنظر رکھتے ہوئے دیکھنا یہ ہے کہ "نے" کس کس شکل اور کن کن معنوں میں اردو اور دوسری متعلقہ زبانوں میں آتا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "قواعدِ اردو" میں "نے" پر بحث کرتے ہوئے فقط اتنا بتایا ہے کہ قدیم زبانوں میں اس کا نشان نہیں ملتا۔ لیکن یہ کب اور کیونکر اردو، برج اور پنجابی وغیرہ میں آ گیا اس کے بارے میں تمام لسانیین خاموش ہیں۔ البتہ مولوی صاحب نے اس کی اصل سنسکرت کا مفعول "لگیا" بتائی ہے جو پراکرت میں "لگیو" ہوا، وہاں سے "لگے"، "لے"، اور "نے" بنے۔ لیکن ایک دوسری تحقیق کے مطابق "نے" دراصل "نوں" (بمعنی کو) کی ایک شکل ہے اور مجھے یہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔[۲]

۷۔ پنجابی کے اہلِ زبان عوام نے ایک حرف "نے" کو "ہونا" کے ساتھ مخصوص کر لیا اور دوسرے (نوں) کو "پڑنا" کے ساتھ۔ مگر اردو میں صرف "نے" باقی رہا اور وہ بھی فعلِ متعدی کی ان پانچ ماضیوں کے ساتھ۔ "نوں" کے لیے اردو میں گنجائش نہ رہی اس لیے اس کا بدل ہر جا بھاشا کا "کوں"، ہو گیا۔[۳]

پروفیسر امان اللہ کے مندرجہ بالا نکات کا خلاصہ مختصراً یہ ہے کہ:۔

۱؎ پروفیسر امان اللہ، "نے علامتِ فاعل ہے؟" ص ۹۵ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۵۲ء

۲؎ ایضاً ص ۹۸۔

۳؎ ایضاً ص ۹۹۔

۱۔ قدیم آریائی زبانوں میں جن کا تعلق اردو کے شجرے سے قریب یا بعید کا ہے "نے" کا سراغ نہیں ملتا بلکہ قدیم اردو میں بھی جو کتابیں دکن میں تصنیف ہوئیں "نے" کے استعمال سے خالی ہیں۔

۲۔ اردو میں "نے" کا استعمال صرف فعلِ متعدی کے ساتھ (پانچ ماضیوں میں) ہوتا ہے۔ ان میں فعل اپنے فاعل کے بجائے مفعول کا تابع ہوتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "نے" علامتِ فاعل نہیں۔ اگر یہ فاعل کی علامت ہوتا تو فعل جنس و عدد کے اعتبار سے اپنے فاعل کا تابع ہوتا کیونکہ جن جملوں میں "نے" نہیں آتا ان میں فعل اپنے فاعل کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا "نے" فاعلی علامت نہیں۔

۳۔ قدیم اردو میں "نے" موجود نہیں تھا اور متعدی افعال میں فعل اپنے فاعل کی مطابقت کرتا تھا۔ آج بھی فعل اپنے فاعل کے تابع ہوتا ہے البتہ قواعد نویس جسے فاعل بتاتے ہیں نہ وہ فاعل ہے اور نہ "نے" علامتِ فاعل۔

۴۔ گریرسن اور شمڈل کی تائید میں پروفیسر صاحب ان جملوں کو جن میں "نے" آتا ہے طورِ مجہول بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک "فاعل" دراصل مجرور ہے "نے" حرفِ جر، "کھانا" (تا مفعول) فاعل اور "کھایا" فعلِ متعدی مجہول۔ اس طرح وہ اپنے تئیں فعل کو اس کے فاعل کا تابع بنا دیتے ہیں۔

۵۔ "نے" کے بارے میں ان کا سب سے اہم ترین انکشاف یہ ہوا ہے کہ "نے" ذریعہ یا واسطہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۶۔ "نے" دراصل "نوں" سے ماخوذ ہے جو پنجابی میں "کو" کے معنوں میں ہے لیکن اردو نے چونکہ "کو" سرج بھاشا سے لیا لہٰذا "نوں" اور "نے" میں سے اردو نے صرف "نے" کو اپنایا۔

اب ان نکات سے ترتیب وار بحث کی جائے گی۔ پہلی بات جس کی جانب مضمون نگار نے توجہ دلائی ہے یہ ہے کہ قدیم آریائی زبانوں میں "نے" کا نشان نہیں ملتا اور اس خیال کو مولوی عبدالحق سے منسوب کیا ہے حالانکہ مولوی صاحب نے "قواعدِ اردو" میں لکھا ہے کہ مرہٹی میں "نے" کا استعمال اردو یا ہندی کی طرح ہوتا ہے۔ جہاں تک زبانوں کی قدامت کا سوال ہے، ہند و پاکستان کی جدید آریائی زبانیں قریب قریب سب ہم عمر ہیں۔ ان زبانوں کے ابھرنے اور نمایاں ہونے کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے۔ اس لحاظ سے یہ زبانیں ایک حیثیت کی ہیں۔ اگر مضمون نگار کے نزدیک اردو کم عمر ہے اور اس کے مقابلے میں دوسری تمام آریائی زبانیں قدیم، تو مرہٹی بھی ان کے ساتھ قدیم ہے۔ بلکہ زبان کی عام بناوٹ اور ارتقائی تاریخ کے لحاظ سے وہ ہند و پاکستان

کی دوسری جدید بولیوں کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے۔ مولوی عبدالحق کے کہنے کے مطابق مرہٹی میں "نے" نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کا استعمال بھی اردو یا ہندی کی طرح ہوا ہے۔ اگر پروفیسر صاحب کا مقصد یہ ہے کہ ہندو پاکستان کی موجودہ بولیوں میں سے کسی ایک میں بھی قدیم زمانے میں "نے" استعمال نہیں ہوا تو یہ بھی غلط ہے۔ مرہٹی میں "نے" اردو یا ہندی کی طرح قدیم زمانے میں مستعمل تھا اور جس طرح آج استعمال ہوتا ہے پہلے بھی استعمال ہوتا تھا۔ گیانیشور مرہٹی کا قدیم ترین شاعر ہے۔ اس کا زمانہ سنہ ۱۲۹۰ عیسوی کے لگ بھگ ہے۔ اس کو امیر خسرو کا معاصر سمجھنا چاہیے۔ مرہٹی میں دو ایک کتبوں کو چھوڑ کر، سب سے زیادہ قدیم ادبی نمونہ اسی کا کلام ہے۔ بھنڈارکر نے کم از کم چار مثالیں اس شاعر کے کلام سے پیش کی ہیں جن میں "نی" اردو "نے" کی طرح استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے یہاں "نیں"، بیائے مجہول بھی ہے لیکن یہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے اور آلے یا ذریعے کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً "یے نیں مانیں (اس میا رہے)، جے نیں توشیں (جس اطمینان سے)، یے نیں پرسادیں (اس عنایت سے) ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ "یہ نیں (بیائے مجہول)، مجبوراً "نے" کے طور پر اور اپنے معنوں میں ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اردو کے شجرے میں ہندوستان اور پاکستان کی سبھی قدیم و جدید آریائی زبانیں آجاتی ہیں۔ وہ بھی جو اردو کی ماں، نانی، پرنانی ہیں، وہ بھی جو اس کی خالائیں ہیں اور وہ بھی جو اس کی بہنیں ہیں۔ ان سبھی زبانوں کا اردو کے شجرے سے تعلق ہے۔ غالباً ان کی مراد سلسلۂ نسب (lineage) سے ہے۔ اس میں صرف وہ زبانیں آتی ہیں جن سے ترقی پاکر اردو بنی اور جنہیں اردو کی ماں، نانی، پرنانی وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یعنی سنسکرت (قدیم آریائی)، شورسینی پراکرت، شورسینی اپ بھرنش اور قدیم ہندی۔ اگر ان کی مراد واقعی یہی تھی تو قدیم اردو (ہندوی یا ہندی) ادب کے مطالعے سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ "نے" اردو میں اس وقت سے استعمال ہو رہا ہے جب سے اردو (یا ہندی) نمونے دستیاب ہوتے ہیں (قدیم دکنی و گجراتی اردو سمیت)۔ چنانچہ پرتھی راج راسو میں بھی اس کا استعمال موجود ہے۔ ہندی سے قبل شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت کے تحریری نمونے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ آیا "نے" اس وقت موجود و مستعمل تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو کس صورت میں؟

"نے"، ہندو پاکستان کی جدید آریائی زبانوں میں سے مرہٹی، گجراتی، پنجابی، ہریانی اور برج بھاشا میں

بھی ہے۔ سندھی میں اس کا وجود نہیں۔ ہریانی اور برج اردو سے زیادہ قریب ہیں اور ماہرینِ لسانیات کے خیال میں وہ اردو کی سگی بہنیں ہیں۔ باقی زبانیں اردو کی خالائیں ہیں۔ ان زبانوں میں "نے" کے روپ اور اس کے استعمالات اس طور پر ہیں۔

زبان	روپ	محلِ استعمال
۱۔ اردو	نے فاعلی	فاعلی علامت
۲۔ مرہٹی	ین (بیائے مجہول) مفرد	فاعلی
	ین (بیائے معروف) جمع	آلی
۳۔ گجراتی	نے	فاعلی
۴۔ پنجابی	نے	فاعلی
	نوں	مفعولی
۵۔ ہریانی	نے	فاعلی
۶۔ برج	ین (بیائے مجہول)	فاعلی

گویا ان تمام زبانوں میں "نے" موجود و مستعمل رہا ہے اور فاعلی علامت کے طور پر ہی رہا ہے۔

دکنی و گجراتی اردو کی تصانیف کے سلسلے میں تاریخی مطالعہ پہلے درج کیا جا چکا ہے جو اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ قدیم اردو کے اس دور میں بھی "نے" کا استعمال موجود رہا ہے اور فاعلی علامت کے طور پر بالکل آج کی طرح مستعمل رہا ہے۔

پروفیسر امان اللہ کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ اگر "نے" فاعل کی علامت ہوتا تو فعل اپنے فاعل کا تابع ہوتا۔ لیکن اردو میں جن جملوں میں "نے" استعمال ہوتا ہے ان میں فعل، مفعول کے تابع ہوتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ "نے" فاعلی علامت نہیں۔ اس کی دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ جن جملوں میں "نے" نہیں آتا وہاں فعل واقعی فاعل کا تابع ہوتا ہے۔

اس نکتے سے بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فعل لازم اور فعل متعدی کو سمجھا جائے۔

۱۔ فعلِ لازم وہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا پایا جائے مگر اس کا اثر صرف کام کرنے والے یعنی فاعل تک رہے اور بس۔ فعل لازم میں فاعل اور فعل مل کر کام پورا ہو جاتا ہے اس میں مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے احمد آیا۔

۲۔ فعلِ متعدی وہ ہے جس کا اثر فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچے۔ گویا فعلِ متعدی میں ایک کام کا کرنے والا، ایک کام

سننے والا اور ایک کام یعنی فعل "سنا"۔ اس طرح اس میں فاعل، مفعول اور فعل کے ملنے سے کلام مکمل ہوتا ہے جیسے احمد نے حامد کو مارا۔ اس میں بیک وقت دو افراد موجود ہیں۔ اب یہ واضح کرنے کے لیے کہ کام کا کرنے والا کون ہے اور سننے والا کون، علامت کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ دونوں کا فرق واضح ہو جائے اور کوئی اشتباہ نہ رہے۔ چنانچہ کام کرنے والے کے لیے علامتِ فاعل اور سننے والے کے لیے "کو" استعمال کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے فاعل اور مفعول کا تعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ فاعلی علامت کے طور پر اردو ادب کی قدیم دکنی و گجراتی اور شمالی ہند کی اردو (ہندی، ہندوی یا کھڑی) تصانیف میں "نے" اس وقت سے موجود ہے جب سے یہ تصانیف اور تحریریں دستیاب ہوئی ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ غالباً اس سے پیشتر کی زبان میں بھی یہ موجود رہا ہوگا اور بول چال کی زبان سے تحریری زبان نے بھی اسے اسی طرح اپنایا۔ بہرحال اس امر میں شبہ کی گنجائش قطعی نہیں کہ اردو میں قدیم زمانے ہی سے "نے" فاعلی علامت کے طور پر مستعمل رہا ہے۔

فعلِ لازم میں صرف ایک شخص یعنی کام کا کرنے والا ہوتا ہے اس لیے اس کے فاعل ہونے کا تعین کرنے کے لیے کسی علامت کی ضرورت نہیں۔ صرف فاعل اور فعل کے ملنے سے کلام اختتام کو پہنچ جاتا ہے اور فعل اپنے فاعل کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں "نے" کا استعمال نہیں ہوتا اور اسی سبب سے فعل اپنے فاعل کے تابع (مطابق) ہوتا ہے جب کہ "نے" والے جملوں میں مطابقت کا یہ اصول بدل جاتا ہے۔

"نے" کا استعمال اردو میں فاعل کے ساتھ فعلِ متعدی کی صورت میں ہوتا ہے۔ فعلِ متعدی میں فاعل کے علاوہ مفعول بھی ہوتا ہے اور فاعل کا تعین کرنے کے لیے علامتِ فاعل لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ علامتِ فاعل کے آجانے سے فعل، اپنے فاعل کے مطابق نہیں رہتا بلکہ مفعول کے مطابق ہو جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس چیز کو سرونیر صاحب نے محسوس کر لیا اور انہوں نے اس کی توجیہہ یوں کی ہے کہ فعل اپنے فاعل کا تابع اس لیے نہیں رہتا کہ جسے تو اعدنویس فاعل کہتے ہیں نہ وہ فاعل ہے اور نہ "نے" "علامتِ فاعل" حالانکہ بات سیدھی معمولی سی ہے اور وہ یہ کہ "نے" فاعلی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ "حروفِ عاملہ" میں سے ایک حرف بھی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جب جملے میں آتا ہے اس میں فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کر کے مفعول کے ساتھ قائم کر دیتا ہے۔ فعلِ متعدی کی ان پانچوں ماضیوں (ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی احتمالی اور ماضی تمنائی) میں اسی وجہ سے "نے" کے آنے پر فعل، فاعل کے بجائے مفعول کے تابع ہو جاتا ہے یہ ایک سیدھی سی بات ہے جسے فاضل مضمون نگار نہ سمجھ سکے۔ اردو میں قاعدہ کلیہ یہی ہے اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔

پروفیسر امان اللہ نے ایسے جملوں کو جن میں "نے" آتا ہے طورِ مجہول بتایا ہے مثلاً "میں نے کھانا کھایا" میں ان کے نزدیک "میں" مجرور ہے، "نے" حرفِ جر، "کھانا" قائم مقام فاعل، "کھایا" فعلِ متعدی مجہول۔ ان کا یہ نظریہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جملے میں "میں" فاعل ہے (واحد متکلم کی فاعلی ضمیر) "نے" علامتِ فاعل ہے اور حرفِ عامل بھی۔ "کھانا" مفعول ہے اور "کھایا" فعلِ متعدی معروف ہے۔ اوپر کی بحث سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اسے توڑ مروڑ کر پیچیدہ اور مبہم بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک "میں نے کھانا کھایا" کا صحیح انگریزی ترجمہ: "Meal was taken by me" ہے اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو "مجھ سے کھانا کھایا گیا" کا ترجمہ ان کے نزدیک غالباً یہ ہوگا: "I took Meal" یہ دراصل اردو اور انگریزی دونوں زبانوں سے اور ان کی قواعد سے ان کی ناواقفیت کی کھلی دلیل ہے۔ وہ Active Voice اور Passive Voice میں تمیز نہ کر سکے اسی طرح اردو میں طورِ معروف و مجہول کے فرق سے نابلد ہیں۔ اسی طرح بلاوجہ متعدی معروف کو مجہول اور مجہول کو معروف بنانا صرف ابہام پیدا کرتا ہے اور راہِ راست سے گمراہ کرنے کا باعث ہے۔

فعلِ متعدی طورِ معروف کو طورِ مجہول سے بدل دینے کے بعد وہ اپنی جانب سے یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ "اگر فعل طورِ مجہول میں ہے تو اس کے لیے ماضی نہیں حالیہ تمام (Past Participle) کا صیغہ آنا چاہیے"۔ اس اعتراض کو وہ اپنے طور پر یہ کہہ کر رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "درحقیقت یہاں حالیہ تمام ہی کا صیغہ ہے صرف حالیہ تمام کی علامت محذوف ہے یعنی اصل جملہ یوں تھا "میں نے کھانا کھایا گیا" یا "کھایا ہوا"۔" ہو سکتا ہے ان کا خیال صحیح ہو، لیکن ہمیں جدید و قدیم دستیاب ادب میں نثر و ادبا کے یہاں ایسا استعمال ایک جگہ بھی نہیں ملا جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسا کوئی استعمال قدیم و جدید دور میں رائج نہیں رہا۔ یہ صرف اپنی مفروضی اور خیالی بات کو صحیح ثابت کرنے کی ایک لایعنی کوشش ہے جو بے بنیاد ہے۔ اس کوشش کو طول دیتے ہوئے انہوں نے مزید وضاحت کے لیے دو جملے بھی نقل کیے ہیں: (۱) "احمد نے ایک شیر مارا۔" اور (۲) "ایک شیر احمد کے ہاتھ سے مارا گیا"۔ وہ کہتے ہیں کہ "دونوں جملوں کا مفہوم بالکل ایک ہے اور طورِ کلام بھی ایک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں لفظ "نے" سے وہ مطلب پورا ہو گیا ہے جو دوسرے میں "کے ہاتھ سے" ادا ہوا ہے۔ اس سے ان کے نزدیک ایک نتیجہ یہ نکلا کہ "نے" بمعنی ذریعہ یا واسطہ استعمال ہوا ہے دوسرا یہ نکلا کہ "نے" کے ساتھ فعلِ ماضی دراصل حالیہ تمام کی مختصر شکل ہوتی ہے یعنی یہ جملہ دراصل یوں تھا "احمد نے ایک شیر مارا گیا" یا "مارا ہوا"۔"

ان کی یہ تمام باتیں تطویل لاطائل اور مضحکہ خیز ہیں۔ "نے" کا "ذریعے اور واسطے" کے معنوں میں استعمال کا دعویٰ کرکے ثبوت کے لیے اپنی جانب سے جملے ایجاد کر لیے ہیں حالانکہ اس سلسلے میں دلائل قدیم تحریروں کے نمونوں اور لسانیین کے حوالوں سے دینے چاہئیں تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً انہیں خود اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا اور ان کے دعووں کی خود بخود نفی ہو جاتی کیونکہ ایسا استعمال اردو میں کبھی، کسی دور میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ "نے" فاعل کی علامت کے طور پر آتا ہے اور ہمیشہ سے اسی طور پر مستعمل ہے۔ آلے اور ذریعے کے لیے اس کا استعمال بھی پروفیسر صاحب کے انکشاف کا مرہونِ منت نہیں۔ ان سے قبل لسانیین اس جانب اشارہ کر چکے ہیں۔ پروفیسر صاحب کا یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ "فعل ماضی دراصل حالیہ تمام کی مختلف شکل ہوتی ہے اور یہ بھی کہ "نے" حرفِ جر Preposition ہے۔ دراصل یہ علامتِ فاعل ہے Postposition ہے اور حرفِ عاملہ بھی۔ اردو میں حرفِ جر "سے" ہے اور اسی قدر قدیم ہے جس قدر "نے"۔ یہ مجروری حالت کا اظہار کرتا ہے۔

"نے" کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ یہ دراصل پنجابی سے لیا گیا ہے۔ پنجابی میں "نے" اور "نوں" دو صورتیں مستعمل ہیں۔ "نے" اردو میں دراصل پنجابی سے لیا گیا ہے۔ اردو نے "نوں" کو چھوڑ دیا اس کی جگہ برج بھاشا کا "کوں" لے لیا؟ یہ قیاس بھی صحیح نہیں کیونکہ اگر "نے" پنجابی سے لیا جاتا تو دونوں صورتوں میں لیا جا سکتا تھا، دوسری صورت کے لینے میں کیا قباحت تھی؟ کیا ضرور تھا کہ "نے" پنجابی سے لیتے اور "نوں" کو نظر انداز کر کے برج سے خوشہ چینی کرتے؟ ان کے نزدیک "نے" کے ماخذ سے مولوی عبدالحق کے سوا کسی نے بحث نہیں کی۔ حالانکہ مولوی صاحب کے علاوہ بھی بہت سے لسانیین نے اس سلسلے میں اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے اس سے پروفیسر صاحب قطعی طور پر نابلد ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے ایک غلطی کو نبھانے کے لیے اور بھی بہت سی غلطیاں کی ہیں۔

ماخذ

مشہور ماہر لسانیات گریرسن کا خیال ہے کہ "نے" برج بھاشا کا نہیں۔ ایک دوسرے ماہر لسانیات شیام سندر داس اسے مغربی ہندی کی پیداوار بتاتے ہیں۔ مضافاتِ دہلی کی تین زبانیں ہیں جن میں "نے" ہے۔ ایک میرٹھ اور اس کے نواح کی کھڑی (یہی زبان ہے جس پر اردو کی بنیاد رکھی گئی ہے)۔ دوسری ہریانی اور تیسری متھرا کی برج۔ یہ زبانیں مغربی ہندی کی شاخیں ہیں۔ ان سے بھی "نے" لیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ "نے" مغربی ہندی کی پیداوار نہیں۔ یہی سبب ہے کہ "نے" پراکرتی راج استھانی سے، جسے مغربی ہندی کا قدیم ترین نمونہ بتایا جاتا ہے

یہ اپنی موجودہ شکل میں نہیں ملا۔ وہاں اس کا مفہوم 'نے' کی جگہ قدیم اپ بھرنش "ہیں" سے ادا کیا گیا ہے۔

پنجابی، مغربی ہندی اور برج بھاشا کو چھانٹ دینے کے بعد مرہٹی، گجراتی اور ہریانی صرف تین زبانیں رہ جاتی ہیں جن میں 'نے'، استعمال ہوا ہے۔ مرہٹی میں 'نے'، کا استعمال دو صورتوں میں ہوا ہے۔ 'نیں' (بیائے مجہول مفرد) اور 'نیں' (بیائے معروف، جمع کا ہے) آلی حالت میں۔ واضح ہوا یہ 'نے' (نیں) منصرف ہے جب کہ اردو کا 'نے'، غیر منصرف ہے اور آلے (ذریعے) کے بجائے فاعل کی علامت ہے۔ لہٰذا شوکت صاحب کے نزدیک اس کا امکان نہیں کہ یہ مرہٹی سے لیا گیا ہو۔ اگر لیا جاتا تو یہاں بھی پنجابی والی صورت درپیش ہوتی یعنی دونوں استعمالات کے ساتھ لیا جانا چاہیے تھا جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اسے آلی اور مفعولی حالت کا مظہر ہونا چاہیے تھا۔ ان کے نزدیک گجراتی میں 'نے'، آلی اور مفعولی دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے جب کہ اردو میں ایسا نہیں۔ رہی ہریانی تو اس میں بھی 'نے'، فاعلی اور مفعولی دو صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہریانی کا مشہور شاعر دلمیر کہتا ہے:

مفعولی — میرے صاحب پر کے گینا + محبوب نے دلیس نکالا دینا

فاعلی — بنی صاحب کے چار سپاہی + جنہاں نے ملکو ڈھو مس ٹھائی

واضح ہوا کہ بیشتر زبانوں میں 'نے'، فاعل اور مفعول یا آلی فاعل اور مفعول کی علامت ہے۔ اردو وہ واحد زبان ہے جس میں 'نے'، صرف فاعلی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کے استعمال کا ثبوت اس وقت سے ملتا ہے جب سے اردو کے نمونے دستیاب ہیں۔ قدیم زمانے سے آج تک اردو میں اس کا استعمال ایک ہی مفہوم میں ہوا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ 'نے'، اردو کی اپنی چیز ہے یہ ان چند خصوصیات میں سے ہے ('نے' کا فاعلی علامت کے طور پر استعمال) جو اردو زبان کو دوسری زبانوں سے ممیز کرتی ہیں۔ اردو کے سلسلۂ نسب میں جو زبانیں آتی ہیں (یعنی سنسکرت، شورسینی پراکرت، شورسینی اپ بھرنش) اور جن سے شرقی یا مغربی اردو بنی ہے، اگر اردو سے پیشتر جو اپ بھرنش بول چال کی زبان کے طور پر مستعمل تھی اور جس پر اردو کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس کے نمونے دستیاب ہو جاتے تو پورے وثوق سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ 'نے'، کس قدر قدیم ہے۔ ان نمونوں کی عدم موجودگی میں صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ دوسری زبانوں میں چونکہ 'نے'، کا استعمال اردو سے مختلف اور ایک سے زاید حالتوں کے لیے کیا جاتا ہے، نیز بعض زبانوں میں منصرف صورتیں رائج ہیں، یہ بھی اردو میں نہیں لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ 'نے'، اردو کا

دوسری زبان سے نہیں لیا بلکہ اپنے راست سلسلۂ نسب ہی سے لیا ہوگا۔ دستیاب ادب کے قدیم ترین نمونوں سے بھی اس کے استعمال کی شہادتیں ملتی ہیں جن سے ثابت ہے کہ اردو کے قدیم ترین دور میں "نے" بالکل آج ہی کی طرح مستعمل تھا اور اس کی مثالیں تسلسل سے ملتی ہیں۔

آلی اور مجبوری حالت سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ اردو میں آلی اور مجبوری دونوں کا لاحقہ واحد ہے۔ دونوں کا اظہار حرف "سے" سے کیا جاتا ہے۔ فاعل اور مفعول کا اظہار ساتھ ساتھ مقصود ہو تو فعلِ معروف لائیں گے اور یوں کہیں گے "رام کتاب پڑھتا ہے"۔ اور اگر فاعل کو چھپانا چاہیں تو فعلِ مجہول لائیں گے اور یوں کہیں گے "کتاب پڑھی جاتی ہے"۔ پڑھنے والا کون ہے اس جملے سے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سنسکرت محاورہ اس کے خلاف ہے۔ فعلِ مجہول کی صورت میں بھی سنسکرت میں فاعل کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ فعلِ مجہول کا یہ فاعل آلی حالت میں ہوتا ہے۔ سنسکرت میں اس کی علامت "ین" ہے جیسے "رامین" "رام نے"۔ یعنی رام کے ذریعے اور اس کے واسطے سے۔ اردو کی ماضی اصل اور ساخت کے لحاظ سے اسم مفعول ہے۔ اسم مفعول مجہول کا صیغہ ہے اس لیے بطور فعل استعمال ہونے کی صورت میں اس کا فاعل سنسکرت محاورے کے مطابق "آلی" ہونا چاہیے۔ اردو میں اس کی یہی کیفیت ہے۔ "رام نے کتاب پڑھی" کا مفہوم ہے "کتاب پڑھی گئی" رام کے ذریعے اور اس کی وساطت سے۔ گویا رام کتاب پڑھے جانے کا ایک آلہ (یا ذریعہ) ہے۔ "چور لاٹھی سے پیٹا گیا"، اس جملے میں "لاٹھی" جس طرح پیٹنے کا آلہ ہے ٹھیک اسی طرح رام کو پڑھنے کا آلہ سمجھنا چاہیے۔ سنسکرت میں ان دونوں میں فرق نہ تھا۔ دونوں جملوں میں "رام" اور "لاٹھی" "کرن" تھے اور ان کی اس حالت کا اظہار "ین" (अ + इ न) سے کیا جاتا تھا۔ اردو میں ان دونوں میں فرق ہے۔ رام کو جو جاندار اور سمجھدار ہے "فاعل" سمجھا جاتا ہے مگر فعلِ معروف کے فاعل سے ممتاز بنانے کے لیے قدیم محاورے کے مطابق اس پر آلی حالت کا لاحقہ "نے" اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ "لاٹھی" ایک بے جان چیز ہے اس میں از خود کام کرنے کی صلاحیت نہیں اس لیے بطور ایک آلہ قرار دے کر "سے" کی مدد سے اس کی اس حالت کو ظاہر کیا جاتا ہے۔[٤٤]

ہورنلے اور کیلاگ نے اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ न (ین، ہیں) سنسکرت اضافی لاحقے کی ارتقائی

---

[٤٤] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ٢٢٥۔ مطبوعہ دی کسٹن پریس ڈھاکہ۔ طبع اول ١٩٥٦ء

شوکت صاحب نے علامتِ فاعل "نے" کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: "نے اردو میں اگر فاعل کی علامت ہوتا اور اسم کی

صورت ہے۔ جو سنسکرت اضافی لاحقہ स्स (سیہ) سے حاصل کی گئی ہے۔ اس کے مختلف تغیرات یہ ہیں :۔

ए- हि- सि- स्स

چٹرجی کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک یہ اسم کی ظرفی حالت ہے (ए) یہ قدیم آریائی میں "ادھی" تھا۔ پالی میں "دِھی" ہوا۔ پراکرت میں ہی، یا ھم: گھرہ دھی، یا گھرہ ہم: گھرہی یا گھرہم = گھرے یا گھریں۔ اس طرح ए کی ارتقائی صورت 'اے' اور 'ایں' ہے جو ظرفی لاحقے کے طور پر سنسکرت، پالی اور پراکرت وغیرہ میں استعمال ہوئی۔ ماگدھی اور اردھ ماگدھی میں اسم کی فاعلی حالت 'ــے' تھی۔ سنسکرت کی مفعول ثانوی اور اضافی حالتوں میں بھی 'ے' ہوتا تھا۔ آلی حالت کا لاحقہ ویسے تو "ــیں" ہے لیکن پراکرت میں حذف 'ں' کے بعد وہ 'ے' رہ گیا۔ ظرفی میں 'ے' ہوتا ہی ہے۔ یوں کہئے کہ تمام اعرابی علامات میں سے زیادہ عام، ہمہ گیر اور کثیر الاستعمال لاحقہ "ــے" ہے جو اکثر حالتوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کو اس ہمہ گیری اور عمومیت کے باعث اردو وغیرہ زبانوں میں غیر فاعلی حالت کے لیے اختیار کر لیا گیا۔ چند بردائی کے "راسو" میں صرف ایک لاحقہ हि چار مختلف حالتوں یعنی مفعولی (ثانوی)، ظرفی، مجبوری اور اضافی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس زمانے میں آلی کے لیے اگر چہ لاحقہ "ــیں" بھی تھا لیکن جب 'دھی' کٹ کر 'ــے' ہوا تو اس کے ساتھ 'ــیں' چھوٹ کر 'ــے' ए رہ گیا۔ جو بلا امتیاز اسم کی ہر حالت پر اضافہ کیا جانے لگا۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو میں ए آلی بھی ہے ظرفی بھی۔ مگر ظرفی کی مثالیں اردو میں زیادہ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) فاعلی حالت بتاتا تو فعل ہمیشہ اس اسم کے مطابق ہوتا جس کے بعد 'نے' ہے اور ہر جگہ فاعل کے بعد اس کا اضافہ جائز اور صحیح سمجھا جاتا۔ اردو میں فعلِ حال، فعلِ مستقبل اور فعلِ لازم کی ماضی کے ساتھ اگر فاعل کا ذکر کیا جاتا ہے تو 'نے' استعمال نہیں ہوتا۔ جیسے سورج نکلا' 'حامد اسکول جاتا ہے' 'میں کتاب پڑھوں گا' ان مثالوں میں سورج، حامد اور میں، فاعلی حالت میں ہیں مگر ان کے بعد 'نے' نہیں اور نہ لایا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ 'نے' فاعل کی علامت نہیں فعلِ مجہول کے فاعل کی علامت ہے اور انگریزی "By" کے ہم معنی ہے انگریزی میں اس قسم کے فاعل کو Agent (نائب فاعل) کہتے ہیں۔" (اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۲۶)

اردو میں 'نے' فاعل ہی کی علامت ہے، فعل کا ہمیشہ اس اسم کے مطابق نہ ہونا جس پر 'نے' آیا ہو، اس وجہ سے ہے کہ 'نے' حرفِ عامل بھی ہے۔ فعلِ حال، مستقبل اور فعلِ لازم کے ساتھ 'نے' استعمال نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس میں فاعل اتنا واضح ہوتا ہے کہ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کسی علامت کی ضرورت نہیں ہوتی

"تلے" "تل" کی ظرفی حالت ہے ۔ یہ لفظ اس شکل و صورت میں اب لہر نقش میں بھی تھا ۔ ماتھے، سہارے، کنارے، اس کی چند مثالیں ہیں ۔ اردو میں ظرفی حالت کے لیے نون غنہ (ں) بھی دیکھا گیا ہے ۔ امین کی اس تحریر میں:

بہت آرام تھا ساری خلق کوں ٭ نہ مارے کوئی اس راتیں پلک کوں

"راتیں" ظرفی حالت میں ہے : "اس راتیں" یعنی اس رات میں ۔

مندرجہ بالا تمام تفصیلات شوکت صاحب ہی کی کتاب سے اخذ کی گئی ہیں [۴۵] ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاحقہ "ـے" (II) اور لاحقہ "ـیں" (IV) مختلف اعرابی حالتوں کے لیے استعمال ہوتے تھے [۴۶] ۔ یہ اعرابی حالتیں اضافی، ظرفی، مفعول ثانوی، مجروری اور آلی وغیرہ ہیں ۔ کہیں بھی فاعلی علامت کے طور پر "ـیں" یا "ـے" کا ذکر نہیں ۔ البتہ آلی علامت کے طور پر اس کا ذکر آیا ہے ۔ اردو میں اس کے لیے "سے" مستعمل ہے ۔ اس لحاظ سے "رامیں" کا ترجمہ "رام نے" نہیں بلکہ "رام سے ہوگا" : "رام سے کتاب پڑھی گئی" اور "چور لاٹھی سے پیٹا گیا" طور مجہول ہیں ۔ ایسے افعال کے طور مجہول میں جن میں دو مفعول ہوتے ہیں، مفعولِ قریب، فاعل کا قائم مقام ہوتا ہے مگر حالت اس کی وہی رہتی ہے یعنی مفعول ۔ مفعول علامت اردو میں "کو" ہے ۔ لیکن مجروری علامت "سے" ہے ۔ اس لحاظ سے یہ جملہ مجروری حالت میں ہے اور مفعول قائم مقام فاعل کو مجرور کیا جائے گا ۔ "رام سے کتاب پڑھی گئی" کی ترکیبِ نحوی اس طرح ہوگی : "رام" مجرور ۔ "سے" حرفِ جر، "کتاب" مفعول (مفعولِ دوم)، "پڑھی گئی" فعلِ مجہول ۔ اس میں "ـیں" "سے" کے معنوں میں ہے یعنی آلی و مجروری کے لیے آیا ہے ۔ شوکت صاحب کا کہنا ہے کہ سنسکرت میں جاندار اور بے جان کے فرق و امتیاز کے بغیر دونوں کے ساتھ ایک ہی علامت استعمال کی جاتی تھی یعنی "ـیں" ۔ لیکن اردو میں ان دونوں میں فرق کیا جاتا ہے : "رام" کو جو جاندار اور باشعور ہے فاعل سمجھا جاتا ہے مگر فعلِ معروف کے فاعل سے ممتاز بنانے کے لیے قدیم محاورے کے مطابق اس پر آلی حالت کا لاحقہ "نے" اضافہ کر دیا جاتا ہے ۔ لاٹھی ایک بے جان چیز ہے اس میں از خود کام انجام دینے کی صلاحیت نہیں ہے اس لیے اسے آلہ قرار دے کر "سے" کی مدد سے اس کی اس حالت کو ظاہر کیا جاتا ہے ۔

---

[۴۵] شوکت سبزواری ۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۰۵ تا ص ۲۰۹ ۔ داؤ دی پریس ڈھاکہ ۔ طبع اول ۱۹۵۶ء

[۴۶] عبدالحق
شوکت صاحب نے اعرابی حالتوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اعرابی حالتوں کا جہاں تک تعلق ہے قدیم زبانوں میں قریب قریب یکساں اصول کے

ہر زبان اپنے ابتدائی دور میں بے ترتیبی کا شکار رہتی ہے۔ پھر اس میں بتدریج ارتقا اور تراش خراش ہو کر ایک متعین صورت سامنے آنے لگتی ہے۔ کچھ یہی صورت اردو کے سلسلے میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ شوکت صاحب نے جس بات کی جانب اشارہ کیا ہے وہ صورت اردو کے قدیم ترین دکنی دور میں بعض اوقات دیکھنے میں آئی ہے مثال کے طور پر "سب رس" کے چند جملے اسی جانب اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ بے غم کھانے کے آدمی نے کیا سواد پانا۔

۲۔ پادشاہاں نے دنیا کا حظ چھوڑے، خلق کا دل توڑے۔

۳۔ عزرے نے نظر کوں اپنے گھرے کر گیا۔ ۴۔ اس خاطر زلیخا نے کیا کری۔

ان جملوں سے واضح ہے کہ اردو اپنی ابتدائی حالت میں ہے، اس میں "نے" بعض اوقات ایسے موقعوں پر بھی استعمال ہوا ہے جہاں اس کی ضرورت نہ تھی۔ بعض اوقات لازمی فاعل کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مزید برآں حرفِ عاملہ کے طور پر اس کا اثر نظر نہیں آ رہا، گویا اس وقت اس کا مکمل طور پر تعین (بطور حرفِ عاملہ اس کا اثر انداز ہونا) نہ ہو سکا تھا۔ بعد میں اس کا مکمل تعین ہو گیا کہ یہ علامتِ فاعلی اور حرفِ عاملہ ہے تو بے ترتیبی رفع ہو گئی۔ اردو کا رجحان تسہیلی اور اختصار پسندی ہے چنانچہ یہ اس کی اختصار پسندی ہی کی بات ہے کہ علامتِ فاعلی کو صرف ان جگہوں میں برقرار رکھا جہاں اس کی ضرورت تھی، بقیہ موقعوں پر اسے گرا دیا گیا۔ یعنی جہاں اس علامت کے بغیر فاعل واضح تھا وہاں اس کا استعمال متروک کر دیا گیا۔ لیکن بہرصورت اس قدیم ترین دور میں بھی "نے" کے استعمال کے سلسلے میں بہت زیادہ بے ربطی یا بدنظمی نہیں رہی۔ یہ ہمیشہ فاعلی علامت کے طور پر ہی استعمال ہوا ہے۔ سوائے اس کے کہ بعض ایسے موقعوں پر بھی اس کا استعمال کر لیا گیا جہاں اس کے بغیر کام چل سکتا تھا یا انہیں اسے محذوف کر دیا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) مثلاً لاطینی، سنسکرت، عربی، قدیم انگریزی اور ترکی میں اسم کی ہر حالت کے لیے آخر میں خاص علامت ہوتی تھی جو کہ جزو ہوتی ہے اور ان حالتوں کی تغیر کے لیے اسم کے آخری حرف میں تبدیلی ہو جاتی ہے مثلاً عربی میں فاعلی حالت کے لیے آخری حرف پر رفع (پیش) اور مفعولی حالت پر نصب (زبر) ہوتا اور اضافی و ظرفی میں کسرہ (زیر) ہوتا ہے۔ اسی طرح لاطینی، ترکی اور سنسکرت میں لفظ کے آخری لاحقے یا علامتیں اسم کی حالت بتاتی ہیں۔ سنسکرت میں اسم کی آٹھ حالتیں ہیں اور مختلف حالتوں کی صورت میں لفظ کے آخری حرف میں علامت یا حروف کے اضافے سے تبدیلی ہو جاتی ہے (قواعد اردو ص ۱۸۳) ہمارے نزدیک سنسکرت میں فاعلی حالت میں "ن" کا استعمال کسرہ کے ساتھ رہا ہو گا جسے اردو نے یائے مجہول سے تبدیل کر کے "نے" بنا لیا جیسا کہ بعض دوسرے سنسکرت الفاظ و حروف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ متحرک الآخر ہوا کرتے تھے، شوکت صاحب نے اردو زبان کا ارتقا میں اسی بحث کی ہے

شوکت سبزواری نے 'نے' کی اصل، علامت آلہ एन بتائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو کا 'نے' اور اس کا بطور مجہول استعمال براہ راست سنسکرت سے لیا گیا ہے۔ سنسکرت کی کرن کی علامت کا استعمال پراکرت کے آخری دور تک رہا۔ پالی اور پراکرت میں مفتوح الاواخر اسما کے آخر میں آنے کے لیے یہ لاحقہ مستعمل تھا۔ [47] "ـ ین" سے 'نے' کیسے بنا؟ اس سلسلے میں بھنڈارکر کے حوالے سے لکھا ہے کہ: "نے دوہری علامت ہے۔ اول 'ـ ین' سے 'ن' تراشا گیا بعد میں اپ بھرنش "ـ ہیں" جو خود 'ـ ین' سے نکالا گیا تھا اس پر اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح 'نے' تیار ہوا [48] شیام سندر داس اور ہری اودھ 'نے' کو 'ـ ین' کا مقلوب بتاتے ہیں [49] شوکت صاحب نے شیام سندر داس اور ہری اودھ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔

بیمز کو اس پر اعتراض ہے کہ اگر 'نے' پراکرت 'ـ ین' سے ماخوذ تھا تو اس کا استعمال پرانی ہندی میں کثرت کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ 'نے' پرانی ہندی میں استعمال ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرہٹی میں 'نے' کی دو شکلیں تھیں 'نی' اور 'نیں'۔ یہ دونوں شکلیں ریختہ کے قدیم شاعر گیانیشور کے کلام میں ہیں۔ ہندی کے مشہور شاعر سورداس کے یہاں بھی 'نے' دیکھا گیا ہے مثلاً ایک پرش نے آج موہی سپنانتر دینوں [50] (آج ایک شخص نے مجھے خواب میں اپنا دیدار دکھایا) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'نے' اردو میں کتنا قدیم ہے اور قدیم زمانے ہی سے یہ فاعلی علامت کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔

---

[47] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ص ۲۲۶-۲۲۷، بحوالہ ولنر ص ۳۴ پالی گرامر ص ۵۹ ۔

[48] ایضاً ص ۲۲۷ بحوالہ بھنڈارکر ص ۲۵۷

[49] ایضاً ص ۲۲۸ بحوالہ ساہتیہ ص ۱۳۸ ۔ و ہندی بھاشا ص ۸۰

[50] شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل۔ انجمن پریس۔ کراچی۔ ۱۹۶۲ء۔

مجروری "سے" کا مطالعہ

حروفِ ربط میں سے ایک حرف "سے" بھی ہے جو مجروری حالت کا اظہار کرتا ہے جیسے گھر سے نکلا۔ آلے یا سببیت کے لیے بھی آتا ہے جیسے لاٹھی سے مارا۔ محنت کرنے سے بیمار پڑا۔ "سے" کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں زور نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:-

لفظ "سے" کی موجودہ شکل اردو زبان میں صرف سوا سو سال ہی سے مستعمل ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ "سیں" یا "سوں" کی شکل میں رائج تھا۔ چنانچہ ولی اور اس کے ہم عصروں کے کلام میں ہمیشہ "سیں" یا "سوں" نظر آئے گا۔ ولی سے تقریباً پچاس سال پہلے یہ لفظ "ستے" اور "ستیں" کی شکل میں رائج تھا۔ چنانچہ قطب شاہی سلطنت کے عہدِ آخر کے شاعروں کا کلام اس کا شاہد ہے۔ ابوالحسن تاناشاہ اور اورنگ زیب کے معاصر غلام علی کی نظم "پدماوت" کا ایک مصرعہ ہے: بھلائی ستے تو بھلا پائے گا۔ غلام علی سے پچاس سال قبل اس لفظ میں "س" کی آواز موجود نہیں تھی۔ اس زمانے کے گولکنڈہ کے رہنے والے "مجھ سے کہا" کی جگہ "مجھ تھے کہیا" کہتے تھے۔ چنانچہ مشہور قطب شاہی بادشاہ محمد قلی اور اس کے درباری شعرا کے کلام میں لفظ "تھے" ہی نظر سے گزرتا ہے۔ محمد قلی کے عہد سے پہلے یہ لفظ "تے" کی شکل میں رائج تھا۔ وجہی جس نے ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے شاعری میں شہرت حاصل کر لی تھی اکثر "تے" لکھتا ہے۔ وجہی سے پہلے تمام اردو تحریروں میں بھی "تے" ہی ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے جو اردو نثر منسوب ہے اور جو ان کی نہیں تو ان کے قریبی زمانے کی ضرور ہے اس میں بھی "تے" ہی لکھا گیا ہے۔ اس وقت تک جس کتاب کو اردو زبان کی قدیم ترین نظم سمجھا جاتا ہے وہ میاں خوب محمد گجراتی کی "خوب ترنگ" ہے۔ اس میں چند مقامات پر حرف "تھیں" استعمال کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ لفظ "سے" کی صوتی شکل مختلف زمانوں اور مقامات پر بدلتی گئی اور جو لفظ دراصل پہلے "تھیں" یا "تے" تھا وہ "تھے"، "ستے"، "ستیں"، "سوں" اور "سیں" ہوتا ہوا آخر کار "سے" بن گیا۔[1]

---

[1] محی الدین قادری زور - ہندوستانی لسانیات (صفحہ ۴۲ تا صفحہ ۴۴ کا خلاصہ)
مطبوعہ منصور پریس - لاہور - ۱۹۶۱ء

زور کی محولہ بالا تحریر سے "سے" کے ارتقائی مدارج کا جو نقشہ بنتا ہے وہ یہ ہے :۔

خوب محمد گجراتی کے زمانے میں صرف حرف "تیں" استعمال ہوتا تھا۔ ان کے بعد کے زمانے میں خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب اردو نثر[۲] وجہی اور ان کے معاصرین کی تحریر میں حرف "تے" استعمال ہوا۔ اس کے بعد محمد قلی اور اس کے درباری شعرا میں یہ لفظ "تھے" کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس خصوصیت کو زور نے گولکنڈہ کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت اس میں "س" کی آواز موجود نہیں تھی۔ جب کہ اس دور کے بعد اس میں "س" کی آواز شامل ہو گئی اور "تھے" نے "ستے" کا روپ اختیار کر لیا۔ غلام علی کی نظم "پدماوت" اور قطب شاہی سلطنت کے عہدِ آخر کے شعرا حرف "ستے" اور "ستیں" استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پچاس سال بعد پھر اس میں مزید تغیرات رونما ہوتے ہیں اور ولی کے زمانے میں "ستے" "اور ستیں" تبدیل ہو کر "سیں" اور "سوں" بن جاتے ہیں۔ ولی اور ان کے معاصرین کا کلام اس کا ثبوت ہے۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ زور کی مذکورہ بالا تحقیق کہاں تک حقیقت سے قریب تر ہے اردو کے دستیاب ادب کا تاریخی ترتیب کے ساتھ جائزہ لینا ہوگا۔

دکنی ادب کے سلسلے میں اول ولی کو لیتے ہیں۔ زور کا کہنا ہے کہ "ولی اور ان کے معاصرین کے یہاں حرف "سیں" اور "سوں" ملتا ہے" لیکن ولی کے کلام کے درج ذیل مصرعے اس خیال کی تردید کرتے ہیں :۔

۱۔ کہتا ہے ولی دل ستی یو مصرعِ رنگین

۲۔ سنتا ہوں جب ستی آوازہ تری روشن بیانی کا

۳۔ سنتا ہوں جب سوں یہ نکتہ ولی شیریں سخن سیتی

۴۔ کرے تا تجھ ہیری رو سے طلب یک بوسۂ شیریں [۳]

---

[۲] یہ کتاب (معراج العاشقین) خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے بہت بعد کی تصنیف ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مقدمۂ کدم راؤ پدم راؤ۔ از جمیل جالبی۔

[۳] ولی۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۴ء

گویا وجؔہی کے کلام میں ستی، سوں، سیتی اور سے، پہلو بہ پہلو استعمال ہوئے ہیں۔ دکن کے معاصر قاضی محمود بحری کے یہاں 'سوں' اور 'سیتی' کے علاوہ 'تے' بھی موجود ہے مثلاً:۔

۱۔ اے جو تج تے جلوہ گر لو جیو سو ریوتی ہوا

۲۔ سو کیا کہ دل سوں ہے ترے دل متّصل مرا

۳۔ لہروں سیتی موہ نہ کیجیے جل ہر اکھیے ہوش [۴]

اس سے پچاس برس قبل غلام علی کے یہاں 'ستے' کے ساتھ 'سوں' بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل مصرعے دیکھیے:۔

۱۔ بھلائی ستے تو بھلا پائے گا

۲۔ جیے حق کی توفیق سوں کوئی دھات [۵]

غلام علی سے پچاس برس قبل قلی قطب شاہ اور اس کے درباری شعرا کے یہاں حرف 'تھے' ہی مستعمل نہ تھا بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو 'سیتی' اور 'سوں' وغیرہ بھی موجود ہیں۔ خود قلی قطب شاہ کے یہاں اس کا استعمال دیکھیے:۔

ا۔ سونا لودکر کر جگت تھے گنوایا

۲۔ پہلی گھڑی سانتی کے مینہ موتیاں سیتی نھاتی ہری

۳۔ کہ ہے مینہ روح تم باساں سوں زندہ [۶]

حسن شوقی کے یہاں 'تھے' کے علاوہ 'تے'، 'سوں' اور 'سیتی' بھی ملتے ہیں جیسے درج ذیل مصرعوں میں:۔

۱۔ سنو رتمن تے لیوے بار گاہ

۲۔ سگل مست ہاتی سوں ہاتی بھڑے

۴۔ قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری۔ ص ۲۲۹، ۱۳۱، ۱۳۲ ۔ ۱۲۳، مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حفیظ (مع مقدمہ و تشریح) مطبع نولکشور لکھنؤ۔

۵۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۲، مطبوعہ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ طبع اول سنہ ۱۹۵۶ء

۶۔ محمد قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ۔ ص ۹۷، ۲۲۵، ۲۲۷، مرتبہ سید محی الدین قادری زور۔ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء

۳۔ تجھ نین ماتا جو کوئی لین جام سیتی کام کیا

۴۔ تجھ زلف تھے اُپجا بھنور دو جا بھونک کالا ہوا ۷ے

لہذا زور کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اس زمانے میں صرف 'تھے' استعمال ہوتا تھا اور اس وقت اس میں 'س' کی آواز نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قلی قطب شاہ اور ان کے معاصرین کے یہاں 'تھے' کے ساتھ ساتھ بعض دوسری لغات بھی استعمال ہوئیں جن میں 'س' کی آواز موجود تھی۔ مزید برآں محمد قلی کے عہد سے پیشتر صرف 'تے' ہی استعمال نہیں ہوا اس کے علاوہ بھی بعض لغات ملتے ہیں۔ جہاں تک 'تے' کی موجودگی کا تعلق ہے اسے وجہی کے زمانے سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس سے قبل اور بعد، دونوں زمانوں میں یہ استعمال موجود رہا ہے۔ وجہی اور اس کے قریبی عہد میں 'تے' کے ساتھ جو دوسری لغات مستعمل رہیں ان کا ثبوت درج ذیل نمونوں سے بخوبی ملتا ہے۔ ابنِ نشاطی، قطب شاہی عہد کا شاعر ہے۔ اس نے ۱۰۶۶ ہجری میں اپنی مشہور مثنوی 'پھول بن' لکھی۔ اس کے چند مصرے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ دل و جاں سوں کہوں جاں آفریں کا

۲۔ الہی غیب کے پردے ستی تو

۳۔ توں سورج تھا اوسی تے چھپالوں تجھ نین ۸ے

غواصی کا ایک مصرع ہے : ترے رازسوں کوئی آگاہ نین ۹ے

کمال خاں رستمی بیجاپوری نے فارسی "خاور نامہ" کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۰۵۹ ہجری میں اسی عنوان کے تحت، پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس میں بھی 'تے' کے علاوہ بعض دوسری لغات مثلاً سوں، تھے، سیتی اور ستی کا استعمال پہلو بہ پہلو ملتا ہے جیسے :۔

۷ے حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۱ء

۸ے ابنِ نشاطی۔ مثنوی "پھول بن" ص ۶، ص ۴، ص ۱۔ مرتبہ شیخ چاند ابنِ حسین۔

۹ے غواصی۔ اردوئے قدیم ص ۶۵۔ مرتبہ شمس اللہ قادری۔ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء

۱- لوں خوش حالی سوں چھوڑ اس خاک کوں

۲- اسی تھا انگے کچھ بی گفتار نیں

۳- ہوئے خلق بی اس سیتی بہرہ مند

۴- ہلال اس وقت کہیا ان ستی

۵- عقل تجھ تے دھرتے ہیں روشن رواں [10]

ملا وجہی، جس نے ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے شاعری میں شہرت حاصل کرلی تھی اور گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعراء تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور کے اردو شعرا میں وجہی سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا۔ اس نے ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں اپنی مشہور مثنوی "قطب مشتری" لکھی۔ اس کے علاوہ اردو نثر میں دو کتابیں "سب رس" اور "تاج الحقایق" بھی اب تک دستیاب ہو چکی ہیں۔ سب رس، 'قطب مشتری' کے بہت بعد، سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء قلم بند ہوئی [11] اس کتاب میں "تے" کے علاوہ 'سوں' بھی ملتا ہے۔ چند جملے دیکھیے:-

۱- کھانے میں تے اڑیا لون۔

۲- دانش کے تیشے سوں پہاڑاں اٹھایا تو یو شیریں پایا۔

'سب رس' میں 'سے' اپنی موجودہ صورت میں بھی ملتا ہے مثلاً یہ جملہ:-

کیا عورت بکار، جس میں عشق کا نہیں درد، اس کتاب کو سینے پر سے ہلاسی نا۔ [12]

اب 'قطب مشتری' کے چند مصرعے دیکھیے:-

۱- بنایا توں ہر دم کوں بھو چاؤ سوں

۲- جے چیز اپنی قدرت تے پر گٹ کیا

۳- دکھایا ہنا کوں عدم میں تے توں

---

[10] کمال خاں رستمی بیجاپوری - خاور نامہ - صفحہ ۶، ۷، ۱۵، ۲۰، ۴، ۸، ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۸ء

[11] محی الدین قادری زور - دکنی ادب کی تاریخ - صفحہ ۶۷-۷۱ / [12] ملا وجہی - سب رس - صفحہ ۱۲، ۱۳، ۱۰ - مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن پریس کراچی - طبع چہارم ۱۹۷۷ء / نشاط پریس کراچی - جون ۱۹۶۰ء

۴۔ خدایا مجھے خیر دے سر ستی

۵۔ کہ وہ شہ پڑی ہوئی ہے تجھ سیتی یار [۱۳]

وجہی سے قبل شاہ برہان الدین جانم کے یہاں 'سوں' اور 'تھے' استعمال ہوا ہے[۱۴] مثال کے طور پر:۔

۱۔ سکتا قادر قدرت سوں سمجھ تجھ کوں کوئی کیا [۱۵]

۲۔ جن تھے روشن ہوئے ضمیر [۱۶]

ان سے پیشتر شاہ علی الحسینی گانوں دھنی گجراتی (م ۹۷۳ھ) کے یہاں 'سوں' استعمال ہوا ہے مثلاً یہ مصرع:۔

۱۔ سیں آئینہ مجہ سوں مانجے [۱۷]

شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء) کا ایک مصرع درج ذیل ہے:۔

پن پاپ سٹ دیجے اب شہ سوں میلا ہوئے تب [۱۸]

۱۳؎ ملا وجہی ۔ قطب مشتری ۔ شعر ۵۸ ۔ ۱ بیت ۔ ۳ ۔ ۳ ۔ صفحہ ۲ ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۔ سنہ ۱۹۵۳ء

۱۴؎ شاہ برہان الدین جانم، حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ ان کی ولادت اور وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں البتہ ان کی ایک نظم جو دستیاب ہوئی ہے اس کا سن تصنیف انہوں نے خود سنہ ۹۹۰ ہجری بتایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان کا انتقال اس کے بعد ہوا ہوگا ۔ زور نے لکھا ہے کہ جانم، ابراہیم عادل شاہ کے زمانے میں (سنہ ۱۵۳۴ء تا سنہ ۱۵۵۸ء) موجود تھے۔" ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۔ دکنی ادب کی تاریخ صفحہ ۳۱ ۔ نشاط پریس کراچی ۔ جون سنہ ۱۹۶۰ء

۱۵؎ مولوی عبدالحق ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۵۲، انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

۱۶؎ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۔ دکنی ادب کی تاریخ ۔ صفحہ ۳۵ ۔ نشاط پریس کراچی سنہ ۱۹۶۰ء

۱۷؎ شمس اللہ قادری ۔ اردوئے قدیم صفحہ ۴۸ ۔ نولکشور پریس لکھنؤ ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۱۸؎ مولوی عبدالحق ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۵۱ ۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۶ء

انہی کا ایک مصرع یہ بھی ہے کہ "تو کیوں من اس تھے بھاگے" ۱۹ ان کے یہاں "سے" اپنی موجودہ صورت میں بھی موجود ہے کہ "ہم تو راون لوڑیں اس تے جے ہے راون راؤ" ۲۰

ان سے ایک رسالہ نثر میں "مرغوب القلوب" ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کا جو نمونہ دیا ہے اس میں "تھے" اور "تی" استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل جملے :۔

۱۔ الوں تھے لبوج۔

۲۔ الوں تی توں سن ۔ ۲۱

شیخ بہاء الدین باجن (ولادت ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء وفات ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء) کے یہاں "تی" اور "سوں" ملتے ہیں۔ مثلاً :۔

۱۔ ریبا اجالا کہاں تی آوے

۲۔ عشق تو لبن خیال من جیو را تجھ سوں لایا رے ۲۲

یہ نمونے اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ وجہی اور اس سے پیشتر ۲۳ کی تحریروں میں "تے" کے علاوہ "سوں"، "تھے"، "تی"، "ستی"، "سیتی"، حتی کہ "سے" بھی پہلو بہ پہلو استعمال ہوئے ہیں جن کے بارے میں زور نے کہا ہے کہ "سے" کی موجودہ شکل صرف سوا سو سال ہی سے مستعمل ہے۔"

---

۱۹ مولوی عبدالحق - اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام - ص ۵۱ - انجمن پریس کراچی ۱۹۶۷ء

۲۰-۲۱ ایضاً ص ۵۱ - ص ۸۱ / ۲۲ ایضاً ص ۳۳

۲۳ محی الدین قادری زور نے "معراج العاشقین" کو وجہی سے قبل کی اردو تحریروں میں شامل کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں "تے" (حرف) استعمال کیا گیا ہے۔ دونوں ہی باتیں صحیح نہیں۔ اول "معراج العاشقین" سے مثالیں ملاحظہ ہوں:۔
جملہ ۱:۔ "یعنی واجب کے انگ (انگ) سوں غیر نہ دیکھنا سو" جملہ ۲:۔ "سو خالق ہیں تے خلق کوں اظہار کیا۔"
۳:۔ "اس کا معنا طلب کرنا اللہ کا فرض ہے سب فرضاں ستی اول ہے" معراج العاشقین ص ۳۵-۲۲-۱۷، مرتبہ تحسین سروری (مع مقدمہ و تصحیح و فرہنگ) مطبوعہ ۱۹۶۲ء۔

ان نمونوں سے واضح ہے کہ "معراج العاشقین" میں حرف "تے" ہی نہیں "ستی" اور "سوں" بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ دوسرے

زورؔ کی تحقیق کے مطابق قدیم ترین لفظ "نقش" ہے۔ اس کے استعمال کے سلسلے میں انہوں نے خوب محمد گجراتی، کی "خوب ترنگ" سے یہ مصرع نقل کیا ہے: غیرت تیں سب کیا قبول۔ حالانکہ خوب محمد گجراتی کے یہاں "سوں" کا استعمال بھی موجود ہے۔ ان کا ایک مصرع ہے: دیکھ مراتب سوں انسان[24] "خوب ترنگ" کا سنِ تصنیف ۹۸۶ ہجری ہے[25] ان سے بھی قبل کی بعض مثالیں، مثلاً شاہ علی الحسینی گاؤں دھنی (م ۹۷۳ ھ)، شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء)، شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء) کے نمونے نکال کر ہم نے اوپر درج کیے ہیں جن سے زورؔ کی رائے کی تردید ہوتی ہے۔ اس سے بھی قبل اگر دیکھنا چاہیں تو اب تک کی دستیاب دکنی تصانیف میں قدیم ترین تصنیف فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق یہ مثنوی ۸۲۵ ھ اور ۸۳۹ ہجری کے درمیانی زمانے کی تصنیف ہے لہٰذا قدامت کے اعتبار سے اسے "خوب ترنگ" پر تقدم زمانی حاصل ہے۔

بقیہ حاشیہ: - کہ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ "معراج العاشقین" جو کہ عرصے تک اردو کی پہلی نثری تصنیف مانی جاتی رہی ہے نہ صرف یہ کہ اس دور کی تصنیف (خواجہ گیسو دراز[2] کے دور کی) نہیں ہے بلکہ اس کے مصنف خواجہ گیسو دراز[1] کے بجائے مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں جنہوں نے گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر یا بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں "تلاوۃ الوجود" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ "معراج العاشقین" اسی کا خلاصہ ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: -

۱۔ اردو نثر کا آغاز و ارتقا۔ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ۔ سندھ آفسٹ پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۸ء

۲۔ "معراج العاشقین کا مصنف"۔ از ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۶۸ء ص ۲۹-۴۲

۳۔ مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ (مشمولہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ) از ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ص ۳۲ تا ص ۳۵۔

۲۴۔ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ ص ۲۲۶۔ اشرف پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۷۲ء

۲۵۔ ایضاً ص ۲۲۵۔

لہٰذا 'سے' کی مختلف لغات کا قدیم ترین استعمال، اس استعمال کو قرار دیا جا سکتا ہے جو اس مثنوی میں ہوا ہے۔ اس سلسلے میں مثنوی کے کچھ مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ جو باقر اپس تھی اٹھے تیں اٹھائے

۲۔ نبی یار تھے یار تھے جھار جھار

۳۔ کہ اس یتیں ہر اکچھ ناہیں کڈھنگ

۴۔ کہ توں بھی ہوا ایک ہر وار سوں

۵۔ سو فخر دیں اب کی سنوار سے

۶۔ نہ پورن لکن تد توحید تے

۷۔ چلو پیار سیتی جو ہر کوں دیشٹ

۸۔ مرد وہ دولتی ہوئے دھرسیتیں [26]

یہاں چند امور لائقِ توجہ ہیں:۔

۱۔ حرف 'سے' کی قدیم ترین شکل یا استعمال 'تیں' نہیں ہے۔

۲۔ 'سے' کی مختلف لغات جن کا استعمال زورؔ نے مختلف ادوار کے ساتھ مخصوص کیا ہے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں ایک ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔

۳۔ زورؔ کا کہنا ہے کہ پہلے اس میں 'س' کی آواز موجود نہیں تھی۔ غلام علی کے زمانے میں اور قطب شاہی سلطنت کے عہدِ آخر میں 'س' کا اضافہ ہوا اور جو لفظ پہلے 'تیں'، 'تے'، اور 'تھے'، کی صورت میں نظر آتا ہے اس دور میں 'س' کے اضافے سے 'ستے'، اور 'ستیں' بن گیا۔ لیکن مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" کے مندرجہ بالا نمونے اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں کہ 'س' کی آواز بھی ابتدا ہی سے موجود رہی ہے۔ 'سیتی' اور 'سیتیں'، کا استعمال دکنی میں قدیم سے ہے۔ ان تمام لغات کا پہلو بہ پہلو استعمال اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے

---

[26] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ طبع اول ۱۹۷۳ء

کہ ان تمام لغات کی بنیاد حرف 'تئیں' نہیں ہے۔ نہ ہی دوسری لغات 'تئیں' کی متغیرہ حالت کہی جاسکتی ہیں۔
۴۔ 'سے' کی موجودہ شکل جو زور کے نزدیک صرف سوا سو سال سے مستعمل ہے، مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں اس کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا استعمال کسی قریبی دور کی بات نہیں بلکہ یہ بالکل قدیم سے، اسی موجودہ شکل میں اور اپنی معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ یہ 'سے' کی قدامت کا بیّن ثبوت ہے۔ رہے دوسرے لغات تو ان میں سے ہر ایک، دوسرے سے الگ، آزاد حرف ہے۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں۔

زور نے دکنی اور گجراتی کے اختلافات کے ذیل میں ایک اور انکشاف یہ کیا ہے کہ گجراتی میں 'سے' کے معنوں میں 'سوں' بھی استعمال ہوتا تھا [۲۷] جب کہ حقیقت یہ ہے کہ "سوے" 'سے' کے معنوں میں نہیں بلکہ "سب" کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ شیخ خوب محمد چشتی گجراتی کا ایک شعر ہے:

جتناں طالب کوں بس ہوئے — میں اس مانہ کہیا ہے سوے [۲۸]

اس میں "سوے" 'وہی' اور 'وہ سبھی' کے معنوں میں ہے۔

قطبن [۲۹] ایک اور شاعر جو خوب محمد سے پہلے گزرا ہے۔ شیرانی نے لکھا ہے: قطبن عالباً ہندی شاعر ہے جس نے جائسی سے بھی سینتیس سال پہلے افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ ناگری پرچارنی سبھا کی تازہ دریافت کردہ کتابوں میں قطبن کی تصنیف 'مرگاوتی' بھی شامل ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے ان کے کلام سے جو نمونہ دیا ہے اس میں حسب ذیل شعر بھی ہے:

جیہہ کی بات دکھائی ہووے — پنچھے ایک نگ میں سوے [۳۰]

اس میں بھی 'سوے' کا استعمال 'سب' کے معنوں میں ہوا ہے۔ خود زور نے بھی ایک مقام پر 'سوئے' بمعنی 'سب' لکھا ہے۔ [۳۱]

---

[۲۷] محی الدین قادری زور۔ ہندوستانی لسانیات ص ۱۳۱۔ منصور پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۱ء

[۲۸] حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۲۲۵۔ اشرف پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۷۲ء

[۲۹] قطبن کے زمانے کے تعین کے سلسلے میں شیرانی نے لکھا ہے: میرے خیال میں قطبن کا سرپرست علاء الدین حسین شاہ والئی بنگالہ ہو گا جس نے سنہ ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء سے لے کر سنہ ۹۲۵ھ/۱۵۱۸ء تک حکومت کی۔ پنجاب میں اردو ص ۲۱۲

[۳۰] پنجاب میں اردو ص ۲۱۳

[۳۱] ہندوستانی لسانیات ص ۱۳۲

زور نے "سے" کے ارتقا کا جو نظریہ قایم کیا ہے اور جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، وہ صرف اس صورت میں امکانی ہو سکتا تھا جب کہ وہ قدیم ہندی اور سنسکرت میں "تیں" سے پہلے کی کوئی ایسی صورت دکھاتے جس کے بارے میں یہ تسلیم کیا جا سکتا کہ وہ "تیں" کا ماخذ ہے اور اس واحد لفظ میں عہد بعہد تغیرات ہوتے رہا ہے۔ اس تمام مفروضہ تراش خراش کے بعد بالآخر حرف "سے" باقی رہا، دوسرے لغات متروک ہو گئے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ انہوں نے خود اس امر کی توضیح کی ہے کہ مختلف لغات کے ماخذ بھی مختلف ہیں۔ ان کے نزدیک "سے" اور "سیں"، سنسکرت "سمتیں" سے ماخوذ ہیں۔ "سوں" کا ماخذ "سمہ" ہے۔ "سیتی" "سنتکیں" سے بنا ہے اور "تے" وغیرہ "سنت" سے ماخوذ ہیں [۳۲]

یہاں "سے" کے ماخذ کی بحث سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں بھی اس کے استعمال اور تغیرات کا جایزہ لے لیا جائے۔ شمالی ہند میں بھی قدیم زمانے سے، "سے" کے ساتھ اور کئی لغات مستعمل تھے جو بتدریج متروک ہوتے گئے اور بالآخر حرف "سے" کو باقی رکھا گیا۔ سودا کے زمانے تک "سے" کے علاوہ ایک اور لغت "سیتی" کا استعمال بھی ملتا ہے مثلاً سودا کا یہ مصرع: آج نئیں آتی چمن سیتی صدائے بے دلاں۔ اس وقت تحریکِ اصلاحِ زبان کے تحت یہ رجحان جاری تھا کہ اردو زبان کو دکنی الفاظ و اثرات سے پاک کیا جائے اور زبان اختصار کی جانب مائل تھی یہی سبب ہے کہ سودا کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے "سے" کے ساتھ دوسری لغات کا استعمال ترک ہو جاتا ہے صرف ایک لفظ "سیتی" کا استعمال مل جاتا ہے مگر کمی کے ساتھ۔ سودا سے قبل ان کے استاد حاتم کے یہاں بھی "سے" کے علاوہ حرف "ستی" کا استعمال ملتا ہے جیسے ان کا یہ مصرع: مو جیں جنوں کی دیکھ کے یکبار گی ستی [۳۳] ان سے قبل سراج الدین علی خاں آرزو (م ۱۱۶۹ھ) کے یہاں بھی حرف "ستی" دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کا ایک مصرع ہے: سات پروانے کی الفت ستی روتے روتے۔ ان سے کچھ قبل، شاہ نجم الدین آبرو (م ۱۱۵۰ھ) کے یہاں "سے"، "سیں" اور "ستی"، ساتھ ساتھ ملتے ہیں جیسے

---

[۳۲] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۲ حاشیہ۔ بحوالہ زور۔ ہندوستانی سنہ ۳۲ء حاشیہ ص ۵۱۲

[۳۳] شاہ ظہور الدین حاتم۔ دیوان زادہ۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ مارچ سنہ ۱۹۷۵ء مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

درجِ ذیل مصرعے:-

۱۔ نین سے نین جب ملائے گیا

۲۔ نگہ گرم حسین مرے دل میں

۳۔ آنکھوں ستی بہایا تب آبرو گنوایا [۳۴]

مفضلی کی "کربل کتھا" (تصنیف ۱۱۴۵ھ) میں 'سے' کے ساتھ 'سیتی' اور 'سوں' ملتے ہیں مثلاً:-

۱۔ بچھڑا تھا اپنے باپ سے بیٹا۔

۲۔ صدق سوں اس کی روح پر پک جا

۳۔ سر جدا تن سیتی کیا پل میں [۳۵]

فائز [۳۶] (م ۱۱۵۱ھ) کے یہاں 'سے' کے علاوہ 'سیتی' 'ستی' اور 'سوں' مستعمل رہے۔ جیسے یہ مصرعے:-

۱۔ خاک سیتی سجن اٹھائے گیا

۲۔ دیکھا ہوں زلف و رخ کی ترے جب ستی سجن

۳۔ جیسے زلف سیں بیقراری لگے

۴۔ اس گلی میں قدم کرم سوں دھرے [۳۷]

محمد افضل جھنجھانوی [۳۸] بھی شمالی ہند کے شاعر ہیں۔ ان کا تعلق میرٹھ کے قریب ایک بستی جھنجھانہ سے ہے۔ محمد افضل اور دکن کے قدیم شاعر وجہی کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ افضل نے "بارہ ماسہ" یا "بکٹ کہانی" کے نام سے

۳۴۔ نور الحسن ہاشمی۔ دلی کا دبستانِ شاعری ص ۱۲۸-۱۳۰۔ سرفراز پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۶۵ء

۳۵۔ مفضلی۔ کربل کتھا۔ ص ۸، ص ۵، ص ۲۔ دیال پرنٹنگ پریس۔ دلی۔ سنہ ۱۹۶۵ء (مرتبہ مالک رام و مختار الدین)

۳۶۔ مسعود حسین رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ "اردو کے صاحبِ دیوان شاعروں میں ان سے زیادہ قدیم کوئی شاعر اب تک معلوم نہیں"۔ مقدمۂ دیوانِ فائز۔ عمدہ پریس دہلی سنہ ۱۹۴۶ء

۳۷۔ فائز۔ دیوانِ فائز۔ ص ۱۷۸، ص ۱۷۷، ص ۱۸۰، ص ۱۸۹ / ۳۸۔ بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھیے۔

ایک طویل نظم لکھی۔ اس میں "سے" کے حسبِ ذیل لغات استعمال ہوئے ہیں:۔

۱۔ ہیر ہیوں کی آگ سیں سینہ جبر اتا (جلاتا)

۲۔ جلے جیو را مرا نیت آگ سیتی

۳۔ سُنوں (سُنی) جب مور کی آواز بن سوں

۴۔ تری مکھ سے اگر اک قول پاؤں (پاؤں) ۳۹

شمالی ہند کے ایک قدیم شاعر اسمٰعیل امروہوی بھی ہیں۔ ان کی دو مثنویاں دریافت ہوئی ہیں جو "اردو کی دو قدیم مثنویاں" کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں ایک مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہؓ" ہے جو ۱۱۰۵ ہجری کی تصنیف ہے۔ دوسری مثنوی "معجزۂ انار" ۱۱۲۰ ہجری کی تصنیف ہے۔ ان کی پہلی مثنوی سے چند مصرعے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں جن سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت بھی "سے" کے پہلو بہ پہلو بہت سی دوسری لغات مستعمل تھیں جو سودا کے دور تک آتے آتے متروک ہو گئیں۔

۱۔ زرو جوہر ان سے بھری ہے (ہیں) تمام

۲۔ خدیجہ سخن لیو النوں سوں سنا

۳۔ علی سیں بی بی بولیں خوش ہوے کر

۴۔ قبر بیچ جا سکھ ستے سوئیا

۵۔ لے کر سوں گھر سیتی مالک دیے

۶۔ بہشت تے حیدر کوں دیا کا ذکر ۴۰

حیدر بخش حیرتی بھی شمالی ہند کے ایک اور قدیم شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش ولی سے ایک صدی پہلے ہوئی۔ ولی

بقیہ حاشیہ:۔

۳۸ "مولانا شیرانی کے بقول انہوں نے ۱۰۲۵ھ میں انتقال کیا"۔ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل ص ۹۵ بحوالہ شیرانی۔

۳۹ شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۱ (قدیم نمونوں میں ہر جگہ پرانا املا برقرار رکھا گیا ہے)۔

۴۰ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ ص ۱۳۶-۱۳۵-۱۲۳-۱۱۴-۱۱۲-۱۱۲، نقوش پریس لاہور طبع اوّل ۱۹۶۹ء مرتبہ نائب حسین نقوی۔

سنہ ۱۰۷۹ ہجری میں اور برہمن سنہ ۹۸۲ ہجری میں پیدا ہوئے۔ برہمن، شاہجہاں کے دربار کے میر منشی، فارسی کے زبردست شاعر اور نثر نگار تھے۔ انہوں نے ۱۰۷۳ ہجری میں انتقال کیا۔ یعنی ولی کی پیدائش سے چھ سال پہلے۔ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو میں غزل سب سے پہلے انہی نے کہی۔ ان کی غزل "خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے" کو بعض محققین اردو کی اولین غزل کہتے ہیں۔ اس غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے:

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے [1]

ان سے قبل کا نمونہ "چند چھند برنن کی مہیما" میں ملتا ہے۔ اکبر کے عہد میں گنگ کوی نے ۱۵۷۲ عیسوی میں "چند چھند برنن کی مہیما" لکھی جو کھڑی بولی (ہندی) میں لکھی گئی۔ اس میں "سے"، اپنی موجودہ شکل میں استعمال ہوا ہے۔

اپنی اپنی مسل سے۔ [2]

امیر خسرو شمالی ہند کے قدیم ترین شاعر ہیں (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء)۔ امیر کا ہندی (اردو) کلام عام طور پر مستند نہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے ان کی دو اردو غزلیں "پنجاب میں اردو" میں نقل کی ہیں۔ شوکت سبزواری کے قول کے مطابق "جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ غزلیں ان کی نہیں، ہم ان سے لسانی نتائج نکال سکتے ہیں۔" ان دو غزلوں میں سے ایک کے بارے میں شیرانی نے لکھا ہے کہ یہ ایسی بیاض سے نقل کی گئی ہے جو تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی۔ اس غزل میں بھی "سے"، اپنی موجودہ صورت ہی میں ملتا ہے مثال کے طور پر حسب ذیل مصرع:

ع جب آنکھ سے او چنچل بیا تڑپن لگا میرا جیا [3]

ہندوستان کی "ناگری پرچارنی سبھا" نے راول سمر سنگھ اور پرتھوی راج کے شاہی پروانوں کا پتہ لگایا ہے۔ راول سمر سنگھ کے پروانے راجستھانی زبان میں ہیں لیکن پرتھوی راج کے پروانوں سے پرانی کھڑی بولی کی شکل

---

[1] پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ کیفیہ۔ ص ۲۵-۲۶۔ مطبوعہ سنہ ۱۹۵۰ء انجمن ترقی اردو پاکستان۔ طبع دوم۔

[2] ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ص ۱۱۹، مطبع عالیہ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء

[3] حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ ص ۱۴۲ اشرف پریس لاہور۔ طبع چہارم سنہ ۱۹۷۲ء

جھلکتی ہے۔ چنانچہ بارھویں صدی عیسوی کے ایک پروانے میں "سے" کا استعمال بالکل موجودہ صورت میں ملتا ہے:

"تم نے کاکاجی کے دوائی آرام جٹو جین کے ربیج میں راگڑ روپیہ ۵۰۰۰ تمرے آباٹی

گوڑے (گھوڑے) کا کرچہ سوائے آویں گے۔ کھجانم سے انم کو کوئی معاف کریگے"۔ ۴۴

اس سے 'سے' کے استعمال کی قدامت کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر یہ پرتھوی راج کا حقیقی پروانہ ہے تو اس سے

زیادہ قدیم تحریر کا ملنا فی الحال ممکن نہیں۔ ۴۵

اس تمام مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شمالی ہند میں سودا کے زمانے تک 'سے' کے علاوہ 'ستی' کا وجود تھا جو ان کے بعد متروک ہو گیا۔ سودا سے قبل حاتم اور آرزو کے یہاں بھی 'ستی' ملتا ہے۔ آبرو کے یہاں 'ستی' اور 'سے' کے علاوہ 'سیں' بھی ہے۔ فضلی کے یہاں یہ تینوں لغات ملتے ہیں۔ فضلی سے قبل فائز کے یہاں 'سے'، 'ستی' اور 'سیں' کے ساتھ ساتھ 'سوں' بھی نظر آتا ہے۔ فائز سے قبل اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی میں 'سے'، 'سوں'، 'سیں' اور 'ستی' کے علاوہ 'ستے' اور 'تے' پہلو بہ پہلو استعمال ہوئے ہیں۔ چندر بھان برہمن کے یہاں 'سیں'، اور افضل جھنجھانوی کے یہاں 'سیں'، 'سوں'، 'ستی' اور 'سے' پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ امیر خسرو کے کلام اور پرتھوی راج کے فرمان میں صرف 'سے' کا استعمال ملتا ہے۔ اس کے علاوہ 'سم' اور 'سن' ہندی میں ملتے ہیں۔ چند بردائی نے 'سم' کو 'سے' کے معنوں میں کئی جگہ استعمال کیا ہے جیسے کہ کنتی سم کنت (۱-۱۱)

"تمی سثاوک اندرسم" (۲-۱۱۰) بلی لگو جدہا اندرسم (۲-۲۱۸) پراکرت میں اس مفہوم کے لیے

"سنتو" استعمال ہوتا تھا۔ ۴۶

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ دکنی اردو میں قدیم ترین تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" میں 'سے' بالکل اپنی موجودہ

---

۴۴ ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو۔ صفحہ ۸۰ مطبوعہ مطبع عالیہ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء

۴۵ حافظ محمود شیرانی نے ان فرامین پر سے بے اعتباری کا اظہار کیا ہے اور انہیں وضعی اور جعلی قرار دیا ہے۔ دیکھیے 'پرتھوی راج راسا' مطالب و تنقید و تبصرہ از حافظ محمود شیرانی۔ انجمن ترقیٔ ہند دہلی سنہ ۱۹۴۲ء

۴۶ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا صفحہ ۲۳۱ مطبوعہ داس پریس ڈھاکہ سنہ ۱۹۵۶ء

صورت میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے ساتھ تمام دوسرا لفاظ بھی ملتے ہیں۔ یعنی تھے، یقین، سوں، تے، سیتی اور سیتیں۔ یہ ۸۲۵ و ۸۳۹ ھ کی بات ہے۔ اس کے بعد وجہی کے یہاں سے کے ساتھ دوسری لفاظ بھی ملتی ہیں البتہ سیں، نہیں ملتا۔ کمال خاں رستمی کے یہاں تے، سوں، تھے، سیتی اور ستی استعمال ہوئے، یقین اور سیں نہیں۔ حسن شوقی کے یہاں تے، تھے، سوں اور سیتی۔ قلی قطب شاہ کے یہاں سے، تھے، سیتی اور سوں، کا استعمال ملتا ہے۔ تے، یقین، سیں اور سیتیں کا وجود نہیں۔ قاضی محمود بحری کے یہاں سوں، سیتی اور تے ملتا ہے دوسرا لفاظ نہیں۔ جب کہ ولی کے یہاں ستی، سوں، سیتی اور سے، باقی رہ جاتا ہے۔ تے، تھے، سیں، یقین، ستے اور سیتیں کا استعمال ان کے یہاں نہیں ملتا۔

ولی ۱۱۱۲ ہجری میں دہلی آئے اور ۱۱۳۲ ہجری میں ان کا دیوان یہاں پہنچا۔ ان کے اثر سے شمالی ہند میں اردو شاعری کا زور شور سے چرچا ہوا۔ شعرا نے ان کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ حاتم نے تو اردو شاعری میں انہیں اپنا استاد مانا ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے شعرا نے ولی کی زبان (دوسرے لفظوں میں دکنی اردو کی خصوصیات) کو بھی شعوری اور لاشعوری طور پر قبول کیا ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شمالی ہند میں اردو کے جو تحریری نمونے ملتے ہیں ان میں سے بعض ولی کی دہلی آمد سے بہت پہلے کے ہیں اور ان میں سے، کے علاوہ بعض ایسی لفاظ استعمال ہوئی ہیں جو دکنی و گجراتی اردو میں بھی استعمال ہوتی رہیں مثلاً افضل جھنجھانوی کے یہاں سیں، سوں اور سیتی کا استعمال۔ چندر بھان برہمن کے یہاں سیں، اور ان کے بعد، اسمٰعیل امروہوی کے یہاں سے، سوں، سیں اور سیتی کے علاوہ ستے اور تے، کا استعمال۔ ان کے بعد فائز کے یہاں سے، ستی، سیں اور سوں ہے۔ گویا شمالی ہند کی اردو میں دکنی اثرات ولی کی آمد سے قبل ہی راہ پا چکے تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ولی کی آمد سے پہلے بھی شمالی ہند اور دکن کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا جس کی وجہ سے دونوں جگہ کی اردو ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتی رہی۔

ابتدا میں اردو شمالی ہند سے دکن پہنچی اور وہاں شاہانِ دکن کی سرپرستی میں اس نے نشو و ارتقا پایا۔ اس کے بعد جب اردو کے باب میں دوبارہ شمالی ہند کو مرکزیت حاصل ہوئی تو یہاں کے

ص ۱۷ سے

شعرا کی توجہ اصلاحِ زبان کی جانب ہوئی۔ تاکہ اسے غیر اردو اثرات سے پاک کیا جائے اور تراش خراش کر زیادہ
شستہ و شائستہ بنایا جائے۔ اخذ و قبول اور ترک و انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا۔ حاتمؔ کے زمانے میں
یہ رجحان بہت واضح ہے۔ انہوں نے اصلاحِ زبان کی جانب توجہ کی۔ جس کے نتیجے میں بہت سے حروف و الفاظ و
مرکبات متروک قرار دیے گئے۔ انہی حروف میں حرفِ جر "ستی"، اور "سیتی" بھی شامل ہے۔ اسے متروک قرار
دے کر حرف "سے"، کو برقرار رکھا [۴۷] البتہ اس زمانے میں اس پر سختی سے عمل نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ
ہے کہ خود حاتمؔ اور ان کے معاصرین کے علاوہ بعد کے زمانے میں بھی یہ استعمال بدستور جاری رہا۔ چنانچہ خود حاتمؔ کے شاگرد
سوداؔ کے کلام میں بھی اس کا استعمال مل جاتا ہے لیکن نسبتاً کم۔

سراج الدین علیخاں آرزوؔ اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے بھی اصلاحِ زبان کی طرف توجہ کی۔ ان کے دور میں جو
اصلاحات ہوئیں ان کا ذکر مرزا جان طپشؔ نے "دیباچہ کلیاتِ مرزا جان طپش" میں کیا ہے۔ اس میں انہوں نے جہاں
اور متروکات و تصرفات کا ذکر کیا ہے وہاں ایک یہ تصرف بھی لکھا ہے کہ "بعض لفظوں میں سے حروف کا گرا دینا مثلاً
'ستی'، جو 'سے'، کے معنے میں مستعمل تھا اس کی 'ت' گرا دی گئی اور فقط 'سے'، کو اسی معنے میں تسلیم کر لیا گیا۔" [۴۸]
یہاں قابلِ غور امر یہ ہے کہ 'ستی' کی 'ت' گرانے سے 'سی' باقی رہتا ہے نہ کہ 'سے'۔ دوسرے یہ کہ 'ستی' کے پہلو بہ پہلو
قدیم دور ہی سے اردو میں 'سے'، موجود تھا لہٰذا اسے وضع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

انشاء اللہ خاں انشاؔ نے ۱۲۱۲ھ / ۱۸۰۷ء میں اپنی مشہور کتاب "دریائے لطافت" لکھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اردو میں
مجبوری حالت کے لیے میرؔ و مرزاؔ کے عہد تک "سے" کے ساتھ اس کی مندرجہ ذیل شکلیں مستعمل تھیں:۔

۱. سیں (یائے مجہول) سیں (یائے معروف) پورب بولتے تھے۔

۲. سوں۔ ساداتِ بارہہ کی اولاد کی زبان تھی۔

---

۴۷ ظہور الدین حاتمؔ۔ دیباچہ دیوان زادہ۔ ص ۴۰۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ مارچ ۱۹۷۵ء

۴۸ ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی کا مضمون "اردو زبان کی ابتدا؟ کلیاتِ طپش کا دیباچہ از مرزا جان طپش"
شائع شدہ "اردو" اکتوبر ۱۹۲۹ء۔

۳۔ ستی (س مکسور یائے معروف) سیتی (یائے اول مجہول) قدمائے اردو کی زبان پر تھا ۴۹

مشہور مستشرق ڈاکٹر گلکرسٹ نے اردو زبان کی قواعد سے متعلق اپنا "رسالۂ گلکرسٹ" لکھا جو ۱۸۲۰ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس میں گلکرسٹ نے حروف کی بحث کے ذیل میں مجبوری 'سے'، اور اس کی دو ایک لغات 'سی' 'سوں' اور 'ستی' کا ذکر کیا ہے ۵۰۔ گویا "رسالۂ گلکرسٹ" کے زمانۂ تصنیف کے وقت تک یہ لغات بدستور مستعمل تھیں۔ البتہ اس سلسلے میں ان لغات کے ترک کا خیال پیدا ہو چکا تھا جس کا ثبوت حاتم کے دیباچۂ دیوان زادہ اور مرزا جان طپش کے دیباچے سے ملتا ہے۔

اصلاحِ زبان کے سلسلے میں ناسخ کا نام اردو میں ہمیشہ باقی رہے گا۔ انہوں نے زبانِ اردو میں جو اصلاحات کیں ان کی ایک طویل فہرست صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرے "جلوۂ خضر" میں دی ہے۔ اس میں مجبوری 'سے'، کا ذکر بھی ہے اور یہ صراحت کی گئی ہے کہ میر و سودا کے زمانے میں 'سے' کے علاوہ 'سیتی' اور 'ستے' کا استعمال ہوتا تھا۔ اسے ناسخ نے بالکل ترک کر دیا اور صرف ایک لغت 'سے' کو برقرار رکھا ۵۱۔

غرض میر و سودا کے بعد 'سے' کے دوسرے لغات کا استعمال متروک ہو گیا۔ 'سے' کو برقرار رکھنے کا سبب یہ ہے کہ یہ اردو کی اپنی چیز ہے۔ اسے کسی دوسری زبان سے نہیں لیا گیا۔ نہ ہی یہ 'سے' کی دوسری لغات کی مغیرہ صورت ہے۔ یہ بالکل ابتدا ہی سے اسی صورت اور اپنی معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ دوسری لغات آس پاس کی زبانوں کے اثرات کا نتیجہ تھے لہٰذا ترک کر دیے گئے۔ دوسری زبانوں میں حرفِ 'سے' کی حسبِ ذیل شکلیں ہیں:۔

بنگالی:۔ ہوئیتے۔ تیں — پنجابی:۔ تیں۔ تھیں۔ تھوں

سندھی: کھاں، کھوں، تاں، توں۔ — گجراتی:۔ تھی

۴۹۔ شوکت سبزواری۔ داستانِ تاریخ اردو۔ ص ۱۲۰۔ بحوالہ انشا۔ ترجمہ دریائے لطافت۔

۵۰۔ ڈاکٹر گلکرسٹ۔ قواعدِ زبانِ اردو مشہور بہ رسالۂ گلکرسٹ۔ ص ۵۴۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۲ء

۵۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۲۷۴۔ حمایت الاسلام پریس لاہور۔ ۱۹۶۷ء

مرہٹی :- ہوں   چلپاوانی :- سن، سین

مالوائی :- سوں   برج بھاشا :- تے

اردو "سے"، ان میں سے کسی سے بھی جوڑ نہیں کھاتا۔ اردو میں "سے"، ساتھ کے معنوں میں ہے اس کے ہم معنی حروف دوسری زبانوں میں یہ ہیں :-

برج — سوں۔   جدید مرہٹی :- سُن

قدیم مرہٹی :- سی یا سیں۔   گجراتی :- شوں یا شیوں

قدیم ہندی :- سوں   سندھی :- سیں، ساں۔ ۵۲

ان میں سے کسی ایک کو بھی "سے"، کا ماخذ نہیں ٹھہرا سکتے۔ البتہ یہ تمام لغات چونکہ دوسری زبانوں میں مجروری "سے" کے معنوں میں مستعمل تھے لہٰذا ممکن ہے کہ یہ سب غالباً کسی ایک قدیم حرف سے بنے ہوں۔ یا ان کا ماخذ ایک ہو پھر علاقائی اثرات نے ان کی ظاہری صورت تبدیل کر دی ہو۔ یہ حرف کیا رہا ہوگا اس سلسلے میں مشہور ماہر لسانیات، شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ اردو "سے" اور اس کے ہم معنی تمام حروف کی اصل ایک اور قدیم حرف "سَم" ہے۔ یہ حروف سب ایک اصل سے پھوٹی ہوئی شاخیں ہیں۔ اس لیے ایک دوسری سے اتنی مشابہ ہیں۔ ۵۳

ماخذ کی بحث ۵۴

"سے" کے مختلف لغات کا ساتھ ساتھ استعمال بتاتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں ۵۵ پاس پڑوس کی زبانوں سے یہ اردو میں چلے آئے۔ شوکت صاحب کے خیال میں "تے"، پنجابی یا برج سے سولہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ دکنی اردو میں ۲ یا اور تیں، پنجابی یا گجراتی سے۔ ہماری زبان کا اصل کلمہ "سے"، یا "سیں" ہے

---

۵۲ شوکت سبزواری - لسانی مسائل - صفحہ ۵۱-۵۲ - انجمن پریس کراچی - طبع اول سنہ ۱۹۶۲ء

۵۳ ایضاً صفحہ ۵۲ / ۵۴ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا صفحہ ۲۲۳ تا صفحہ ۲۲۶، دی کی پریس ڈھاکہ۔

۵۵ اس حقیقت کو زور نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ وہ "سے"، اور "سیں"، کو سنسکرت "سمتیں" سے ماخوذ مانتے ہیں، "سوں" کو "سمہ"، "سے"، "سیتی" کو "سنگیں"، "سے اور تے"، وغیرہ کو "سنت" سے۔ (ہندوستانی سنہ ۳۲ء صفحہ ۵۱)

'سے' یا 'سیں' کی اصل समं ہے (سمم)۔ جو سنسکرت متعلق فعل संमं (سَمَم) سے ماخوذ ہے[56]۔ اس کا ایک روپ 'سن' सन بھی تھا۔ سَمَم یا سَن کے معنے 'ساتھ' کے ہیں۔ اول اول 'سے' اردو میں 'ساتھ' کے معنے دیتا تھا۔ لاٹھی سے یعنی لاٹھی کے ساتھ۔ 'میں نے زید سے کہا' کا مفہوم تھا 'میں نے زید کے ساتھ بات کی'۔ مجروری اور آلی حالتوں میں خاص تعلق ہے اور 'پالی' میں ان کے لیے علامتیں بھی ایک جیسی ہیں۔ اس لیے 'سے' جو آلے کے لیے وضع ہوا تھا مجروری حالت میں استعمال ہونے لگا۔ اس کے تغیرات بھنڈارکر نے یہ بتائے ہیں:۔

'سمم' اول सआँ (ساں) ہوا۔ اس لیے کہ سنسکرت (کما، کا 'م') حرفِ علت اور 'ن' غنہ سے بدل جاتا ہے تلمین (لمن کے لیے) جب य (ی) اس پر اضافہ ہوئی تو सयं (سیں) بنا۔ 'سیم' سے 'سیں' اور پھر 'سے'۔ 'ی' کی جگہ 'واؤ' اضافہ ہوا تو सवं (سوں) ہوا۔ اس طرح اردو کے یہ تین کلمات بنے۔ سوں - سیں - سے[57]۔ بھنڈارکر کے بتائے ہوئے تغیرات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ 'سے'، سوں اور سیں کی ترقی یافتہ صورت ہے یعنی 'سوں' اور 'سیں' سے ڈھلی ہوئی صورت۔ حالانکہ اردو ادب کے مختلف ادوار میں 'سے' کے استعمال کا جو مطالعہ اوپر درج کیا جا چکا ہے اس سے بھنڈارکر کے خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کیونکہ 'سے' اس وقت سے اردو میں استعمال ہوتا رہا ہے جس وقت سے ادبِ اردو کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ لہٰذا 'سے' سوں اور سیں سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔

ھورنلے بھی بھنڈارکر کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔ وہ 'سے' 'سیں' وغیرہ کو सन्तो (سُنتو) سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ 'سنتو' کا اصل روپ 'سنتو' ہے جو 'اس' (ہونا) سے اسم حالیہ ہے۔ 'سوں' ان کے خیال میں "سنتو" سے لیا گیا اور 'سے' اور 'سیں' اس کے ایک فرضی روپ "سینتو" سے۔ جو غالباً "سنتو" پر قیاس کر کے وضع کر لیا گیا تھا[58]۔

---

[56] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ دی مٹی پریس ڈھاکہ بحوالہ بیمز۔ ج ۲ - ص ۲۷

[57] ایضاً۔ بحوالہ بھنڈارکر ص ۲۵۱۔

[58] ایضاً بحوالہ ھورنلے۔ گرامر ص ۲۲۸۔

کیلاگ نے اپنی گرامر کے پہلے ایڈیشن میں "سے" کا ماخذ स स्य (سیے) کو قرار دیا تھا جو स (س) کی اضافی حالت ہے۔ پراکرت میں ایک स (س) گرا تو स्य (سے) باقی رہا۔ اگرچہ دوسرے ایڈیشن میں کیلاگ نے اس خیال سے رجوع کر لیا اور اس کی جگہ "سنگے" (ساتھ) کو "سے" کا ماخذ ٹھہرایا [۵۹]

سنسکرت علامتِ اضافت स्य (سے) اور اردو से (سے) دونوں کی اصل (س) ہے۔ قدیم آریائی زبان میں "س" اور "ج" ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے تھے۔ سنسکرت "ج" (بمعنی اور) غالباً "س" ہی کا ایک روپ ہے۔ جولس بلاک نے لکھا ہے کہ "س"، "ش"، کا "ج" اور "جھ" سے تبادلہ "ہند آریائی" زبانوں میں قدیم سے ہے [۶۰] اس کے علاوہ ولنر کہتے ہیں کہ سنسکرت کی صورتوں کا "جھ" "ہند یورپی" زبانوں میں "سک" تھا [۶۱] فارسی "از" قدیم فارسی کا "ھچ" ہے [۶۲] سنسکرت च (ج) اور قدیم فارسی "ھچ" ایک ہیں۔ "ز" جدید فارسی میں بطور علامتِ اضافت مستعمل ہے۔ "از من" یا "زمن" کے معنے ہیں "میرا" (یا مجھ سے)۔ "از" اور "سے" اصل اور معنے دونوں کے اعتبار سے ایک ہیں۔ جس طرح "از" مجروری اور اضافی دونوں حالتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے "سے" بھی کسی زمانے میں دونوں کے لیے مستعمل تھا۔ لیکن اردو میں اب وہ صرف مجروری معنے دیتا ہے اور اس کا اضافی مفہوم، امتدادِ زمانہ اور ارتقائے لسان کے زیرِ اثر فراموش ہو گیا ہے۔

پلیٹس، "سے" کو "سیح" سے ماخوذ بتاتے ہیں [۶۳] "سیح" کا "س"، فارسی میں "ہ" سے بدل گیا [۶۴] اس صورت میں فارسی "ھچ" اور سنسکرت "سیح" ایک نظر آتے ہیں۔ "سیح"، "س" اور "ج" سے مرکب ہے اور دونوں ہم معنے ہیں۔ اس لیے یہ کلمہ دوہرا یا مرکب لاحقہ ہے۔ قدیم اردو میں "چا" بطور لاحقۂ اضافت

---

[۵۹] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ دی ٹی پریس ڈھاکہ۔ بحوالہ کیلاگ۔

[۶۰] ایضاً۔ بحوالہ مرہٹی زبان ص ۱۱۱

[۶۱] ایضاً۔ بحوالہ ولنر۔ مبادی پراکرت ص ۶۳ حاشیہ۔

[۶۲] ایضاً ص ۲۳۵ بحوالہ فارسی گرامر۔

[۶۳] ایضاً ص ۲۳۵ بحوالہ اردو گرامر، پلیٹس۔

[۶۴] ایضاً ص ۲۳۵ بحوالہ مقدمہ آدی گرنتھ ٹرمپ۔

مستعمل تھا جو آج مرہٹی میں ہے۔ غالباً وہ قدیم ابدال کی ایک نشانی ہے ۶۵

'تے' کی اصل سنسکرت علامت तस (تس) ہے جو اسما کے آخر میں ابتداظاہر کرنے کے لیے اضافہ کی جاتی تھی۔ جیسے نگرتہ (شہر سے) گرحتہ (گھر سے) ۶۶ بھنڈارکر اسے اپ بھرنش तेहि (تہیں، لیے) سے ماخوذ بتاتے ہیں اور ہورنلے "پترتے" سے ۶۷ اس صورت میں مجروری حالت کو مفعول ثانوی حالت سے ماخوذ ماننا پڑے گا۔ جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ 'سے' اور 'تے' کی ترکیب سے 'ستے' اور 'سیتے' وجود میں آئے۔ یہ دو ہرے لاحقے ہیں اور دوہرے لاحقے ہماری زبان میں بہت ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ 'ستے' سنسکرت لاحقہ स्तात (ستات) سے بنا ہو۔ یہ لاحقہ سنسکرت میں 'سے' کے معنے دیتا تھا۔ جیسے ادھستات (نیچے سے) پرستاتہ (آگے سے) ۶۸ جس طرح 'تس' سے 'تے' بنا 'ستات' سے 'ستے' وجود میں آیا۔ مہاراشٹر مجروری لاحقہ جو तु (تو) اور सु (سو) کی ترکیب سے "سُنتو" وضع کیا گیا جس میں 'تو' مجروری تھا اور 'سُو' ظرفی۔ عجب نہیں کہ "ستے" بھی 'س' اور 'تے' کی ترکیب نے 'سنتو' کی مثال پر گھڑ لیا گیا ہو ۶۹

'تھے' اور 'تھیں' کی اصل 'ستے' ہے۔ یہ اگر پنجابی اور گجراتی سے درآمد نہیں ہوئے تو کسی قدر بعد کی پیداوار ہیں یا یوں کہئے کہ 'ستے' سے متاخر ہیں۔ 'س' اور 'ت' مل کر ہماری جدید بولیوں میں 'تھ' ہوئے جیسے ہاتھ (سنسکرت ہست)۔ ہاتھی (سنسکرت ہستی)۔ 'تھے' اسی صوتی میلان کا نتیجہ ہے۔ بھنڈارکر 'تھے' کو तहि (تہیں) کا مولود بتاتے ہیں "تہیں" مہاراشٹر سے اور 'تت' (وہ)

---

۶۵ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۵ دی ٹی پریس ڈھاکہ سنہ ۱۹۵۶ء۔ بحوالہ مقدمہ آدی گرنتھ ٹرمپ

۶۶ ایضاً ص ۲۳۵ بحوالہ بیمز ج ۲۔ ص ۲۷۳۔

۶۷ ایضاً ص ۲۳۵ بحوالہ بھنڈارکر ص ۲۵۴۔ و۔ ہورنلے ص ۲۲۶۔

۶۸ ایضاً ص ۲۳۵ بحوالہ وھٹنی۔ سنسکرت گرامر

۶۹ ایضاً ص ۲۳۵، ۲۳۶۔

کی ظرفی حالت ہے۔ صوتی لحاظ سے تو اس میں کوئی مشابہت نہیں لیکن معنی اور مفہوم کے اعتبار سے مجبوری "تئیں" کو ظرفی "تئیں" سے نکالنا کچھ مناسب نظر نہیں آتا۔[1] ان مختلف لغات و کلمات کی تاریخی ترتیب اس طور پر ہے :۔ (۱) سے (پرتھی راج کے پروانے، چندر بھند برن کی ہیبا اور ایرخرو کے یہاں) (۲) سیں (چندر بھان برہمن کے یہاں)۔

(۳) سے ۔ سیں ۔ سوں ۔ سیتی ۔ (افضل جھنجھانوی)۔

(۴) سے ۔ سیں ۔ سیتی ۔ سوں ۔ ستے اور تے (اسمٰعیل امروہوی)

(۵) سے ۔ سیں ۔ سیتی ۔ سوں ۔ ستی ۔ (فائز)

(۶) سے ۔ سیتی ۔ سوں (مظہر)

(۷) سے ۔ سیں ۔ ستی (آبرو)

(۸) سے ۔ ستی ۔ (آرزو ۔ حاتم، سودا)

(۹) سے (سودا کے بعد کا دور)۔

شمالی ہند میں "سے" اور اس کی مختلف لغات کی مندرجہ بالا صورت تھی ۔ انشا نے "دریائے لطافت" میں شمالی ہند کے مختلف علاقوں کی بول چال لکھی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو میں مجبوری حالت کے لیے میر و مرزا کے عہد تک "سے" کے ساتھ اس کی حسبِ ذیل شکلیں رائج تھیں (ان کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے):

(۱) سیں (بیائے مجہول) سیں (بیائے معروف) ہندو بولتے تھے۔

(۲) سوں ۔ ساداتِ بارہہ کی اولاد کی زبان تھی ۔

(۳) ستی (س مکسور، معروف) سیتی (یائے اول مجہول) قدمائے اردو کی زبان پر تھا۔

---

[1] بابو رام سکسینہ نے "سے" کو "سیتی" سے، "سوں" کو "سمہ" یا "سمین" سے، "سیتی" کو "سنتکیں" سے اور "تے" کو "تئیں" سے نکالا تھا ۔ ڈاکٹر زور نے سکسینہ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔
اودھی کا ارتقا ۔ ص ۲۲

[2] بنجمن شلزے نے (اٹھارویں صدی کا نصف اول یعنی) ۱۷۴۱ء میں "ہندوستانی گرامر" مرتب کی اس نے "سے" کے (بقیہ آگے)
بنجمن شلزے ۔ ہندوستانی گرامر ۔ ترتیب و ترجمہ و تعلیقات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔ زرین آرٹ پریس لاہور طبع اول ۱۹۷۷ء

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیں، سوں اور ستی بھی شمالی ہند کی بول چال کی زبان میں شامل تھے۔ بنجمن شلزے[۷۱] نے بول چال کی زبان کے نمونے سامنے رکھتے ہوئے ۱۷۴۱ء میں اپنی قواعد "ہندوستانی گرامر" مرتب کی اور یہ عہد دہلی میں محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کا ہے۔ اس میں اس نے "سے" کے علاوہ ستی، سیتے اور سوں کا بھی اندراج کیا ہے مگر "سے" کا استعمال زیادہ عام ہے[۷۱]

"سے" کی بعض دوسری لغات مثلاً سیں اور سوں کا نون غنہ ایسی چیز ہے جو بعض دوسرے کلمات کے آخر میں بھی لاحق ہوا کرتا تھا۔ شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ "قدیم اردو کے بہت سے کلمات کے آخر میں "ں" (نون غنہ) ہوا کرتا تھا۔ یہ نون غنہ بے جان تھا اور امتدادِ زمانہ کے اثر سے اپنی افادیت ضائع کر چکا تھا اس لیے نیرنگئ دوراں کی نذر ہوا۔ اردو والے نے، کو "نیں"، "سے" کو "سیں"، "کو" کو "کوں"، "کرنا" کو "کرناں" بولا اور لکھا کرتے تھے[۷۲] انشا کا کہنا ہے کہ "یہ شاہجہاں آباد (دہلی) کی زمین کا فیض ہے کہ کلمے کے آخر سے "ں" غنہ کا دُم چھلا اُڑ گیا۔ ورنہ ساداتِ بارہہ کے بڑے بزرگ جو اپنے وطن میں رہے "کو" کو "کوں" بولتے تھے۔"[۷۳]

قیاس کہتا ہے کہ "سیں" اور "سوں" درحقیقت "سے" اور "سو" تھے۔ "سے" کی "ی"، علاقائی فرق کے باعث واؤ سے بدل گئی اور "سو" ہو گیا۔ بعد میں جب شاہجہاں آباد کی زبان کو ٹکسال کی سند حاصل ہو گئی تو "سو" بھی باقی نہ رہا صرف "سے" رائج و برقرار رہا۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ سوں قدیم ہندی میں موجود تھا وہاں سے بعینہٖ اپنا لیا گیا اور اصلاحِ زبان کی تحریک کے زیرِ اثر بعد کو اسے ترک کر دیا گیا۔[۷۴]

بقیہ حاشیہ[۷۱] ساتھ دوسری لغات ستی، سیتے اور سوں کا اندراج کیا ہے اور عام بول چال کی زبان کے نمونے دیے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو یہ اعتراض ہے کہ بنجمن شلزے نے "اس زبان کی طرف توجہ نہیں کرتا جو ان شاعروں اور نثر نگاروں کی کوششوں سے پروان چڑھ رہی تھی بلکہ وہ عام بول چال کی زبان کے جو نمونے پیش کرتا ہے وہ اس زمانے کی معیاری بول چال کے نمونے مشکل سے کہے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مقدمہ ہندوستانی گرامر (بنجمن شلزے)۔ زرین آرٹ پریس لاہور، ۱۹۷۷ء

۷۲۔ شوکت سبزواری۔ داستانِ زبانِ اردو ص۱۲۸۔

۷۳۔ ایضاً ص۱۲۸ بحوالہ انشا۔ دریائے لطافت۔

۷۴۔ یہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے اگر ہم یہ مان لیں کہ "سے" کا ماخذ "سم"، یا "سنگ" ہے تو بقول شوکت سبزواری (بقیہ آگے)

"تے" یا "تی" ہرج بھاشا میں مستعمل تھا غالباً اسی سے کھڑی بولی (اردو) میں در آیا۔ کہیں یہ اپنی اصل صورت میں رہا اور کہیں "سے" یا "س" کے اضافے سے "ستے" اور "ستی" کی شکل میں استعمال ہوتا رہا۔[۵۷] دکن میں اس کی موجودگی شمالی ہند کے اثرات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہاں کے آس پاس کے علاقوں میں "تے" یا "ستے" کا وجود نہیں۔ جس کے اثر سے دکن میں اس کے وجود کا امکان ہو سکتا۔

بقیہ حاشیہ ۵۶ سنسکرت کا "م"، حرفِ علت سے اور "نون غنہ" سے بدل جاتا ہے۔ اس اعتبار سے "سم" کا "میم"، "واؤ" سے بدلا اور نون غنہ اس کے بعد لاحق کیا گیا (سَم میں نون غنہ موجود ہے) تو "سوں" ہو گیا۔ یہی میم، کسی علاقے میں "ی" (حرفِ علت) سے بدلا تو "سیں" ہو گیا۔

۵۷ ستے اور ستی کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قدما میں یائے معروف و مجہول کے درمیان کوئی روا نہ تھی۔ اس لحاظ سے یہ املائی فرق کہا جا سکتا ہے کہ کبھی یائے معروف سے "ستی" اور کبھی یائے مجہول سے "ستے" لکھا گیا۔ چنانچہ "سب رس" میں ہر جگہ "تے" کے بجائے "تی" استعمال ہوا ہے۔

علامتِ مفعول "کو" کا مطالعہ

علامتِ فاعل "نے" کی بحث کے ذیل میں اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ بعض لسانیین کا یہ نظریہ صحیح نہیں کہ اردو ادب کے قدیم دور میں "نے" فاعل کے علاوہ مفعول کی علامت کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ اردو ادب میں علامتِ مفعول کے طور پر "کو" کا استعمال بھی تقریباً اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود "نے" کا استعمال۔ گویا فاعل و مفعول کی علامتوں میں تفریق کا احساس موجود تھا۔ یہاں یہی مطالعہ مقصود ہے کہ علامتِ مفعول کے طور پر "کو" کا استعمال اردو ادب میں کس وقت سے نظر آتا ہے تاکہ اس کے وجود کی قدامت کا صحیح تعین ہو سکے۔ اول اردو کے دکنی و گجراتی نمونے دیکھیے۔

دکنی اردو میں قدیم ترین دستیاب تصنیف فخر دین نظامی دکنی کی تصنیف مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ یہ مثنوی ۸۲۵ و ۸۳۹ ہجری کے درمیانی زمانے میں تصنیف ہوئی۔ اس میں علامتِ مفعول کا استعمال بالکل آج ہی کی طرح کیا گیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:—

دھرم کوں دھرم باپ کوں (باپ) سانٹھ
سنبولا نہ کنبلی ہرن دیہہ گا نٹھ [1]

"معراج العاشقین" کو منسوب تسلیم کر کے اس سے قطع نظر کر لی جائے تو شیخ میراں جی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) وہ پہلے صوفی بزرگ ہیں جن کا کلام مستقل طور پر ملتا ہے۔ شاہ میراں جی، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہی کے سلسلۂ صوفیا میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی طرح اردو ہی میں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ اپنی ایک تصنیف "خوش نامہ" میں لکھتے ہیں:

تیں ہی میرا اللہ چلایا کیوں نہ ہوا اداس
آپ سند لیا تو ڈ گسائیں تیری مجھ کوں آس [2]

۱۔ فخر دین نظامی۔ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ص ۱۰۱ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول ۱۹۷۳ء

۲۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ دکنی ادب کی تاریخ ص ۲۱ بحوالہ شاہ میراں جی شمس العشاق۔ خوش نامہ۔ مطبوعہ نشاط پریس کراچی۔ جون ۱۹۶۰ء

مولوی عبدالحق نے ان کی ایک منظوم تصنیف "شہادت الحقیقت" یا "شہادت الحقیق" سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے اس میں بھی علامتِ مفعول کا استعمال موجودہ قاعدے کے مطابق ہوا ہے۔ دو ایک مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ اس کارن تجھ کو دکھاؤں

۲۔ اس نبی کو نہ مانے۔

۳۔ یہ ان کو بچن ہیت ۳؎

اس اقتباس میں ہر جگہ 'کو' بغیر نونِ غنہ کے ملتا ہے جو غالباً سہوِ کتابت کا نتیجہ ہے۔ ان کی ایک نثری تصنیف "شرح مرغوب القلوب" میں بھی علامتِ مفعول کا استعمال ملاحظہ ہو :۔

"پیغمبر کہے جو کچھ کام کرے گا کوئی خدا کا ناؤں نا لیکر تو او کام پائمال ہوگا۔ بسم اللہ ارانا لو ازنا خدا کوں بہت کہ او پالنہار ہے عالم کا؟ ۴؎

سید شہباز حسینی، سید محمد حسینی بندہ نواز کی اولاد میں سے تھے اور شاہ ہدایت اللہ حسینی کے خلیفہ تھے۔ ان کا ایک شعر درجِ ذیل ہے :

؎ سوئے نہ دیوں خلق کوں شہباز لس دن روئے کر
سوتے سنے ہر کوں کرے مت کوئی دیکھے سوئے کر ۵؎

قلی قطب شاہ (دورِ حکومت ۹۷۳ھ تا ۱۰۲۰ھ) اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے ؎ خدا قطب شہ کوں شہنشاہ کر کر
سو سارے جگ میں دراہی پھرایا ۶؎

۳؎ مولوی عبدالحق - اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۷۹-۸۰۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت چہارم ۱۹۷۷ء

۴؎ ڈاکٹر محی الدین قادری زور - دکنی ادب کی تاریخ صفحہ ۲۵ - نشاط پریس کراچی۔ جون سنہ ۱۹۶۰ء

۵؎ ایضاً صفحہ ۲۶

۶؎ قلی قطب شاہ - کلیاتِ قلی قطب شاہ - صفحہ ۹۷ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور - اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۴۰ء

امینؔ، گجرات کا درباری شاعر تھا۔ سکندر منجھو نے اس کا نام محمد امین کمال لکھا ہے۔ سلطان بہادر (۹۳۲ھ۔۹۴۳ھ) اور محمود شاہ ثانی کے ندیمانِ خاص سے تھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

امینؔ حمدِ حق کر تو بے انتہا
بہ نعتِ محمدؐ قلم کو چلا ۷؎

شیخ خوب محمد چشتی، گجرات کے مشہور بزرگ ہیں (م ۱۰۲۳ھ)۔ ان کی تصنیفات سے تصوف میں تین کتابیں مشہور متداول ہیں۔ شرح جام جہاں نما (فارسی)، امواجِ خوبی (فارسی) اور خوب ترنگ (ہندی، گجراتی اردو)۔ "خوب ترنگ" انہوں نے ۹۸۶ ہجری میں نظم کی۔ اس میں اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ کمال محمد سیستانی کے اقوال جمع کیے ہیں۔ پھر اس منظوم تصنیف کی شرح فارسی میں "امواجِ خوبی" کے نام سے لکھی ۸؎ اس کا ایک شعر ہے:۔

وجیہو منج کوں آئی ترنگ
جمع کیے یہ لس پت ڈھنگ ۹؎

لیکن کہیں نون غنہ کے بغیر حرف 'کو' دیکھنے میں آتا ہے جیسے حسبِ ذیل شعر:۔

ناؤ محمدؐ لس کو دیت
اس تفصیل سو عالم کیت ۱۰؎

لیکن یہ غالباً سہو کتابت ہے۔

ابواللیث صدیقی نے ان کا ایک "جولانہ" (نظم کی ایک قسم) بھی نقل کیا ہے جس میں 'کو' بکثرت نون غنہ کے ساتھ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

۷؎ شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم ص۴۸ ۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۸؎ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ادب و لسانیات مضمون اردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطے ص۱۷ ، باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی اشاعت اول سن ۱۹۷۰ء

۹؎ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص۴۹ ۔ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء

۱۰؎ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص۷ ، انجمن پریس کراچی ۔ اشاعت چہارم سنہ ۱۹۷۶ء

ہے گونگٹے مکھ منہ چھپا جنہ جان پیہین کوں بھی لاگ نہیں

ہوں سمجھ کون کہیاپن سمجین نہیں ہے پیہین کوں بھی ماگ نہیں

جیوں دیکھیں ہیں سبیں دیکیں یقین سکی دیکھین کوں کھوں دیکھا رے

ایسا بھید کچھو کو چپ رہے کھولے گو نگٹا سو کیوں خوب بڑے ۱۱ ؎

شاہ برہان الدین جانم، حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ ولادت و وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ البتہ ان کی ایک نظم جو دستیاب ہوئی ہے اس کا سنِ تصنیف خود انہوں نے ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء بتایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا انتقال اس کے بعد ہوا ہوگا۔ ان کے درجِ ذیل شعر میں بھی "کو" علامتِ مفعول کے طور پر آیا ہے اور نون غنہ کے ساتھ ہے:۔

سکتا قادر قدرت سوں سمجے تجھ کوں کوئی کیا

جس کوں لوڑے دیوے راہ کھیا پہاڑی کوں تیشا ۱۲ ؎

اس کے ساتھ ہی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کہیں علامتِ مفعول محذوف ہے اور کہیں نون غنہ اڑا دیا گیا ہے۔ انہی کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

؎ اب سندیسہ مجھ پیہ کا + جب لگ لبھاگوں ان ملے

؎ جے آپ کی کھوجیں پیو کو پائیں + پیو کو کھوجیں آپ گنوائیں ۱۳ ؎

برہان الدین جانم کا ایک رسالہ "کلمۃ الحقایق" نام کا، نثر میں ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل، سوال و جواب کے طرز پر بیان کیے ہیں۔ نثر چونکہ بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہوتی ہے لہذا اس کے نمونے سے کسی لفظ کے استعمال کی نسبتاً زیادہ صحیح صورت سامنے آتی ہے۔ "کلمۃ الحقایق" میں علامتِ مفعول کا استعمال دیکھیے:۔

---

۱۱ ؎ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ادب و لسانیات ص ۲۹۔ باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی۔ اشاعتِ اول جنوری ۱۹۷۰ء

۱۲ ؎ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵۷۔ بحوالہ شاہ برہان الدین جانم، وصیۃ الہادی

۱۳ ؎ ایضاً ص ۶۰-۵۹۔

جدھاں کچھ نہیں بھی تھا تہیں ، دوجا شریک کوئی نہیں ایسا حال سمجنا خدا تھی

خدا کوں جس پر کرم خدا کا ہوئے ۔ ۱۴

شیخ وجیہہ الدین احمد علوی بہت بڑے عالم اور صاحب باطن ہوئے ہیں۔ سنہ ۹۱۰ھ میں محمد آباد (جانپانیر) میں پیدا ہوئے اور ۹۹۸ھ میں انتقال کیا۔ آخر عمر میں احمد آباد میں درس و تدریس اور تعلیم و تلقین میں مصروف رہے۔ ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے جس کا نام "بحر الحقائق" ہے۔ اس میں جگہ جگہ ان کے (وجیہہ الدین کے) ہندوی اقوال درج ہیں ۔ مریدوں کے سوال فارسی میں اور شیخ کے جواب ہندی میں ہیں۔ دو ایک اقوال دیکھیے :-

۱۔ اپنوں کوں کیا کشنے ہوئے یا نہوئے کام اس کا ہے ۔

۲۔ کیا ہوا جو بھوکوں موا ۔ بھوکوں موئے تیں کیا خدا کوں اپڑیا ۔ خدا کو اپڑنے کی استعداد ہور ۱۵

بہمنی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہان قطبیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اردو زبان و ادب نے ان کے دور (۱۵۰۸ء-۱۶۸۷ء) میں غیر معمولی ترقی کی۔ ابراہیم قطب شاہ کا فرزند محمد قلی قطب شاہ (۱۵۰۸ء تا ۱۶۱۱ء) خود، اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کا شعر ہے :-

پکڑ وا کے جھاڑاں کوں سیر اسلام + کمن آ رز ودل ہوا شیشہ کا جام ۱۶

حسن شوقی (۹۴۸ھ تا ۱۰۴۴ یا ۱۰۵۰ھ) عادل شاہی دور حکومت (۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۶ء) میں بیجاپور میں مقیم تھا یہیں سے بعد کو گولکنڈہ روانہ ہوا۔ احمد نگر میں رہا تو وہاں مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" لکھی۔ بیجاپور میں اس نے عادل شاہ کی شادی کا تفصیلی حال لکھا۔ مثنوی "میزبانی نامہ عادل شاہ" میں اس شادی کی دعوت کا حال ہے۔ حسن شوقی کا ایک شعر یہاں نقل ہے :-

---

۱۴ مولوی عبدالحق ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔ انجمن پریس کراچی ۔ اشاعت چہارم سنہ ۱۹۷۷ء

۱۵ ایضاً ۔ ص ۳۶-۳۷

۱۶ محی الدین قادری زور ۔ دکنی ادب کی تاریخ ۔ نشاط پریس کراچی ۔ جون سنہ ۱۹۶۰ء

شوقی ہماری ہرہ کے راسا کوں جیو جیو کا فلک

پاسنگ تیں میزان کا گما ویل منزنالا ہیرا ـــ ۱۷

دکن کی نثری تصانیف میں ملا وجہی کی "قطب مشتری" (تصنیف ۱۰۱۸ھ) اور سب رس (تصنیف ۱۰۴۵ھ) بہت مشہور ہیں۔

"قطب مشتری" کا ایک شعر ہے :-

کہ مت کوں سنبھالنہار اہے توں

دو جگ جیو کا پیو پیار اہے توں ـــ ۱۸

"سب رس" میں بھی علامتِ مفعول کا استعمال ملاحظہ ہو :-

جیتے خدا کے دوست خدا کوں پچھانتے ہیں سب ہی رابعہ کوں بڑا عیس کر مانتے ہیں ـــ ۱۹

شیرانی نے دکنی میں "کو" کے استعمال کے سلسلے میں ایک اور بات کا اضافہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں : فارسی ظروف کی رو سے حرف "را" مفعول کی علامت ہونے کے علاوہ اضافی بھی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً "آں راکہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک" اردو میں اس "را" کا ترجمہ، کا، کے، کی، کے ذریعے کیا جاتا ہے لیکن دکنی میں بہ تقلیدِ فارسی ایسے موقع پر "کو" اضافی آتا ہے[۲۰]

دو ایک مثالیں دیکھیے :-

۱۔ ان دلیاں ہور احمقاں کی باتاں کوں کیا اعتبار۔

۲۔ قامت کوں یک غلام تھا سیم ساق اس کا نام تھا ـــ ۲۱

لیکن یہ استعمال خصوصاً سب رس ہی میں ملتا ہے اور اضافی و مفعولی حالتوں کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔

---

۱۷ ـــ حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۱ء

۱۸ ـــ ملا وجہی۔ مثنوی قطب مشتری ص ۵، مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

۱۹ ـــ ملا وجہی۔ سب رس ص ۲۷۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ چہارم سنہ ۱۹۷۷ء

۲۰ ـــ حافظ محمود شیرانی۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی حصہ اول۔ شفیق پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۶ء

۲۱ ـــ ملا وجہی۔ سب رس ص ۸-۱۱۶، انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

کمال خان رستمی، بیجاپوری شاعر ہے اس نے ۱۰۵۹ ہجری میں "خاور نامہ" کے نام سے فارسی 'خاور نامہ' کا ترجمہ کیا۔ "خاور نامہ" کا ایک شعر یہ بھی ہے :-

اندیشے کوں بخشیا عقل تیز گام
کرنہار ہے ذہن کوں خوش خرام ۲۲

علی عادل شاہ ثانی، ایک فرماں روا ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔ تخلص شاہی تھا (دورِ حکومت ۱۶۵۶ تا ۱۶۷۳ء)۔ شاہی کی کلیات میں بھی علامتِ مفعول کا استعمال ملتا ہے اور نون غنہ کے ساتھ۔ ملاحظہ ہو :-

ع رس کوں کان اچھے طاقت نہیں حق کا سرایا ہے ۲۳

شاہ امین الدین اعلیٰ، شاہ برہان الدین جانم کے فرزند اور جانشین ہیں۔ ان کی وفات سنہ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں ہوئی۔ ان کا ایک شعر حسبِ ذیل ہے :-

تمہاری نین تیرے ساحر ہوئے ہمن کوں
گراہ کر بلاوے قوس و قزح بھواں کوں ۲۴

شاہ امین الدین اعلیٰ نے بعض رسالے نثر میں بھی لکھے ہیں۔ ان کے ایک رسالے سے اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے :

"اللہ تعالیٰ گنجِ مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سے امین دیکھ ہوا۔ امین شاہ کہتے ہیں یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔ ذات نے اس کو دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں" ۲۵

مخفی

اس میں "کو" بغیر نون غنہ کے استعمال ہوا ہے جو غالباً سہو کتابت ہے کیونکہ اس دور میں ہر ایک کے یہاں نون غنہ

---

۲۲ کمال خان رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ ص ۱۔ مرتبہ شیخ چاند ابن حسین۔ ایجوکیشنل پریس۔ کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

۲۳ علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی ص ۱۰۸۔ مرتبہ سید مبارز الدین رفعت۔ جسودر پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۲ء

۲۴، ۲۵ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۰ء لیکن زور نے امین الدین علی کی نثر کا جو نمونہ دیا ہے اس میں "کوں" ہی استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

استعمال ہوا ہے۔

سید میراں حسینی شاہ، شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔ یہ حیدرآباد دکن کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ کسی ضرورت سے بیجاپور گئے تو شاہ امین الدین اعلیٰ سے بیعت کی اور باقی عمر راہِ حق میں گزار دی۔ ۱۰۷۶ ہجری میں وفات پائی۔ یہ کئی رسالوں کے مصنف ہیں۔ ان کی سب سے مشہور اور ضخیم کتاب "شرح تمہیدات" ہے جو تمہید عین القضاۃ کا ترجمہ ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: "میرے ایک نسخے میں سنِ کتابت ۱۰۶۷ ہجری لکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اردو کی قدیم نثر کی کتابوں میں خاص درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ علاوہ چند مختصر رسالوں کے، اس سے قبل نثر میں صرف وجہی کی "سب رس" پائی جاتی ہے۔" ۲۶

سید میراں حسینی کے یہاں بھی علامتِ مفعول 'کا' استعمال صحیح طور پر کیا گیا ہے، البتہ 'کو' بغیر نون غنہ کے لکھا گیا ہے:-

"سو اے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذرت نوازنہارا ہے اور اس کا اجالا جالنہارا ہے۔ یعنی دوست سو نوازنہارا ہور خوبیاں دینہارا۔ ولے اس کا محبت اسے گداتا ہے یعنی معشوق کا محبت عاشق کو گلاتا ہے اس کے فراق میں۔" ۲۷

ابنِ نشاطی کی مثنوی "پھول بن" دکنی منظومات میں خاص اہمیت کی حامل ہے اس کا سالِ تصنیف ۱۰۷۶ ہجری ہے۔ اس میں 'کو' کا استعمال ملاحظہ ہو:-

تبا کوں پھول کی توں چاک دیتا
کلی کے پیرہن کوں تنگ کیتا ۲۸

بقیہ حاشیہ ۲۴-۲۵ "بوج اے طالبِ تحقیق اس لاہوت کے مقام میں اگر واصل ہوا سو اس تک حاصل آئے گی۔" محی الدین قادری زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ نشاط پریس کراچی جون ۱۹۶۰ء۔ یا مثلاً درج ذیل شعر دیکھیے:-
کروں ناز اسی قدر شیداک پر جو شرف دی ہے خاک کوں کر بھر (شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم صـ ۶۶)

۲۶-۲۷ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ چہارم ۱۹۷۷ء

۲۸ ابنِ نشاطی۔ مثنوی "پھول بن" ۱۰۷۶ھ۔ صـ ۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۵۵ء

ملک الشعرا ملا نصرتی، علی عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے ۶۸-۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء میں اپنی مشہور مثنوی "گلشنِ عشق" لکھی۔ ۱۶۶۵ء میں ایک رزمیہ مثنوی "علی نامہ" لکھی۔ اس کی غزلوں کا ایک مجموعہ "گلدستۂ عشق" کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کی چوتھی کتاب "تاریخِ اسکندری" ہے۔ یہاں "گلشنِ عشق" سے ایک شعر نقل ہے :-

؎ دلاں کا لیا ملک خوش خلق سوں + کیا بند اخلاص سوں خلق کوں ۲۹

انہی کا ایک اور شعر دیکھیے :-

؎ ولے خان غازی نوی شان سوں + خوش بکیل ہو بلنے کر ان مان کوں ۳۰

وؔلی کا ایک شعر ملاحظہ ہو :-

کیتا ہوں ترے نانو کوں میں ورد زباں کا

کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا ۳۱

قاضی محمود بحریؔ، عہد اورنگ زیب کے شاعر ہیں اور ولؔی کے معاصر۔ ان کے زمانے تک بھی یہ استعمال اسی طور پر ملتا ہے۔ نونِ غنہ زائد ہو گیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو :-

تن کوں کھو اس من میں، من ہو نا ایک منت میں

جیو اپنے جیو کوں مائے ملا یا، من ہوا ۳۲

اس مطالعے سے واضح ہے کہ دکنی وگجری اردو، علامتِ مفعول کے استعمال میں کسی بے قاعدگی کا اظہار نہیں کرتی۔ وہاں علامتِ مفعول کا استعمال صحیح طور پر اور تسلسل کے ساتھ ملتا ہے سوائے اس کے کہ "کو" پر نونِ غنہ زائد ملتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ شمالی ہند کی اردو میں اس کی کیا کیفیت ہے۔

۲۹؎ ملا نصرتی۔ مثنوی "گلشنِ عشق" سنہ ۱۰۶۷ھ ص ۲۵۔ انجمن ترقیٔ اردو پاکستان۔ کراچی سنہ ۱۹۵۲ء

۳۰؎ ملا نصرتی۔ دیوانِ نصرتی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبع قوسین لاہور۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۲ء

۳۱؎ وؔلی۔ کلیاتِ ولی۔ ص ۱ (ولی۔ المتوفی ۱۱۲۹ھ مطابق سنہ ۱۸-۱۷۱۷ء) نے ۱۱۳۲ھ میں ولی کا دیوان دہلی آیا" نورالحسن ہاشمی۔ دلی کا دبستانِ شاعری۔ انجمن ترقیٔ اردو کراچی طبع سوم سنہ ۱۹۶۴ء ص ۱۲۳

۳۲؎ قاضی محمود دکنی۔ کلیاتِ بحری۔ ص (مع مقدمہ و تشریح) مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حنیظ۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

شمالی ہند کے شعرا میں، قدیم ترین (اردو) شاعر امیر خسرو ہیں۔ ۶۵۳ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۷۲۵ھ ہجری میں وفات پائی۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ تا ۶۰۸ھ) کے عہد سے، سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ) تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ امیر کا ہندی (اردو) کلام عام طور سے دستیاب نہیں۔ فارسی آمیز کلام نہایت کم یاب ہے۔ اب تک صرف دو غزلیں اور چند متفرق شعر دستیاب ہیں۔ ان کی مشہور غزل سے ایک شعر یہاں نقل ہے، علامت مفعول کا استعمال ملاحظہ ہو:۔

شبان ہجران دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اسی غزل کے ایک دوسرے شعر میں بھی 'کو' بغیر نون زائد ہی استعمال ہوا ہے۔ شعر حسب ذیل ہے:۔

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں ۳۳

پروفیسر شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں ایک صاحب پروفیسر سراج الدین آذر کی مملوکہ بیاض سے ایک غزل نقل کی ہے جس کے ایک شعر میں 'کوں' (نون زائد کے ساتھ) کا استعمال ملتا ہے۔ شعر یہ ہے:۔

سیرا جو من تم نے لیا تم نے انعام تم کوں دیا
تم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر ۳۴

لیکن شیرانی اسے امیر خسرو کی غزل ماننے پر تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں، "میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔" ۳۵

کبیر داس، راما نند کے چیلے اور ہندوؤں کے مشہور موحد گزرے ہیں۔ بنارس کے رہنے والے تھے۔ سکندر لودھی

---

۳۳ حکیم شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۲۵ - مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۳۴ پروفیسر حافظ محمود شیرانی - پنجاب میں اردو ص ۱۴۷ - اشرف پریس لاہور۔ طبع چہارم سنہ ۱۹۷۲ء

۳۵ ایضاً ص ۱۴۷ -

(سنہ ۸۹۶ھ - سنہ ۹۲۳ھ) کے معاصر تھے۔ سنہ ۸۹۰ھ کے قریب پیدا ہوئے اور ۹۲۷ھ میں فوت ہوئے۔ شمس اللہ قادری نے ان کے چند اشعار اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ ان میں ایک شعر یہ بھی ہے:-

سینوں کی کر کو لڑی پتلی پلنگ بچھائے
پلکوں کی چق ڈال کے پیا کو لیا رجھائے [۳۶]

محمد افضل جھنجھانوی، سولہویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں۔ ان کا زمانہ اور دکن کے قدیم شاعر ملا وجہی کا زمانہ ایک ہے۔ بقول مولانا شیرانی، افضل نے ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا۔ "بارہ ماسہ" یا "بکٹ کہانی" افضل کی مشہور طویل نظم ہے۔ 'پنجاب میں اردو' میں اس کا طویل اقتباس نقل کیا گیا ہے جس میں یہ شعر بھی ہے:-

اری جس شخص کوں کہ یہ دیو لاگا
سیانا دیکھ اوس کوں دور بھاگا [۳۷]

چندر بھان برہمن، عہد شاہجہانی کا ایک مشہور فارسی شاعر ہے۔ پنڈت کیفی کے خیال میں، شمالی ہند میں سب سے پہلے اردو میں غزل اسی نے کہی۔ اس غزل کا مطلع ہے:-

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے [۳۸]

سعدی کاکوروی، ایک اور قدیم شاعر ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے بلا تحقیق ایک دوسرے کی تقلید و تتبع میں انہیں "باشندہ دکن کا تھا" لکھا ہے لیکن یہ شمالی ہند کے ہیں۔ زور نے لکھا ہے کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے میں تھے[۳۹] اور محمد قلی قطب شاہ کے معاصر۔ ان کا ایک شعر تذکروں میں اس طرح منقول ہے:-

---

۳۶ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۳۶ - نولکشور پریس - لکھنؤ - سنہ ۱۹۳۰ء

۳۷ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو - ص ۲۰۸ - اشرف پریس لاہور - سنہ ۱۹۷۲ء

۳۸ شوکت سبزواری - لسانی مسائل - ص ۶۸ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۶۲ء

۳۹ اکبر اعظم کا زمانہ - سنہ ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء - ڈاکٹر محمد باقر - اردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں) ص -

سجنا تمن کوں دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ بیت ہے ۴۰؎

اسمٰعیل امروہوی بھی شمالی ہند کے شاعر ہیں۔ ان کی دو مثنویاں دریافت ہوئی ہیں (۱) وفات نامہ بی بی فاطمہؓ تصنیف ۱۱۰۵ھ اور (۲) معجزۂ انار تصنیف ۱۱۲۰ھ۔ دونوں مثنویوں میں کو، کوں زیادہ کثرت سے ملتا ہے۔ مثال کے طور پر دونوں مثنویوں کا ایک ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

کہ مادر تمن کوں شفاعت بھیتر

چھوڑے نہیں عذاب ہور نار سقر ۴۱؎

دوسری مثنوی اگرچہ اس سے پندرہ برس بعد کی تصنیف ہے لیکن اس میں بھی یہی صورت ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

تماری کنیز ان میں داخل ہوئی

ثواباں حشر کوں تمو سیں جوئی ۴۲؎

سراج الدین علی خاں آرزو (۱۱۰۰ھ ۱۱۶۹ھ) اکبر آباد (آگرہ) کے رہنے والے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں محض تفنن کے طور پر کبھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ نورالحسن ہاشمی نے ان کے کچھ اشعار بطور نمونہ نقل کیے ہیں ان میں ایک شعر یہ بھی ہے:۔

آتا ہے صبح اٹھ کر تیری برابری کو

کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو ۴۳؎

شاہ ظہورالدین حاتم (ولادت ۱۱۱۱ھ وفات ۱۱۹۷ھ) دہلی کے مشہور شاعر ہیں ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

۴۰؎ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل ص ۶۹ محمد یحییٰ تنہا نے اکے علاوہ یہ شعر بھی نقل کیا ہے (چند دوسرے اشعار کے ساتھ) دو فن کے گھر میں بجوں روز دعجوں دل کو بجوں پیش سگ کوئیت دروں پیا نجات وسیت ہے۔

۴۱؎ اسمٰعیل امروہوی۔ مثنوی وفات نامہ بی بی فاطمہؓ۔ مشمولہ اردو کی دو قدیم مثنویاں مرتبہ نقش نقوی۔ (سیر المصنفین ص ۱۹)

۴۲؎ اسمٰعیل امروہوی۔ مثنوی معجزۂ انار۔ "اردو کی دو قدیم مثنویاں" ص ۱۶۳۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور طبع اول ۱۹۶۹ء

۴۳؎ نورالحسن ہاشمی۔ دلی کا دبستانِ شاعری ص ۱۰۳ سرفراز پریس لکھنؤ۔ طبع دوم ۱۹۶۵ء۔

ڈھونڈا بہت ہم نے نہ پایا انہوں کا کھوج

دل کو چرا کے ہم سے چھپانے کدھر گئے ؎۴۴

محمد شاکر ناجی، آبرو کے معاصر تھے۔ ان کا ایک شعر ہے:-

تجھ کو کیوں کر کروں جدا اے جان

زندگانی بہت پیاری ہے ؎۴۵

درد کے یہاں بھی علامتِ فاعل بغیر نون زائد کے استعمال ہوئی ہے۔ ایک شعر دیکھیے:-

را غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ

کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا ؎۴۶

مرزا رفیع سودا (م ۱۱۹۵ھ) حاتم کے شاگرد اور میر کے معاصر تھے۔ ان کا ایک شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

کیا ہے قتل جہاں کو جنہوں نے باتوں میں

پڑا ہے دل کو سروکار ان شریروں ساتھ ؎۴۷

میر تقی میر کا شعر دیکھیے:-

دی آگ رنگِ گل نے واں اے صبا چمن کو

یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشیاں کا ؎۴۸

؎۴۴ شاہ ظہور الدین حاتم۔ دیوانِ حاتم ص ۲۷ (شاہ حاتم حالات و کلام)۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۷ء

؎۴۵ محمد شاکر ناجی۔ دلی کا دبستانِ شاعری ص ۱۱۴ مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔

؎۴۶ خواجہ میر درد۔ دیوانِ درد ص ۶۰ ۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۲ء

؎۴۷ مرزا رفیع سودا۔ کلیاتِ سودا ص ۶۵۵ ۔ زرین آرٹ پریس۔ لاہور۔

؎۴۸ میر تقی میر۔ کلیاتِ میر ص ۱۱ ۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۴۱ء

اس مطالعے سے دو باتیں بہت واضح ہیں۔ اول یہ کہ دستیاب اردو ادب میں "کو" کا استعمال اسی قدر قدیم ہے جتنا علامتِ فاعل "نے" کا استعمال۔ زمانۂ قدیم ہی سے "نے" فاعل کی علامت کے طور پر ٹھیک قاعدے کے مطابق استعمال ہوتا رہا، اسی طرح جہاں مفعول کی وضاحت ضروری ہوئی وہاں علامتِ مفعول کا استعمال کیا گیا اور ٹھیک آج کے قاعدے کے مطابق۔ ایک کو دوسرے کی جگہ نہ تو استعمال کیا گیا اور نہ اس کی کچھ ضرورت تھی۔ لہٰذا حافظ محمود شیرانی کا یہ کہنا درست ثابت نہیں ہوتا کہ "دکنی "نے" کے استعمال میں بالکل بے قاعدہ ہے۔ اس زبان میں وہ فاعل اور مفعول دونوں کے لیے آتا ہے۔" مندرجہ بالا نمونوں سے واضح ہے کہ علامتِ مفعول "کو" کی قدیم زمانے سے موجودگی کے باعث اس بات کا کوئی جواز نہیں رہتا کہ "نے" کو مفعول کے لیے استعمال کیا جاتا۔ علامتِ مفعول "کو" کی بالکل ابتدا ہی سے موجودگی اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ دکنی اردو میں فاعل اور مفعول کے درمیان امتیاز کیا جاتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اول اول صرف "نے" کا استعمال ملنا چاہیے تھا جو فاعل و مفعول دونوں کے لیے مستعمل تھا (بقول شیرانی) اور "کو" کا داخلہ ایسی صورت میں، زبانِ اردو میں بعد میں ہوا ہوتا۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ادبِ اردو کا تاریخی مطالعہ اس دعوے کا ثبوت ہے کہ "نے" اور "کو" میں سے کسی ایک کو دوسرے پر تقدم زمانی حاصل نہیں ہے۔ محمود شیرانی کی طرح یہاں مولوی عبدالحق کی بھی یہ رائے خود بخود باطل ہو جاتی ہے کہ پہلے علامتِ مفعول کے طور پر "نے" استعمال ہوتا تھا۔[۴۹]

دوسری بات جو اس مطالعے سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "کو" کا استعمال نون غنہ کے ساتھ ملتا ہے نہ صرف دکن و گجرات کی اردو میں، بلکہ شمالی ہند میں بھی شروع شروع میں "کو" کا استعمال نون غنہ کے ساتھ ہی دیکھنے میں آتا ہے گویا یہ استعمال دانستہ کیا جاتا تھا تبھی دونوں جگہ کے نمونوں میں اکثر و بیشتر نون غنہ ملتا ہے۔ بعد میں یہ زائد نون غنہ گرا دیا گیا اور صرف "کو" استعمال ہونے لگا جو آج تک برقرار ہے۔ نون غنہ کے استعمال کے سلسلے میں انشا کا کہنا ہے کہ:۔

"یہ شاہجہاں آباد (دہلی) کی زمین کا فیض ہے کہ کلمے کے آخر سے "ں" غنہ کا دُم چھلّا اُڑ گیا ورنہ ساداتِ بارہہ کے بہرائم بزرگ جو اپنے وطن میں رہے "کو" کو "کوں" بولتے ہیں۔"[۵۰]

۴۹۔ مولوی عبدالحق۔ قواعدِ اردو۔ جی ایف پریس لاہور۔

۵۰۔ انشاء اللہ خاں انشا۔ دریائے لطافت (ترجمہ)، داستانِ زبانِ اردو ص ۱۲۸، شوکت سبزواری۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامتِ مفعول 'کو'، اردو کی اپنی چیز ہے یا کہیں اور سے درآمد کیا گیا ہے؟

ماخذ کی بحث

اردو میں علامتِ مفعول 'کو' کے ماخذ کے سلسلے میں علمائے لسانیات نے جن آرا کا اظہار کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں :-

۱- بیمز اور ہورنلے، اسے سنسکرت "ککشم" (کوکھ) سے ماخوذ مانتے ہیں۔ اس کی درمیانی تبدیلیاں یہ ہیں :-

ککھم - کاکھم - کاھُم - کہم - کوں - کو [۵۱]

۲- بھنڈارکر نے 'کو' کا ماخذ پراکرت "کم" کو ٹھہرایا ہے۔ لیکن یہ ان کے نزدیک سنسکرت "ککش" کا بگاڑ نہیں بلکہ سنسکرت किय کی اضافی یا مجبوری حالت ہے۔ [۵۲]

۳- ڈاکٹر ٹرمپ کا خیال ہے کہ "کو" سنسکرت اسم مفعول कृत سے نکلا ہے جو پراکرت میں कितो یا किओ ہوا۔ [۵۳]

۴- ایک قیاس یہ ہے کہ "کو" پراکرت میں "امھاکم" تھا (امھاکم - ہمارا)۔ جو "اسماکم" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ "آکم" یا "کم" صورت بدل کر "کو" ہو گیا۔ [۵۴]

۵- کیلاگ نے اپنی گرامر کے پہلے ایڈیشن میں "کو" کو "کیرک" سے موضوع مانا تھا اور لکھا تھا کہ "کیرکم" اور "کیرکے" پراکرت میں بطور لاحقۂ اضافت استعمال ہوتے تھے۔ یہاں مفعول کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ [۵۵]

---

۵۱ ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۱۳ دی ٹی پریس ڈھاکہ ۱۹۵۶ء بحوالہ بیمز و ہورنلے۔

۵۲ ایضاً ص ۲۱۴ - بحوالہ بھنڈارکر۔

۵۳ ایضاً ص ۲۱۴ - بحوالہ ٹرمپ

۵۴ ایضاً ص ۲۱۵ - بحوالہ شیام سندر داس۔

۵۵ ایضاً ص ۲۱۵ - بحوالہ کیلاگ

۶۔ مولوی عبدالحق کے خیال میں "کو" سنسکرت کے ظرف "کاکشے" سے بنا ہے۔ "کاکشے" "کاکشا" سے نکلا ہے جس کے معنے بغل کے ہیں۔ اسی سے پنجابی "کچھ" بمعنی "بغل" ہے اور بنگالی "کاچھے" بھی اسی سے بنا ہے۔ جس کے معنے اس زبان میں نزدیک کے ہیں۔ کیونکہ "بغل" سب سے قریب ہے اس لیے اس کے یہ معنے ہو گئے۔ قدیم ہندی میں "کاکھ" اور "کاکھم" ہوا۔ "کاکم" سے معمولی تغیر و تبدل کے بعد کاہان، کہاں، کناؤں، کاون اور "کو" بنا۔ [۵۶]

---

[۵۶] مولوی عبدالحق۔ قواعد اردو ص ۱۳۶۔ جی ایف پریس لاہور۔

ظرفی "میں" کا مطالعہ

"میں" حروفِ ربط میں سے ایک حرف ہے اور ظرفی حالت پر دلالت کرتا ہے۔ ابوالیث صدیقی کا کہنا ہے کہ قدیم اردو میں، "میں، ماں، بھتر، مینں، اور مینے، استعمال ہوئے ہیں[1]

ڈاکٹر محی الدین زور نے اس سلسلے میں علاقائی تفصیل بھی کی ہے۔ "میں" اور اس کی مختلف لغات کے استعمال کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"جو حروفِ جر گجراتی ہندوستانی میں مستعمل تھے ان میں سے بعض ایسے ہیں جو دکنی میں نظر نہیں آتے یعنی مانہ، منھ، مانہی، مہیں وغیرہ"[2]

اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"دکنی میں ایسے موقعوں پر "مینے" یا "میں"، استعمال ہوتا تھا۔ واضح ہو کہ یہ مؤخر الذکر حروفِ جر (یعنی مینے اور میں) گجراتی میں بھی متذکرہ بالا کے علاوہ موجود تھے"[3]

زور کی تحقیق سے جو مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مانہ، منھو، مانہی اور مہیں، وہ لغات ہیں جو صرف گجراتی اردو سے مخصوص ہیں اور دکنی اردو میں مستعمل نہیں رہیں۔ حالانکہ اردو کی قدیم ترین دستیاب مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" جو دکن میں تصنیف ہوئی، ان استعمالات سے خالی نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

نمبر ۱:۔ وہی بدہ من مانہ دھریں سوبار

۲:۔ تمہیں دیکھ مکھ گھال کر بیان منہ

۳:۔ نہ تھا تیرا کوئی ہم میل مانہہ[4]

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ جامع القواعد (حصہ صرف) ص ۲۷۵ مکتبہ جدید پریس لاہور۔ طبع اول سنہ ۱۹۷۱ء

[2] ڈاکٹر محی الدین زور۔ ہندوستانی لسانیات ص ۱۳۰ منصور پریس لاہور۔ طبع سوم جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

[3] ایضاً ص ۱۳۰-۱۳۱

[4] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" ص ۲۲۱-۲۱۱ ص ۲۰۱ مرتبہ جمیل جالبی، انجمن پریس کراچی طبع اول سنہ ۱۹۷۳ء

مئی ۱۲ صفحات

جارج گریرسن نے دکنی گرامر کی ذیل میں بتایا ہے کہ اس میں ظرفی حالت کے لیے "میں" کے علاوہ ایک اور لغت "موں" بھی مستعمل تھی۔[۵] گویا "موں" ان کے نزدیک دکنی سے مخصوص ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کا استعمال گجراتی کے علاوہ شمالی ہند میں بھی کہیں کہیں دیکھا گیا ہے۔ گریرسن نے لکھا ہے کہ ظرفی "میں" کے لغات مختلف زبانوں میں یہ تھے:-

Braj Bhaka :- mẽ (میں) - maĩ (مئیں)

Kanauji :- mẽ (میں) - maĩ (مئیں) mã (مائیں) mõ (موں)

Hindi :- mẽ (میں) - [۶]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ہریانی زبان میں ظرفی میں کی جو مختلف لغات مستعمل تھیں، وہ یہ ہیں:-

مانہہ - میں - ماں - ماہیں - موں - مانجھ - [۷]

مذکورہ بالا ماہرینِ لسانیات کی تحقیق کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ظرفی "میں" کی مختلف لغات اردو میں مستعمل رہی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:-

میں، مانہ، مانہہ، ہنڈ، ہنے، مینی، مانہی، مہیں، مئیں، مائیں، مانجھ اور موں وغیرہ۔

ان تمام لغات کا استعمال اپنی جگہ، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان لغات کے پہلو بہ پہلو "میں" ہر جگہ موجود و مستعمل رہا۔ اس کا استعمال کسی ایک علاقے سے مخصوص نہیں۔ گجراتی میں بھی ملتا ہے، دکنی میں بھی، شمالی ہند کی کھڑی (اردو) میں بھی اور "ہریانی" میں بھی، جسے اردو ہی کی ایک شاخ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ظرفی "میں"، اور اس کے مختلف

---

[۵] George Grierson. Linguistic Survey of India - Vol IX. P: 60

[۶] ایضاً ص۶۰۔

[۷] ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو ص ۱۹۸-۱۹۷، مطبعِ عالیہ لاہور ۱۹۶۶ء

لغات کی اصل اور ان کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لینے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبِ اردو کا ایک تاریخی مطالعہ کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں اول دکنی و گجراتی اردو کو لیں۔ دکنی اردو میں فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ اس سے چند استعمالات کی مثالیں پہلے نقل کی جا چکی ہیں، یہاں چند دوسری لغات کا استعمال دیکھیے :-

؎ نہ رووے سکد میں چوری ماں پکار + رووے گھال کر مکھ کو کٹی منجار

؎ بھرے سندیں جیو بھریا ایک بات + نہ گھالیں اَدِیعگ ہورے گھریں نہ گھاٹ ؎[8]

شیخ بہاء الدین باجن گجراتی (م ۹۱۲ھ) کا ایک مصرع ہے :-

جیسا کوئی من منہ چنتِ وے ویسا ہی ہوئے ؎[9]

شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجراتی (م ۹۷۳ھ) کے چند مصرعے دیکھیے :-

۱۔ ہور جے اس منہ ندیاں بارے۔

۲۔ اچیل عورت کے تین تکرے جیری کہیں عورت ماہاں

۳۔ جو تھا بھاگ کیلے جو اس منہ پھلیں ڈھانپے جب اس تھانہاں ؎[10]

۴۔ سکھ منہ دکھ کی بات نہ کیجے۔ ؎[11]

شیخ وجیہ الدین گجراتی (م ۹۹۸ھ) کا ایک جملہ ہے :-

اس سیں ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے ؎[12]

؎ ۸ فخر دین نظامی۔ کدم راؤ پدم راؤ ص ۱۸۷۔۷۷۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۳ء

؎ ۹ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۲۰۸ (بحوالہ شیخ بہاء الدین باجن) اشرف پریس لاہور۔ طبع چہارم سنہ ۱۹۷۲ء
شمس اللہ قادری نے ان کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے ؎ سندل من میں تا دیکھے + رباب رنگ میں جھکیے۔ اردوئے قدیم ص ۷۲

؎ ۱۰ ایضاً ص ۲۲۲۔۲۱۹۔

؎ ۱۱ مولوی عبد الحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۷۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء طبع چہارم

؎ ۱۲ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۲۷۔ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء۔

شیخ خوب محمد چشتی گجرات کے مشہور بزرگ گزرے ہیں ان کا انتقال سنہ ۱۰۲۳ ہجری میں ہوا۔ ان کے چند مصرعے دیکھیے:-

۱۔ میں اس مانند کہیا ہے سوے

۲۔ ارض سما منہ جے نہ سمائے

۳۔ نعت میں کرتا ہوں سیر ۱۳؎

۴۔ اس موں یاد رہے کچھ بات ۱۴؎

۵۔ جدائی دو ہوں مانند اس بجانت آن ۱۵؎

خوب محمد چشتی نے "خوب ترنگ" میں "میں" بھی استعمال کیا ہے۔ دو مصرعے ملاحظہ کیجیے:-

۱۔ چین میں چتاری جان

۲۔ چین میں یوں رنگ ملائے ۱۶؎

وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" (تصنیف سنہ ۱۰۱۸ھ) کے دو مصرعے یہاں نقل ہیں:-

۱۔ بنایا گھر اس میں بے دھات کے

۲۔ جنے بے نیازی دے دو جگ منیں ۱۷؎

"سب رس" (تصنیف سنہ ۱۰۴۵ھ) کا ایک جملہ ہے:-

نظر جس وقت عقل کے بدمیں تے بھار آیا تھا۔ ۱۸؎

۱۳؎ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۲۲۶-۲۲۵۔ اشرف پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۷۲ء

۱۴؎ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۷۸۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۱۵؎ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۷۵۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

۱۶؎ عبدالقادر سروری۔ اردو مثنوی کا ارتقا ص ۲۹-۲۸۔ مطبع عہد آفرین۔ حیدرآباد دکن سنہ ۱۳۵۸ھ ۱۹۴۰ء

۱۷؎ ملا وجہی۔ مثنوی قطب مشتری ص ۱-۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

۱۸؎ ملا وجہی۔ سب رس ص ۱۶۹۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء (مرتبہ مولوی عبدالحق)

قلی قطب شاہ کے یہاں "میں اور "منے" پہلو بہ پہلو ملتے ہیں ۔ دو مصرعے یہاں نقل ہیں :-

۱ ۔ کیوں چھپا پیو ہیں ہیں سے پھلاں گلزار منے

۲ ۔ گماہے منجے گلزار میں لے جاوتی توں کھینچ کر ۱۹

حسن شوقی کے یہاں بھی یہی صورت ہے ۔ دو مصرعے دیکھیے :-

۱ ۔ ہر یک شے منے مظہر حق اہے

۲ ۔ دھواں جاگگی میں ہوا کہکشاں ۲۰

کمال خان رستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" (تصنیف ۱۰۵۹ھ) میں بھی یہ استعمال برابر ہے جیسے یہ مصرعے :-

۱ ۔ سبز یا بات میں نقش نام خدا

۲ ۔ دھرے چاند روشن کوں تاریاں مینں ۲۱

علی عادل شاہ ثانی شاہی کے بھی چند مصرعے یہاں نمونتہً درج ہیں :-

۱ ۔ عقل کی خلوت منے فکر اچھے رائے زن

۲ ۔ دیکھو اس پھول تے ہے باغ مینں سب ہر مل ۔

۳ ۔ گر کوئی نظر کر عشق کی درپن میں دیکھے گا نین ۲۲

ابن نشاطی کی مثنوی "پھولبن" (تصنیف ۱۰۶۶ھ) میں بھی عام طور پر "میں" اور "منے" استعمال ہوا ہے

البتہ "موں" کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں ۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں :-

۱ ۔ پشانی میں رکھیا آ دیے چندر کوں

---

۱۹ ۔ قلی قطب شاہ ۔ کلیات قلی قطب شاہ ص ۲۲۲ ۔ ۲۳۹ ۔ مرتبہ سید محی الدین قادری زور ۔ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۰

۲۰ ۔ حسن شوقی ۔ دیوان حسن شوقی ۔ مرتبہ جمیل جالبی ۔ انجمن پریس کراچی ۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۷۱ء

۲۱ ۔ کمال خان رستمی بیجاپوری ۔ خاور نامہ (شروع ۱۰۵۹ھ) ص ۔ ایجوکیشنل پریس کراچی ۔ سنہ ۱۹۶۸ء

۲۲ ۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی ۔ کلیات شاہی ۔ ص ۱۱۶ ۔ ۱۲۶ ۔ ص ۱۰۱ ۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی ۔ سنہ ۱۹۶۲ء

۲۔ لکھیا تو حبیب کے طالع منے بات ۲۳؎

۳۔ کروں ہر شب نین موں آب پاشی ۲۴؎

ملک الشعرا ملا نصرتی کے یہاں بھی یہی صورت ہے البتہ "میں" کی ایک اور لغت "منجار" بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ جیسے درج ذیل شعر میں :۔

اپس آپ دیکھا سنجل منجار

ترنج معنبر سیتا جل منجار ۲۵؎

اس کی مثال ہاشمی دکنی کے یہاں بھی ملتی ہے مثلاً یہ شعر:۔

اگر عشق نئیں ہے تو کے ٹھار ٹھار

پریشاں ہو بارا پھرے جگ مجھار ۲۶؎

قاضی محمود بحری کے یہاں حرف "میں" اور "منے" کا استعمال ملتا ہے۔ دو مصرعے یہاں نقل ہیں :۔

۱۔ سد پیوں دلآرام سوں مل بیٹھ چمن میں

۲۔ جو رکھے ہیں نظر منے کو نین ۲۷؎

ولی کے یہاں بھی یہی صورت ہے۔ ان کے چند مصرعے درج ذیل ہیں :۔

۱۔ کب لگ رکھوگے طرز تغافل کو دل مینں

۲۔ جگ منے دو جا نہیں ہے خوب رو تجھ سار کا

۳۔ اسے دشوار ہے جگ میں نکلنا غم کے پھاندے سوں ۲۸؎

۲۳؎ ابن نشاطی۔ مثنوی پھولبن ص ۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ سنہ ۱۹۵۵ء

۲۴؎ محمد باقر۔ اردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں) ص ۳۷۔ پنجابی ادبی اکیڈمی پریس۔ لاہور سنہ ۱۹۷۲ء

۲۵؎ ملا نصرتی۔ دیوان نصرتی۔ مطبع قوسین لاہور سنہ ۱۹۷۲ء

۲۶؎ محمد باقر۔ اردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں) ص ۵۳۔ پنجابی ادبی اکیڈمی پریس۔ لاہور سنہ ۱۹۷۲ء

۲۷؎ قاضی محمود بحری۔ کلیات بحری ص ۱۷۲-۱۷۱ مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حنیف۔ مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۱۱۲ھ

۲۸؎ ولی۔ کلیات ولی۔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۴ء

اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں، سے اور میں عام طور پر استعمال ہوتے رہے۔ البتہ دوسرے لغات صرف چند لوگوں کے یہاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثلاً فخر دین نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" میں۔ ابن نشاطی کی "پھول بن" میں۔ شیخ خوب محمد چشتی، شیخ وجیہ الدین گجراتی، شیخ بہاء الدین باجن اور شاہ علی محمد جیو گام دھنی وغیرہ کے یہاں۔ موخر الذکر چاروں بزرگوں کا تعلق گجرات سے ہے۔ ان کے یہاں "میں" کی دوسری لغات کا استعمال عام ہے۔ غالباً اسی وجہ سے زور نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان لغات ما نہ، منہ اور مانہی و میہں کا تعلق گجراتی اردو سے خاص ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کدم راؤ پدم راؤ میں اس استعمال کو دیکھ کر یہ سوچا جائے کہ یہ گجراتی بزرگوں کے اثرات کا نتیجہ ہوگا لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ ان بزرگوں میں شیخ بہاء الدین باجن نے ۹۱۲ ہجری میں وفات پائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی نے ۹۷۳ ہجری میں، شیخ وجیہ الدین گجراتی نے ۹۹۸ ہجری میں اور شیخ خوب محمد چشتی نے ۱۰۲۳ ہجری میں۔ جب کہ فخر دین نظامی کی مثنوی ان سے بہت پہلے یعنی ۸۲۵ و ۸۳۹ ہجری کے درمیانی عرصے کی تصنیف ہے۔ تاہم اگر زور کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ سوچ بھی لیا جائے کہ یہ لغات گجرات کی بول چال سے دکنی نے اخذ کیے ہوں گے تو پھر اس حقیقت کی کیا توجیہ ہوگی کہ ہریانی میں بھی یہ لغات مستعمل رہے۔ چنانچہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ لغات دکنی، گجراتی، ہریانی وغیرہ نے کسی ایک یا چند ایسی بولیوں سے لیے ہوں جن میں یہ لغات عموماً استعمال ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی اردو کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

امیر خسرو (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) نے "میں" استعمال کیا ہے:۔

جل بھر بنے جل ہی میں رہے + آنکھوں دیکھا خسرو کہے ۲۹؎

کبیر کہتے ہیں:۔ سکھ میں سمرن نا کیا دکھ میں کیا یاد ۳۰؎

۲۹؎ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص۵۵۔ نول کشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۳۰؎ ایضاً ص۵۶۔

کبیر کی دو اور مثالیں: ① تجو بدلو یہ چترائی رہو نہنگ جگ مانہی (پنجاب میں اردو ص۲۰۲)
② جب لگ سندھ بن مانہی۔ (شوکت۔ داستانِ زبانِ اردو ص۲۰۶)

امیر خسرو کے یہاں دیگر لغات میں سے کوئی استعمال ہوئی یا نہیں اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نمونے کم دستیاب ہیں اور جو ہیں ان میں سے اکثر پر بے اعتباری کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔

اسمٰعیل امروہوی شمالی ہند کے ایک اور قدیم شاعر ہیں۔ ان کی مثنویوں میں، مینں، مینے اور ہیں، کا استعمال پہلو بہ پہلو ملتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:-

ع میں ہوں سب فرشتاں منیں زورتر

ع ہوئے ہیں جو ایکتا مینے حمل سیں

ع گنہگاہاں میں بھریا ہوں میں بے شمار ۳۱

اس کے علاوہ ایک اور لفظ 'موں' بھی استعمال ہوئی ہے۔ جیسے درج ذیل مصرع:-

کہ خیرات سب کام موں سے اول ۳۲

لیکن یہ استعمال کم ہوا ہے۔

فائز (م ۱۱۵۱ھ) اور افضل جھنجھانوی کے یہاں مینں اور ہیں، دونوں کا استعمال ملتا ہے۔ افضل کے زمانے کے تعین کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے میں اسپرنگر نے اپنی فہرست میں، محمد قیام چاندپوری کے تذکرے کے حوالے سے لکھا ہے کہ "افضل، عبداللہ قطب شاہ سے جو ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوتا ہے، پیشتر گزرا ہے"۔ شیرانی لکھتے ہیں:-

"قایم نے افضل کا جو زمانہ دیا ہے اس میں بظاہر ایک غلطی معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ عبداللہ قطب شاہ درحقیقت ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے نہ کہ ۱۰۲۰ھ میں، جو کہ محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے۔ اس کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ یا تو قایم نے محمد قطب شاہ کے نام کے بجائے عبداللہ قطب شاہ یا ۱۰۳۵ھ کی جگہ ۱۰۲۰ھ لکھ دیا" ۳۳

۳۱-۳۲ اسمٰعیل امروہوی - اردو کی دو قدیم مثنویاں ص ۱۳۳-ص ۱۱۲ نقوش پریس لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۶ء

۳۳ حافظ محمود شیرانی - پنجاب میں اردو ص ۲۴۰ - مکتبہ معین الادب لاہور - دوسرا ایڈیشن۔

مندرجہ بالا دونوں آرا سے زمانے کا بالکل صحیح تعین تو نہیں ہو سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افضل ۱۰۲۰ھ یا ۱۰۲۵ھ سے قبل کسی وقت گزرا ہے۔ اس کے "بارہ ماسہ" کا ایک طویل اقتباس شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں نقل کیا ہے اس سے دو مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

۱۔ او تھا (اٹھا) کر گھر مینں دھوم مچا ہی (مچائی)

۲۔ تمامی تن بدن میں آگ لاہی ۳۴

فائز کے یہاں مینں اور میں دونوں مستعمل رہے۔ 'مینں' کے استعمال کے سلسلے میں ایک مصرع دیکھیے :-

اس گھر مینں وہ دلبر استادہ نہ آیا ۳۵

تاباں کے یہاں صرف 'میں' استعمال ہوا ہے جیسے درج ذیل مصرع :-

چمن میں نہایت مرا دل لگا تھا ۳۶

'کربل کتھا' کا ایک جملہ ہے :-

مدینہ میں دادا کی قبر پر ہوتیاں۔ ۳۷

حاتم کا ایک مصرع بھی درج ذیل ہے :-

شکست آتی ہے اس میں موج مے سے دیکھیو ساقی ۳۸

نسبتاً قدیم نمونوں کے لیے شیرانی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کچھ اور تحریریں نقل کی ہیں۔

---

۳۴ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۲۱۸-۲۱۹، بحوالہ افضل۔ بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی۔

۳۵ فائز۔ دیوان فائز ص ۱۲۸۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ عمدہ پریس دہلی سنہ ۱۹۴۶ء

۳۶ تاباں۔ دیوان تاباں ص ۳۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن سنہ ۱۹۳۵ء

۳۷ کربل کتھا۔ ص ۸۹۔ تالیف فضل علی فضلی۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۵ء

۳۸ شیخ ظہور الدین حاتم۔ شاہ حاتم حالات و کلام ص ۱۹۸۔ مرتبہ غلام حسین ذو الفقار۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور ۱۹۶۴ء

"پرتھی راج راسا" سے کچھ اقتباس، شیرانی نے نقل کیا ہے، ظرفی "میں" کے سلسلے میں اس کے چند مصرعے دیکھیے:-

۱- بتّن منّ اکین چوالیس یارن

۲- سوا سیر دن مان

۳- سنے کرن آنا بھی پٹ آین

۴- ملے آپ بین سن مکھن دست جو میں [۳۹]

شیام سندر داس کا کہنا ہے کہ "پرتھی راج راسو" میں "میں" کے ساتھ ساتھ "مجھ" بھی استعمال ہوا ہے۔[۴۰]

"پرتھی راج راسو" چند بردائی کی تصنیف ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے کہ "ہندی کے سب سے پہلے اور بڑے شاعر ہونے کا فخر چند بردائی (۱۱۵۹ء تا ۱۱۹۲ء) کو حاصل ہے جس کی مشہور و معروف تصنیف "پرتھوی راج راسو" سے متعلق تحقیق کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ یہ دہلی کے آخری ہندو راجا پرتھوی راج کا دوست، وزیر اور درباری شاعر تھا۔"[۴۱] آگے مزید لکھتے ہیں کہ "پرتھی راج کے بہت سے ٹکڑوں سے ہریانی کھڑی بولی کی شکل جھلکتی ہے۔ پرتھوی راج نے چونکہ دہلی کو راج دھانی بنایا تھا اس لیے وہاں کی زبان سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ لیکن دہلی (پرانا اندر پرست) ہریانی کے علاقے میں واقع تھی اس لیے اس کی بعض خصوصیات (بھی) پائی جاتی ہیں۔"[۴۲] چند بردائی چونکہ پرتھی راج کا وزیر بھی تھا لہٰذا وہ راجا کے ساتھ اسی علاقے میں رہا ہوگا چنانچہ اس کی زبان پر بھی کھڑی بولی کے اثرات لازمی ہیں۔ "پرتھی راج راسو" سے چند مصرعے اوپر نقل کیے گئے اب "پرتھوی راج" کے (بارھویں صدی عیسوی کے) ایک پروانے سے ظرفی "میں" کے استعمال کے سلسلے میں نمونہ ملاحظہ ہو:-

---

۳۹- حافظ محمود خاں شیرانی۔ پرتھی راج راسا (مطالب و تنقید و تبصرہ) ص ۲۳۸-۲۳۷، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۴۳ء

۴۰- شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۱، بحوالہ شیام سندر داس، ہندی بھاشا اور ساہتیہ ص ۱۴۷

۴۱- ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو ص ۷۵، مطبع عالیہ لاہور، پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۶ء

۴۲- ایضاً ص ۸۰-

"جین کے ابیچ میں راگڑ روپیہ ۵۰۰۰ تمرے آ بائی گو ڑے کا کرچہ سوائے
آ دین گرے گھائم سے ان کو کوئی معاف کریں گے" ۴۳

(ترجمہ: جس کے سبب پانچ ہزار نقد اور باقی گھوڑے کا خرچ یعنی شاہی خزانے سے بھیجا جاتا تھا۔)

یہ پروانہ جس کا اقتباس اوپر نقل کیا گیا، آنند سمبت ۱۱۴۵ میں لکھا گیا جس کا بکرم سمبت ۱۲۳۵ ہوتا ہے اور عیسوی کے اعتبار سے یہ بارھویں صدی کے ہوتے ہیں ۴۴

پرتھوی راج کی بہن پرتھا بائی کا ایک خط دستیاب ہوا ہے جو اس نے ستی ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کو لکھا تھا، اس خط کے چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

"سری حضور سمر (جنگ) میں مارے گئے اور ان کے سنگ رشی کیش بھی بیکنٹھ کو پدھارے ہیں۔ رشی کیش جی ان چار لوگوں میں سے ہیں جو دلی سے میرے سنگ دھیز میں آئے تھے" ۴۵

اس پروانے میں تینوں مقامات پر "میں" کا استعمال موجودہ صورت اور قاعدے کے مطابق نظر آتا ہے

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے برج کا درج ذیل شعر بھی اپنی کتاب میں درج کیا ہے:۔

بانہہ چھڑائے جات ہو جان کر بنل موئے
ہردے میں سے جاؤ گے تو مرد بدھوں گی توئے ۴۶

نیز کھڑی اور برج ملی زبان کے نام سے خسرو کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:۔

ایک گنی نے یہ گن کینا + ہریل پنجرے میں دے دینا ۴۷

۴۳۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو ص ۸۱ ۔ مطبع عالیہ ۔ لاہور ۔ ۱۹۶۶ء

۴۴۔ ایضاً ص ۸۰

۴۵۔ ایضاً ص ۸۱

۴۶،۴۷۔ ایضاً ص ۱۰۳-۱۰۲

نام دیوجی کے نام سے جو شبد "گروگرنتھ صاحب" میں درج ہیں ان سے کچھ انتیا ساتھ عباد اللہ گیانی نے اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ ان میں ظرفی 'میں' کے لیے 'میں' کے علاوہ 'من' کا استعمال ملتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

۱۔ دیہی مسجد (مسجد) من (میں) مولانا سیج نواج (نماز) گجارے (گزارے)۔

۲۔ بادساہ (بادشاہ) مہل (محل) میں جائے۔ ؎۴۸

بھگت کبیر جی کے کلام سے انہوں نے جو شبد نقل کیے ہیں ان میں 'ماہیں' اور 'ماھی' کا استعمال بھی ملتا ہے مثلاً:۔

۱۔ بندے کھوج دل ہر روج (روز) نہ پھر پریسانی (پریشانی) ماہیں (میں)۔

۲۔ ہم مندرے مندرے من ماھی ؎۴۹

سہیل بخاری کا کہنا ہے کہ "اردو کے پورے جلے اور فقرے ہمیں پہلی بار بھگتوں کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور ان میں مرہٹی کے شاعر گیانیشور کو اردو کا پہلا شاعر کہا جا سکتا ہے۔" ؎۵۰ گیانیشور کے درج ذیل شعر میں 'موں' اور 'میں' دونوں لفظ پہلو بہ پہلو استعمال ہوئے ہیں:۔

دنیا تج کر کھاک لگائی جاکر بیٹھا بن موں

کھیچر مدرا بجر اسن میں دھیان دھرت ہے من موں ؎۵۱

گیانیشور کی چھوٹی بہن مکتا بائی بھی مرہٹی بولی کی شاعرہ تھی۔ اس کا جنم شک سمبت ۱۲۰۱ مطابق سنہ ۱۲۷۹ عیسوی بتایا گیا ہے۔ اس کے شعروں میں بھی کھڑی بولی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ایک مصرع یہاں نقل ہے:۔

؎۴۸ عباد اللہ گیانی۔ گروگرنتھ اور اردو ص ۳۹ سویرا آرٹ پریس لاہور۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۶۶ء

؎۴۹ ایضاً ص ۵۰-۵۱

؎۵۰ ڈاکٹر سہیل بخاری۔ اردو کی کہانی ص ۱۶۱، منظور پریس لاہور، اشاعت اول سنہ ۱۹۷۵ء

؎۵۱ ایضاً ص ۱۶۱

لال بیچ میں اولا گالا او ستھ پنپڈ سوں کالا ۵۲

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے "ھمیر راسو" سے ایک نمونہ نقل کیا ہے جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ "ھمیر راسو" شارنگ دھر ۵۳ سے منسوب ہے اور ہندی ادبیات کے "ویر گاتھا" ۵۴ عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں زبان نکھر جاتی ہے۔ یہ نمونہ جو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے سنہ ۱۳۱۴ عیسوی کا ہے:۔

ڈھولا ماریا ڈھلی مانہہ مچھیو میچھ سر پیر

(دلی میں ڈھول بجایا گیا اور ملیچھوں (مسلمانوں) کے سر پیر (جسم) بے ہوش ہو گئے) ۵۵

اس مطالعے سے جو حقایق سامنے آتے ہیں انہیں مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:۔

زبان	روپ	محل استعمال
۱۔ گجراتی	موں ۔ ماں ۔ مینہ ۔ مہیں ۔ منہہ ۔ میں	ظرفی
۲۔ دکنی ۵۶	ماں ۔ مینہ ۔ مانہہ (موں) ۔ منجھار ۔ مجھار (بلا نون غنہ)، منے ۔ منیں ۔ میں (موں کا استعمال کمی کے ساتھ ہوا ہے)۔	"
۳۔ اردو (کھڑی، ہریانی)	منے ۔ منیں ۔ میں (موں بہت کم)	"
۴۔ قدیم ہندی ۵۷	موں ۔ ماں ۔ مہی ۔ میں ۔ مجھ	"
	(قدیم ہندی میں "ماھیں" اور "مہم" بھی ہے) ۵۸	"

۵۲ ڈاکٹر سہیل بخاری ۔ اردو کی کہانی ص ۱۶۲ ۔ منظور پریس لاہور ۔ سنہ ۱۹۷۵ء

۵۳ اپ بھرنش کا نامور مصنف اور شاعر ۔ اس دور کے دو ایک دوسرے مصنف و شاعر ودیادھر اور سوم پربھ گزرے ہیں۔ ایضاً ص ۲۱

۵۴ لفظ "گاتھا" سے مراد پراکرت ہوتی تھی اور "دوھا" سے اپ بھرنش یعنی رائج الوقت زبان (مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۶۶)

۵۵ ڈاکٹر مسعود حسین خان ۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۴۲ ۔ مطبع عالیہ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء

۵۶ مانہ، منہ، منھ وہ لفظ ہیں جو گجراتی سے قبل کی دکنی تحریروں میں ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

۵۷ پرتھی راج راسو کی زبان کو بھی لوگ قدیم ہندی کہتے ہیں ۔ ص ۴۷ ۔

۵۸ ڈاکٹر شوکت سبزواری ۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۲۷ ۔ دی ستی پریس ڈھاکہ ۔ سنہ ۱۹۵۶ء ۔

۵- ہریانی۔ ماں ۔ مانہیں ۔ مانہہ ۔ میں ۔ ماھیں ۔ موں ۔ مانجھ ۔ ظرفی۔

۶- مرہٹی - میں ۔ موں ۔ مام ۔ نیز منز (نیں) मAम - मधील ۵۹ "

۷- برج بھاشا۔ میں ([illegible]) ۔ مٹیں ([illegible]) "

۸- قنوجی میں ([illegible]) ۔ مائیں ۔ مٹیں ([illegible]) ۔ ماں ([illegible]) ۔ موں ([illegible]) ۵۹ "

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظرفی 'میں' بالکل ابتدا ہی سے اردو میں اپنی موجودہ صورت میں مل رہا ہے ۔ البتہ اس کے پہلو بہ پہلو دوسرے لغات بھی برابر مستعمل رہیں ۔ اس کا مطلب ہے یہ دوسرے لغات 'میں' کا ماخذ نہیں ۔ اسی طرح 'میں' کو دوسرے لغات کا ماخذ کہنے میں تامل ہوتا ہے ۔ کیونکہ اگر ان میں سے کوئی ، دوسرے سے ماخوذ ہوتا تو ماخذ کو مٹ جانا چاہیے تھا اور صرف اس کے نکھرے ہوئے روپ کو باقی رہنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے ۔ جس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ تمام لغات کسی ایک زبان کے ایک یا چند لغات سے ماخوذ ہوں یا پھر مختلف زبانوں کے مختلف لغات ان میں سے ہر ایک کا ماخذ ہوں ۔ یعنی ہر لغت کا ماخذ جدا ہو ۔

ماخذ کی بحث

بیمز ، ہورنلے اور بھنڈارکر نے 'میں' کو سنسکرت 'مدھیے' سے نکالا ہے اور اس کے ارتقائی مدارج اس طور پر لکھے ہیں :-

مدھیے ۔ مجھے ۔ ماجھے ۔ ماھے ۔ ماھیں ۔ مائیں ۔ میں ۶۰

ان ارتقائی مدارج سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ "شاید یہ صحیح نہیں اس لیے کہ "مدھیے" کی 'ے' ، ظرفیت کی نشانی ہے جو آخر تک باقی رہی اور برابر اس کا احساس دلاتی رہی کہ کلمہ ظرفی حالت میں ہے ۔ پھر اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ اس پر ए (ہیں) اور اضافہ کیا جاتا ۔ اس کے علاوہ پراکرت میں ظرفی علامت ए ہے اور 'ماھے' میں 'ہ' ، اصل کلمے کی ہے " ۶۱

۵۹ مولوی عبدالحق (مرتب) مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر ص ۲۱

۵۹ جارج گریرسن - لنگوسٹک سروے آف انڈیا ص ۱۴۵

۶۰-۶۱ شوکت سبزواری ۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۴۷ ۔ دی گئی پریس ڈھاکہ ۔ ۱۹۵۶ء

"قدیم ہندی میں "ماھیں" کے ساتھ ساتھ "مہ" بھی ہے"۔ ۶۲ بھنڈارکر کے اس خیال پر جرح کرتے ہوئے شوکت صاحب لکھتے ہیں: "ماھیں" اگر "ماہ" کی ظرفی حالت ہے تو "مہ" کو کیا کہیں گے۔ اس میں "م" ظرف کی علامت نہیں۔ یہ "م" کہاں سے آیا اور کیوں آیا؟ پھر اس کی بھی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی کہ "ماھے" کی "ن" کس لیے حذف ہوئی ۶۳

اس کے بعد وہ اس جانب بھی متوجہ کرتے ہیں کہ دکنی اردو میں "میں" کے ساتھ ساتھ "منے" بھی مستعمل تھا "منے" کیسے بنا؟ اگر یہ "مدھیے" کی بدلی ہوئی صورت ہے تو "ن" اس میں کہاں سے آیا؟ یہ سوالات کافی اہم ہیں اور جب تک ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہ ہو "میں" کا مذکورہ بالا اشتقاق صحیح اور قابلِ اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ۶۴

شیام سندر داس نے بھی اس اشتقاق سے اختلاف کیا ہے اور اس کی دو وجہیں بتائی ہیں۔ اول یہ کہ "مدھیے" سنسکرت میں اور "مجھے" پراکرت میں کلمے کی اضافی حالت پر جوڑے جاتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آزاد اور مستقل کلمے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ اعرابی لاحقے کا کام دے سکیں۔ دوسرے "پرتھی راج راسو" میں "مجھ" اور "میں" ساتھ ساتھ استعمال ہوئے ہیں اگر "میں" "مجھ" سے گھس گھسا کر بنا تھا تو "مجھ" کو مٹ جانا چاہیے تھا۔

شیام سندر داس کے نزدیک ماجھ، ماھیں، میں وغیرہ کلمات کی اصل "مدھیہ" ہے لیکن "میں" پراکرت मिम्म، پالی सिम या म्हि سے ڈھالا گیا تھا ۶۵

شوکت سبزواری کے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں۔ وہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اگر "میں" اور "منے" کی

---

۶۲ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۷ بحوالہ بھنڈارکر ص ۲۶۱

۶۳ ایضاً ص ۲۳۷

۶۴ ایضاً ص ۲۳۷

۶۵ ایضاً ص ۲۳۸ بحوالہ شیام سندر داس۔ ہندی بھاشا اور ساہتیہ ص ۱۴۷

اصل स्मि ہے تو "میں" کا غنہ اور "مینے" کا نون کس حرف کا قائم مقام ہے ۶۶ وہ اس رائے کے موید ہیں کہ اردو "میں" اور دکنی "مینے" دونوں سنسکرت "سمن" سے ماخوذ ہیں اور اس کے تغیرات یہ ہیں:۔ स्मिन - स्मिन - मों - मैं اس میں इ کا ए سے تبادلہ ہوا جو پراکرت عہد سے چلا آرہا ہے ۶۷ "مینے" کی تبدیلیاں اس طور پر بتائی ہیں:۔ سمن - ممن - ہمین - مینن - مینے - اس میں دو میموں میں سے ایک میم "نون" سے بدل گیا۔ جیسے سم، کا "م" "ن" سے بدل کر "سن" ہو گیا تھا ۶۸ پروفیسر ویبر نے بھی اس رائے کا اظہار کیا تھا جب کہ کیلاگ کے نزدیک "میں" اور وہ تمام لغات جن میں نون ہے "مدہیے" سے ماخوذ نہیں ہو سکتے۔ ان کے خیال میں ان کا ماخذ "مدہیم" ہے ۶۹ جو شوکت صاحب کے نزدیک "مدھیہ" کی منقولی حالت ہے۔ اس سے "میں" اور دوسرے لغات کو اخذ کرنا صحیح نہیں ۷۰

وھٹنی (Whitney) نے اپنی گرامر میں ظرفی حالت کے سلسلے میں "Made ahim" (مَدِ=اہِم) اور "سمے e" (مَدِ=ئم یا =ئام) کا ذکر کیا ہے۔ ان لغات کے استعمالات کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ مَدَاہم یا مَدِ=ہم، رگ وید میں استعمال ہوا ہے اور "سمے e" کی صورت میں منقولی ثانوی (Dative) حالت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کی ایک اور صورت انہوں نے "Madhyam" بھی لکھی ہے ۷۱

---

۶۶ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۸۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

۶۷ ایضاً ص ۲۳۸ بحوالہ بھنڈارکر۔ لیکچرز ص ۵۰م

۶۸ ایضاً ص ۲۳۳ (بحوالہ کیلاگ۔ طبع دوم حاشیہ ص ۱۳۳)

۶۹ ایضاً ص ۲۳۳ " " " " "

۷۰ ایضاً ص ۲۳۸

۷۱ William Dwight Whitney - Sanskrit Grammar - PP: 101-102

"مدھیم" کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے میں آر ایل ٹرنر نے بتایا ہے کہ "مہابھارت" میں یہ بیچ میں یا درمیان (Amongst) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی چند اور لغات بھی انہوں نے قدیم کتب کے حوالے سے لکھی ہیں جو یہ ہیں: —

۱۔ مدھیا یا مدھیہ "Madhya" رگ وید میں۔

۲۔ مدھ ینا "Madhyena" شاستر ابرہما میں۔

۳۔ مدھیے "Madhye" منو کا دھرم شاستر میں۔

یہ تینوں لغات 'درمیان' یا 'میں'، ہی کے طور پر استعمال ہوئی ہیں [۴۲]

کیلاگ نے بھی "مدھیم" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ 'میں' اور وہ تمام لغات جن میں 'نون' ہے "مدھیے" سے ماخوذ نہیں ہو سکتے، ان کے خیال میں ان سب کا ماخذ "مدھیم" ہے [۴۳] شوکت صاحب کے نزدیک "مدھیہ" کی مفعولی حالت ہے (یعنی مدھیہ سے "مدھیم") [۴۴] ہو سکتا ہے یہ خیال صحیح ہو۔ آر ایل ٹرنر نے اس ذیل میں ایک اور لغت مدھیات "Madhyat" لکھی ہے اور بتایا ہے کہ "رامائن" میں اس کا استعمال 'سے' کے معنوں میں یعنی مجروری حالت کے لیے ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف لغات مدھیے، مدھیم، مدھ ینا اور مدھیات ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں ان میں اصل اور بنیادی لغت 'مدھیہ' یا 'مدھیے' ہے۔ اس کی تصریف (اس پر دوسرے حروف بڑھا کر) دوسری لغات بنائی گئی ہیں مثلاً 'مدھیم' میں 'مدھیہ' پر 'م' کا اضافہ اور "مدھیات" میں 'مدھیہ' پر 'ات' کا اضافہ، اور "مدھینا" میں 'مدھیہ' پر 'نا' [۴۵] یا 'نا' کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لحاظ سے 'مدھیات' کے معنی 'میں سے' ہوں گے۔ اس اعتبار سے 'ات'، کا لاحقہ 'سے' کے لیے اور لفظ 'مدھیے' 'میں' کے معنوں میں ہے۔

R. L. Turner. A comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages. P563 [۴۲]

[۴۳] اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۳ بحوالہ کیلاگ۔ طبع دوم کلکتہ ص ۱۳۲

[۴۴] ایضاً ص ۲۳۸

[۴۵] مدھیہ یا مدھیے میں آخری حرف متحرک تھا اور اس کا املا یہ تھا: मध्ये

پلیٹس کی تحقیق کے مطابق 'میں'، ہندی لفظ ہے جو عوامی بولی میں "میں" (मैं ، بیائے معروف) کی صورت میں تھا۔ اس سے پہلے اپ بھرنش پراکرت میں اس کی صورت یہ تھی मजझ हिं (مجھیں)۔ پراکرت میں یہ मजझी - मजिझ - मझि تھا۔ اس سے پیشتر سنسکرت میں मध्ये تھا (مدھئے یا مدھیہ) جو کہ ظرفی حالت ہے मध्य کی [۲۶] یہ मध्ये وہی لفظ ہے جسے ہم اردو میں "مدھیے" یا "مدھیہ" لکھتے ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کیلاگ اور ہورنلے، اسم کی غیر فاعلی حالت اور صیغہ جمع کی فاعلی حالت کو ایک بتاتے ہیں ان کے خیال میں یہ سنسکرت اضافی لاحقے स्य (سیہ) سے حاصل کی گئی تھیں۔ جس کے مختلف تغیرات یہ ہیں:- ए - हे - हि - सि - स्य

بھنڈارکر بھی اسے اضافی حالت ہی سے ماخوذ بتاتے ہیں لیکن چیٹرجی کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک یہ اسم کی ظرفی حالت ہے جو ए سے ماخوذ ہے۔ ए قدیم آریائی میں "ادھی" تھا۔ پالی میں "دھی"، ہوا۔ پراکرت میں "ڈھی" یا "ڈھیم" [۲۷] چنانچہ چند بردائی کے "راسو" میں صرف ایک لاحقہ हि چار مختلف حالتوں یعنی مفعولی (تانوی Dative)، مجروری، اضافی اور ظرفی کے لیے استعمال ہوا ہے [۲۸] یہ "ہی" اور "ہم"، بعد کے دور میں "ہے"، اور "ہیں"، کی صورت میں تبدیل ہوئے، جو بیمز کے نزدیک جدید بولیوں کے دور کے آغاز میں ہوا۔ "میں" کی بعض لغات کا استعمال ان لاحقوں کے وجود کو ثابت کرتا ہے جیسے ہی (میں)، ماھی، ہم، مہیں، مہے، منجھ یا مانجھ وغیرہ۔

آر۔ایل۔ٹرنر نے بتایا ہے کہ پالی اور اس کے بعد پراکرت میں "مجّھا" ظرفی معنوں میں استعمال ہوا [۲۹]

---

[۲۶] John T. Platts. A Dictionary of Urdu, classical Hindi & English. Oxford Press. P: London.

[۲۷] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص۲۰ ۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء

[۲۸] ایضاً ص۲۰۹ بحوالہ بیمز۔ تقابلی گرامر۔

[۲۹] R. L. Turner. A Comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages. P. 563

ہریانی اور دہلی میں اس کی صورت "منجھا" Manjha ہے۔ اس میں درمیانی 'میم' نون غنہ سے بدل گیا ہے۔ ہندی میں "منجھ"، مراٹھی میں "مجھ" اور "مجھیں" ہے [۸۰] قدیم اردو کی دکنی شاخ میں "منجھ" اور "مجھ" پر لاحقہ 'ہار'، یا 'آر'، بڑھا کر منجھار اور مجھار بنایا گیا۔ چنانچہ اس کے وجود کا ثبوت نصرتی اور ہاشمی وغیرہ کے کلام سے مل جاتا ہے جس کے نمونے پہلے درج کیے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہریانوی شاعروں کے یہاں 'مانجھ' استعمال ہوا ہے۔ ماقبل حرکت کا اشباع ہریانی کی خصوصیت ہے چنانچہ 'منجھ' کو 'مانجھ' بنا لیا۔ یہ وہی 'مانجھ' اور 'منجھ' ہے جس پر 'دھار' لاحقہ لگا کر اردو میں مانجھ دھار، منجھ دھار اور 'منجدھار' بنایا گیا۔

"میں" کے ماخذ کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی رائے یہ ہے:۔

> "میں" سنسکرت کے لفظ "مدھیا" سے بنا ہے۔ 'مدھیا' کی مختلف صورتیں رفتہ رفتہ مدھیا، مدھی، مہی، ماہی اور ماہ ہوئیں۔ ان میں "دھا" 'ہا' اور 'یا' سے بدلا اور 'یا' بعد میں 'ای' ہوئی پھر 'ای' بھی غائب ہو گئی"۔ [۸۱]

"مانجھ" کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی تحقیق یہ ہے کہ مانجھ بھی درمیان استعمال ہوتا تھا اور یہ بھی "مدھیے" (مَدْھیِ) ہی سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد کی صورتیں یا ارتقائی مدارج انھوں نے یہ لکھے ہیں: "ماہیں - مہاں - میں - موں - غرض "میں" آخر میں "ماہیں" سے بنا ہے" [۸۲]

اب ایک بار پھر ادبِ اردو کی جانب توجہ کریں۔ ۸۲۵ھ و ۸۳۶ھ کے درمیان دکنی اردو میں چند لغات مانہ، مانہہ، منہ اور میں، نظر آتی ہیں۔ ہاشمی دکنی و نصرتی کے یہاں "مجھار" اور "مجھا" بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ 'موں'، کا استعمال شاذ ہے۔ عام طور پر فخر دین نظامی کے بعد وکی تک،

۸۰۔ L. Turner. A Comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages. P563

۸۱۔ مولوی عبدالحق - قواعدِ اردو ص۱۴۶ - جی ایف پریس لاہور۔

۸۲۔ ایضاً ص۱۴۶ -

شعرا کے یہاں جس لفظ کا استعمال عام ملتا ہے وہ "میں" ہے۔ "مینے" اور "منیں" اس کے پہلو بہ پہلو استعمال ہوتے رہے ہیں۔ گجراتی اردو میں مانہ، منہ، ماھیں، ماہی اور مانہی وغیرہ کا استعمال عام طور پر ملتا ہے۔ کہیں کہیں "موں" بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ استعمال جن بزرگوں کے یہاں ملا وہ ۹۱۲ھ سے ۱۰۲۳ھ کے درمیانی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دکنی میں غالباً ۹۱۲ھ سے قبل [illegible]، منہ اور مانہہ کا استعمال ترک ہو چکا تھا۔ ممکن ہے یہ لغات گجراتی نے دکنی سے لی ہوں یا پھر کسی ایسی زبان سے، جس میں یہ لغات بعد تک موجود رہیں۔

شمالی ہند کے اردو شعرا میں امیر خسرو، اسمٰعیل امروہوی، تاباں، فضلی، افضل، حاتم وغیرہ کبھی کے یہاں "میں" کا استعمال عام طور پر ہوا ہے۔ البتہ "مینے" اور "منیں" بھی پہلو بہ پہلو "میں" کے ساتھ مستعمل رہے۔ نام دیو کے نام سے جو شبد "گرو گرنتھ اور اردو" میں نقل کیے گئے ہیں ان میں "من" اور "میں" استعمال ہوئے ہیں [۸۳] نیز بھگت کبیر جی کے نام سے جو شبد درج ہیں ان میں "ماھی" اور "ماھیں" بھی "میں" کے پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ کبیر داس کا زمانہ چودھویں صدی کا آخری یا پندرھویں صدی عیسوی کا پہلا چوتھائی حصہ بتایا گیا ہے۔ نام دیو کا کبیر داس سے پہلے ہونا بھجنوں سے ثابت ہے [۸۴] کبیر کا جہاں تک تعلق ہے وہ بنارس کے رہنے والے تھے اس لیے ان کی زبان جیسا کہ خود ان کا بیان ہے "بولی میری پورب کی تاہے چینے نہ کوئی"۔ مشرق کی معیاری اور مستند اودھی ہے۔ لیکن ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ کھڑی میں بھی ہے جسے شیرانی نے نقل کر دیا ہے [۸۵] اس کے علاوہ "قدیم اودھی" میں جو ملک محمد جایسی اور تلسی داس کی زبان ہے "مہم" بھی استعمال ہوا ہے [۸۶] [illegible]

---

[۸۳] عبادالله گیانی۔ گرو گرنتھ اور اردو۔ سویرا آرٹ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۶ء

[۸۴] سہیل بخاری۔ اردو کی کہانی ص ۱۶۳۔ منظور پریس لاہور۔ طبع اول سنہ ۱۹۷۵ء

[۸۵] شوکت سبزواری۔ داستانِ زبانِ اردو۔ ص ۲۰۵۔ انجمن پریس کراچی طبع اول سنہ ۱۹۶۰ء

[۸۶] شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل۔ ص ۴۳۔ انجمن پریس کراچی۔ طبع اول سنہ ۱۹۶۲ء

کے یہاں 'میں' اور 'موں' کا استعمال ایک ہی شعر میں ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ گیسو دراز کی بہن ملکہ بائی کے کلام میں بھی 'میں' کا استعمال ملتا ہے۔ ۱۴۳۱ عیسوی کا ایک نمونہ جو مسعود حسین خان نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو" میں دیا ہے اس میں 'مانہہ' کا استعمال ملتا ہے۔ "پرتھی راج راسو" میں مٹ۔ ماں۔ مہی اور میں، پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ "پرتھی راج راسو" قدیم ہندی میں ہے اور بارھویں صدی عیسوی کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ بھنڈار کر نے لکھا ہے کہ قدیم ہندی میں "ماہیں" اور "مہم" بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یہ دونوں لغات پہلو بہ پہلو دیکھنے میں آئے۔

ہریانی میں ماں، ماہیں، مانہہ، مانجھ، موں اور میں کا استعمال کیا گیا ہے۔ برج بھاشا میں 'میں' اور میں 👈 (یائے معروف) ہے۔ برج ملی کھڑی میں 'میں' کا استعمال ہوا ہے۔ قنوجی میں ماٹیں، مٹیں، میں، ماں اور موں ہیں۔

اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'میں' وہ واحد لغت ہے جو تقریباً ہر ایک کے یہاں ملتی ہے اور آخر تک برقرار رہتی ہے۔ باقی لغات کچھ عرصے کے لیے نظر آتی ہیں اور معدوم و متروک ہو جاتی ہیں۔ البتہ 'منے' 'منہ' اور 'میں' وہ لغات ہیں جو عرصے تک اردو میں پہلو بہ پہلو استعمال ہوتی رہیں جب کہ دوسری لغات متروک ہو چکی تھیں۔ بعد میں تحریکِ اصلاحِ زبان کا اس پر بھی اثر ہوا چنانچہ مینں اور منے کو متروک قرار دے کر صرف 'میں' کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے انشاء اللہ خاں انشا لکھتے ہیں :-

"میں ان صاحبوں کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے کئی نامعقول الفاظ ترک کر دیے جیسے 'منے' بمعنی 'میں' (درمیان) پہلے یہ لفظ شعروں میں آتا تھا جیسا کہ میاں آبرو نے کہا ہے : ہر منے جانہ نہ تھا اک جھول تھی " ۸۷

---

۸۷ شوکت سبزواری - داستانِ زبانِ اردو ص ۱۴۰ مطبوعہ انجمن پریس کراچی - طبع اول سنہ ۱۹۶۰ء

بحوالہ دریائے لطافت (ترجمہ) ص ۵۹

حرفِ ربط "تک" کا استعمال

حروفِ ربط میں سے ایک حرف "تک" بھی ہے۔ اس میں عہد بعہد جو تغیرات ہوئے ان کے مطالعے کے لیے اول فخر دین نظامی دکنی کی تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" کو لیجیے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

بڑا شاہ وہ شاہ جس شاہ جگ
رہیں سیوتے جیہ لتن پائے لگ

کہیں 'لگ' کو تشدید کے ساتھ لکھا گیا ہے مثلاً یہ شعر:۔

گگن بھیر کی جے بلیں لگّ ایک
ہر ایت سکیں لگّ نکہ پائی ٹیک

اور کہیں 'لگ' کی جگہ 'لگوں' استعمال ہوا ہے جیسے یہ شعر:۔

ہماری تلا واج منگا سنبار
رہیا پالگوں کمال ہو کر بجار [1]

اس مثنوی میں 'تک' کا استعمال نہیں ملا۔

شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری کے یہاں 'لک' اور 'لگ' استعمال ہوئے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ کیجیے:۔

اب نہ چھپوں اب نہ ڈروں، ڈروں کو کہاں لک ڈروں
جب لگ تن نہیں چھوڑیا جیوں تب لگ ہونا دور
جب لگ نظر نہیں چھوڑی آنکھوں تب لگ ہونا دور [2]

---

[1] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۱۱۷-۸۳ ق ۳-۷۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ مطبوعہ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۷۳ء

[2] مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵۵ ق ۶۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت چہارم ۱۹۷۷ء
بحوالہ شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ)۔ ان کے یہاں بھی 'تک' کا استعمال نہیں ملا۔

شیخ وجیہہ الدین گجراتی (م ۹۹۸ھ) کی "تاج الحقایق" کا ایک جملہ ہے :۔

سمجھتے سمجھتے جو اس حد لگ آتے ہیں۔ ۳

مخدوم سید محمد حسینی شہباز گیسو دراز کے "شکار نامہ" میں 'لگ' اور 'تلک' دونوں استعمال ہوئے ہیں۔ دو جملے ملاحظہ ہوں :۔

دیکھتے تہی لگ واں یک محراب تھا

ہور جیلہ نہ تھا سو او کان لیے واں دیکھتے تلک ۔ ۴

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" سے ان تغیرات کی مثالیں دیکھیے :۔

ع کہ سر پا لو لگ نور میں غرق ہے

ع جو رہے لے قیامت تلک یادگار

ع رہیا منتظر خوش ہو آئے تلگ ۵

اس کے برعکس اسی کی نثری تصنیف "سب رس" میں کچھ تغیر ملتا ہے مثلاً :۔

آج لگن کوئی اس جہان میں، اس ہندوستان میں، ہندی زبان سوں، اس لطافت اس چھنداں سوں، نظم ہور نثر ملا کر گلا کر یوں نیں بولیا۔ ۶

حسن شوقی کے یہاں بھی دوسری لغات کے علاوہ 'لگن' بھی ملتا ہے۔ مثالیں درج ذیل ہیں :۔

ع کہ جیتا رہو لگ تیرا ناؤں اچھو

ع قیامت تلک ناؤں رہیا یادگار

۳۔ شیخ وجیہہ الدین گجراتی ۔ "تاج الحقایق" مخطوطہ نمبر م ۱/۱۲۱ ۔ نیشنل میوزیم کراچی ۔

۴۔ مخدوم سید محمد حسینی شہباز گیسو دراز ۔ "شکار نامہ" مخطوطہ نمبر م ۱/۱۲۹ نیشنل میوزیم کراچی ۔

۵۔ ملا وجہی ۔ قطب مشتری (تصنیف ۱۰۱۸ھ) ص ۲ ۔ ۱۶ ۔ ۸ ۔ انجمن ترقی اردو ۔ پاکستان کراچی ۱۹۵۳ء

۶۔ ملا وجہی ۔ سب رس (تصنیف ۱۰۴۵ھ) ص ۱۱ ۔ انجمن پریس کراچی ۔ اشاعت چہارم ۔ ۱۹۷۷ء

ــــہ لگے موم باتیاں کنچن کے لگن
کنچن کے لگن نور تن کے گگن

ع قیامت لگوں یوں رہوے یادگار ــہ۷

کمال خان رستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" (ترجمہ ۱۰۵۹ھ) میں لگ اور تلک پہلو بہ پہلو استعمال ہوئے ہیں: ۔

ــــہ اچھو یاں تھے سب کارواں جائے لگ
وگر نیں تو لڑنے کوں او مجھ تلک ــہ۸

شاہی کے کلام سے بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں! ۔

ع ترے احکام محشر لگ جگت کے سر چڑھایا ہے
ع پایا پورا اچھے اس مقر کا پاتال تلک
ع جو لگوں پانچیں آسمان پہ دستا ہے سنگل ــہ۹

ملک الشعرا ملا نصرتی کے یہاں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں: ۔

ع دھویں کا جلگ سدا تھا دریاں
ع تلک شاہ صاحبقراں تخت پر
ع چلے اوٹھ چلے تب لگوں یوں شکست ــہ۱۰

'لگ' کا استعمال ولی تک کے یہاں ملتا ہے۔ دو مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں: ۔

ع توں سر سے قدم تلک جھلک ہیں

۷ــہ حسن شوقی (۱۰۵۰ھ) - دیوانِ حسن شوقی - مرتبہ جمیل جالبی - انجمن پریس کراچی - اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۱ء

۸ــہ کمال خان رستمی بیجاپوری - خاور نامہ - ص ۵۷۷ حصہ ۲ - ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

۹ــہ علی عادل شاہ ثانی شاہی - کلیاتِ شاہی - ص ۱۲۸ - ص ۱۳۲ - ص ۱۰۶ - مسعود پرنٹنگ پریس دہلی۔

۱۰ــہ ملا نصرتی (م ۱۰۸۳ھ) - دیوانِ نصرتی - مرتبہ جمیل جالبی - مطبع قوسین لاہور - اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۲ء

ع شفق لوہو میں ڈوبا سرسوں پگ لگ ۱۱

شمالی ہند میں جو مختلف لغات دیکھنے میں آتی ہیں ان کے سلسلے میں اول فائز کو لیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

دوری نہ کر کنارے سوں میری تو اے سجا
کب لگ رہے گا دور تک اپنے وطن میں آ ۱۲

تاباں کے یہاں 'تک' استعمال ہوا ہے لیکن 'لگ' کا استعمال بھی مفقود نہیں۔ چند مصرعے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ گو رہیں ہم حشر تک نالاں میں در امید و بیم

۲۔ جب تلک تم کو نہ دیکھوں تب تلک بے چین ہوں

۳۔ تم اس کے حال سے اب لگ نہیں محرم میاں صاحب ۱۳

'لگ' کا استعمال فضلی کی "کربل کتھا" میں بھی نظر آتا ہے جیسے یہ جملہ:۔

نہ جانوں کہ ظالمان امت تم سے کیا کریں اور بعد میرے کام تمہارا کہاں لگ پہنچا دیں ۱۴

شاہ حاتم کے یہاں 'تلک' استعمال ہوا ہے، درج ذیل مصرع دیکھیے:۔

صاحب دلوں کو حشر تلک ہے وہ سجدہ گاہ ۱۵

یہ استعمال درد، سودا، میر سب کے یہاں اسی طرح ہوا ہے۔ درد کا مصرع ہے:۔

جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا ۱۶

---

۱۱ ولی - کلیاتِ ولی - مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی - مطبوعہ انجمن پریس کراچی - اشاعتِ سوم سنہ ۱۹۵۴ء

۱۲ فائز دہلوی - دیوانِ فائز - صفحہ ۱۸۷ - مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب - انجمن ترقیٔ ہند دہلی -

۱۳ تاباں - دیوانِ تاباں - صفحہ ۲۵ - صفحہ ۴۸ - ۲۴۳ - مرتبہ مولوی عبدالحق - انجمن ترقیٔ اردو - اورنگ آباد دکن سنہ ۱۹۳۵ء

۱۴ فضلی - کربل کتھا صفحہ ۷۶ - مرتبہ مالک رام و مختارالدین - دیال پرنٹنگ پریس - دہلی - اشاعتِ اول سنہ ۱۹۶۵ء

۱۵ شاہ حاتم - شاہ حاتم حالات و کلام صفحہ ۶۶ - مرتبہ غلام حسین ذوالفقار - جدید اردو ٹائپ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۴ء

۱۶ درد - دیوانِ درد - مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی - زرین آرٹ پریس - لاہور - سنہ ۱۹۶۲ء

سودا کا مصرع ہے :-

وہ پیچ چکا ہے سر زخم دل تلک یارو ۱۷؎

میر کا مصرع دیکھیے :-

دلِ خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک ۱۸؎

انشا کے یہاں تلک اور تک کا استعمال ملاحظہ ہو :-

دل کے نالوں سے جگر دکھنے لگا

یاں تلک روئے کہ سر دکھنے لگا ۱۹؎

جملہ :- سر سے پانوں تک جتنے رونگٹے ہیں جو سب کے سب بول اٹھیں اور سراہا کریں۔ ۲۰؎

میر امن کی "باغ و بہار" کا ایک جملہ ہے :-

جب تلک اسباب گزارے کا ہاتھ آوے تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے ۲۱؎

میر شیر علی افسوس کے یہاں بھی 'تلک' اور 'تک' بیک وقت ملتے ہیں۔ 'باغِ اردو' سے مثال کے طور پر دو

جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

۱۔ یہاں تلک کہ ایک عالم اس کے ظلم کی تعب سے ہلاک ہوا تھا۔

۲۔ جوان نے ہاتھ دراز کیا اور وہ ملاح کی ریش و گریبان تک پہنچا ۲۲؎

۱۷؎ سودا - کلیاتِ سودا حصہ اول ص۹۰ - مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی - زرین آرٹ پریس لاہور۔

۱۸؎ میر - کلیاتِ میر - ص۱۹ - بترتیبِ جدید مع مقدمہ و فرہنگ - باہتمام کیسری داس - مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۹۴۱ء

۱۹؎ انشا - کلیاتِ انشا - جلد اول ص۱۲ - مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی - ریڈنگ پرنٹنگ پریس لاہور۔

۲۰؎ انشا - کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی - ص۲۲ - مرتبہ مولوی عبد الحق - انجمن پریس کراچی - اشاعتِ سوم سنہ ۱۹۷۵ء

۲۱؎ میر امن - باغ و بہار - ص۵۶ (تصنیف ۱۸۰۲ء) - حمایت الاسلام پریس - لاہور سنہ ۱۹۶۲ء

۲۲؎ میر شیر علی افسوس - باغِ اردو - ص۱۳۴، ۲۸ (ترجمہ گلستانِ سعدی) ۱۲۱۶ھ = ۱۸۰۲ء - زرین آرٹ پریس لاہور - اشاعتِ اول سنہ ۱۹۶۳ء

میر شیر علی افسوس کی "آرایشِ محفل" کا جملہ ہے :-

پانسو کتاب چھپی اور دور دور تلک پہنچی ۲۳

شاہ نصیر کے یہاں بھی 'تلک' اور 'تک' کا استعمال دیکھیے :-

؎ کھینچے عدم تلک یاں اک انفعال اُس کا

؎ سینے سے وہ کب تک رکھوں تصویر لگا کر ۲۴

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ دکنی و گجراتی ادب میں عام طور پر لگ، تلک، لگن اور لگوں استعمال ہوا۔ غالبا اپنی اثرات کے تحت شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی دور میں بھی 'لگ' کا استعمال مل جاتا ہے۔ لیکن یہ اثرات دیر پا نہیں تھے۔ اردو نے اپنے فطری رجحان تسہیل اور اختصار پسندی کے تحت باقی تمام صورتیں ترک کر دیں اور صرف 'تک' اور 'تلک' باقی رکھا جو آج بھی بعینہٖ استعمال ہوتا ہے۔

ماخذ کی بحث

اردو حرفِ ربط "تک" میں جو تغیرات ہوئے ان کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ اس کے ماخذ کے سلسلے میں ماہرینِ لسانیات نے جن آرا کا اظہار کیا ہے انہیں مختصراً ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

شوکت سبزواری لکھتے ہیں :-

"لگ — تلک — تک — تینوں معنی اور اصلیت کے اعتبار سے ایک ہیں — ان میں اصل اور بنیادی صلہ "لگ" ہے جو سنسکرت "لگن" سے ماخوذ ہے۔ 'لگن' مادہ "لگ" (چمٹنا) سے اسم مفعول ہے۔ "اب لگن" اب لگا ہوا، اب چمٹا ہوا یعنی اب تک۔ پراکرت میں 'ن' کے "گ" میں مدغم ہو جانے سے "لگّ" (بتشدید) بنا۔ اردو

---

۲۳ میر شیر علی افسوس۔ آرایشِ محفل (ترجمہ خلاصۃ التواریخ) ص ۳۔ مرتبہ کلب علیخاں فائق۔ زرین آرٹ پریس لاہور سنہ اشاعت اول ۱۹۶۳ء

۲۴ شاہ نصیر۔ کلیاتِ شاہ نصیر (جلد اول) ص ۱۸۰۔ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ زرین آرٹ پریس لاہور سنہ اشاعت اول ۱۹۷۱ء

میں ایک "گ" الف سے بدلا تو "لاگ"، ہوا۔ لاگ ڈانٹ، سب بولتے ہیں۔ "الف" کی تخفیف سے "لگ" وجود میں آیا۔ تب لگ، تو لگ، تلگ۔ "تو" اور "لگ" سے مرکب ہے۔ "جولگن" (جب تک) اور "تولگن" (تب تک) قدیم اردو میں مستعمل تھے .....

"تک" "تلک" کا مخفف ہے۔ درمیان سے "ل" گرا اور "گ"، "ک" سے بدل گیا۔" ۲۵

جہاں تک تب لگ، تو لگ اور تلگ ("گ" کے ساتھ) کا تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ قدیم اردو میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں، اس کے علاوہ "جو لگ" جب لگ، جلگ اور لگ کے علاوہ "لگوں"، اور اسم موصول "جو" کے ساتھ "جولگوں"، اور "جولگن" وغیرہ۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" کا مصرع ہے:۔ رہیا منتظر خوش ہو آئے "تلگ" ۲۶ ان کی تصنیف "سب رس" میں "تلگن" کی مثال مل جاتی ہے: "آج لگن کوئی اس جہان میں، اس ہندوستان میں، ہندی زبان سوں، اس لطافت اس چھنداں سوں، نظم ہور نثر ملا کر گلا کر یوں نیں بولیا۔" ۲۷ "تلگن" حسن شوقی کے یہاں بھی مل جاتا ہے جیسے یہ مصرع:۔ لگے موم باتیاں کچن کے لگن ۲۸ شوقی نے "لگ"، "تلگ" اور "لگوں" بھی استعمال کیا ہے۔ "لگوں" کی مثال دیکھیے:۔ ع قیامت لگوں یوں رہو سے یادگار ۲۹ شاہی کے درج ذیل مصرعوں میں "جولگوں" اور "تولگوں" استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو:۔

ع جو لگوں لو رسوں دن کرا چھے ہور چاند و گگن

ع تو لگوں رات دن و پہر گھڑی جشن منے ۔ ۳۰

اپنی کا ایک اور مصرع دیکھیے:۔ مشتری سعد ہو جو لگ وعطارد ہے دبیر ۳۱ کمال خاں رستمی بیجاپوری نے

---

۲۵ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۲۱ ۔ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ جولائی ۱۹۵۶ء

۲۶ وجہی۔ قطب مشتری۔ ضمیمہ ص ۳ ۔ / ۲۷ وجہی۔ سب رس ص ۱۱ ۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۷ء

۲۸-۲۹ حسن شوقی۔ دیوان حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۷۱ء۔

۳۰-۳۱ علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیات شاہی۔ ص ۱۲۸ ، مسعود پرنٹنگ پریس دہلی۔ ۱۹۶۲ء

اپنے "خاور نامہ" میں جلگ، لگ، تلک استعمال کیا ہے، "جبلگ" کا استعمال دیکھیے بھی نشاں جلگ لیا لے لوگاں زشاہ[۳۲]

نصرتی نے "جلگ، تلگ، اور تب لگوں استعمال کیا ہے۔ ان کے چند مصرعے حسبِ ذیل ہیں: —

۱۔ دعویں کا جلگ سد انتقا درمیاں

۲۔ تلگ شاہِ صاحب قراں تخت پر

۳۔ چلے اوٹھ چلے تب لگوں یوں شکست[۳۳]

قاضی محمود بحری، ولی کے معاصر ہیں۔[۳۴] ان کے کلام میں "لگ" کے علاوہ "جلگ" "تلگ" کا استعمال بھی ملتا

ہے۔ ایک شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے: —

ہے دریا جلگ تب تلگ موج ہے

ہے سلطان جلگ تب تلگ فوج ہے[۳۵]

اوپر جو استعمالات درج کیے گئے یہ تغیرات دکنی و گجراتی اردو سے مخصوص ہیں۔ شمالی ہند میں "لگ" ابتدائی دور میں کچھ عرصے تک ضرور مستعمل رہا لیکن دوسرے تغیرات مثلاً جلگ، تلگ (بہ انضمامِ اسم موصول) "لگوں" اور "لگن" وغیرہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ البتہ "تک" اور "تلک" کا استعمال عام رہا جو آج تک اس طرح برقرار ہے۔ دکنی و گجراتی اردو میں بھی "لگن" اور "لگوں" بھی بہت عام نہیں رہا بلکہ درمیانی عرصے میں چند شعرا کے یہاں نظر آتا ہے یعنی وجہی، نصرتی، شاہی وغیرہ کے یہاں۔ اس کے بجائے "لگ" زیادہ عام رہا اور اس پر "جو" اور "تو" بڑھا کر جولگ، تولگ، جلگ، تلگ بھی استعمال ہوا لیکن یہ کوئی تغیر نہیں بلکہ "جو" بطورِ اسم موصول استعمال ہوا ہے "تو" اس کے جواب میں۔ اصل حرف "لگ" ہی رہا۔ "تلک" کا استعمال بھی اس دور میں مل جاتا ہے۔

---

۳۲ کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ ص ۵۷۷۔ ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء۔

۳۳ ملا نصرتی۔ دیوانِ نصرتی۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مطبعِ قوسین لاہور۔ سنہ ۱۹۷۲ء

۳۴ ولی کے یہاں ایسے تغیرات دیکھنے میں نہیں آتے۔ "لگ" البتہ ان کے یہاں بھی مل جاتا ہے۔

۳۵ قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری ص ۱۵۹ مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حفیظ۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔

کیلاگ اور پلیٹس اس کی اصل سنسکرت "وگھن" بتاتے ہیں۔ "زانو تک" اصل میں "جانو وگھن" تھا۔ "وگھن" میں قلبِ بعض ہوا۔ یعنی "گھن" کا "ن" "گھ" سے پہلے رکھا گیا تو "ونگھ" ہوا۔ بعد میں تینوں حرف بدل گئے۔ 'و'، 'ت' سے، 'ن'، 'ل' سے اور 'گھ'، 'ک' سے۔ اس طرح "تلک" بنا[36]۔

ہورنلے "تیئں" اور "تے" کی طرح "تک" اور "تلک" کو بھی سنسکرت "تریتے" اور پراکرت "تلئے" سے نکالتے ہیں۔ جس پر مفعولی لاحقہ "ک" اوپر سے اضافہ ہوا۔ تریتے ـ تلئے ـ تلئے ـ تلے ـ تل + ک، تلک ـ "تک" "تلک" کا مخفف ہے۔ یا "ت"، اور "ک"، کا مرکب۔ اس کی تفصیل ہورنلے نے نہیں دی[37]۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ "تک"، "تریتے" سے ماخوذ ہے اس سلسلے میں یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ "تریتے" کے ارتقائی مدارج کی آخری دو کڑیاں یعنی "تلے"، اور "تل"، اردوئے قدیم میں زیریں یا نیچے کے معنوں میں استعمال ہوئی ہیں مثلاً یہ قول: "تم اوپر وے تلے"[38] دکنی تصنیف کدم راؤ پدم راؤ کا ایک مصرع ہے: کسی اونچ دکھلاؤ تل کھینچ لے[39] انھی کا ایک دوسرا مصرع ہے: دوئی آن میں سر دھرے پاؤں تل
حسن شوقی کے یہاں بھی یہ انھی معنوں میں آیا ہے جیسے یہ مصرع:۔ جو دشمن مونڈی تل کرے لاج کر[40]
یعنی دشمن شرم سے سر نیچا کرے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو "تلے"، اور "تک"، میں کوئی مناسبت نہیں۔ کیونکہ "تلے" نیچے کے معنوں میں ہے اور "تک"، وقت اور مقام کے فاصلے یا انتہا کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ مثلاً چار بجے تک (وقت کے فاصلے

36۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۱۱۔ شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ "یہ پر تکلف اور دور از قیاس اشتقاق پروفیسر موئیر ویلیس کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہے۔" ایضاً ص ۲۱۱

37۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۱۱ بحوالہ ہورنلے۔ تقابلی گرامر ص ۲۲۶

38۔ اردوئے قدیم ص ۲۳ (حکیم شمس اللہ قادری)۔ یہ قول خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا ہے۔

39۔ فخر دین نظامی۔ کدم راؤ پدم راؤ ص ۷۲ ـ مرتبہ جمیل جالبی ـ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۷۳ء

40۔ حسن شوقی ـ دیوانِ حسن شوقی ـ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۷۱ء

کا اظہار) یہاں سے وہاں تک (جگہ کے فاصلے کا اظہار) لہٰذا امکان اس بات کا نہیں کہ "تک" تلے اور تل کے ارتقا کا آخری درجہ ہو۔

کیلاگ اور پلیٹس نے "تک" کی اصل "وگھن" قرار دی ہے اور مونیر ولیمس کا کہنا ہے کہ "وگھن" میں قلبِ بعض ہوا، جس کی وجہ سے آخری "ن"، "گھ" سے قبل آ گیا اس طرح "ونگھ" ہوا اور بعد کو تینوں حروف بدل گئے۔ "و"، "ت" سے بدلا، "ن"، "ل" سے بدلا اور "گھ"، "ک" سے۔ اس طرح "تلک" بنا۔ لیکن یہ اشتقاق سراسر معنوی معلوم ہوتا ہے۔ مزید برآں اس اشتقاق میں "لگن" اور "لگ" کا کہیں ذکر نہیں حالانکہ بعض دوسرے لغات کے ساتھ ان دونوں لغات کے استعمال کا وجود و ثبوت قدیم اردو کے مطالعے سے فراہم ہو جاتا ہے۔ جس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ غالباً "لگن" کا آخری "نون" (ن) زبان کے تخفیفی رجحان کی نذر ہوا تو "لگ" بنا۔ ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ "نون" کو غنہ کر لیا گیا اور "لگوں" بنا، اس صورت میں "لگن" کے "گ" پر پیش کی حرکت رہی ہوگی جو "لگوں" میں نون غنہ سے قبل واؤ کی صورت میں قایم ہو گئی۔ بعد میں اردو کی اختصار پسندی کے سبب یہ "وں" گرا دیا گیا اور صرف "لگ" باقی رہا کہیں بتشدید اور کہیں بلا تشدید۔ تاہم دوسری صورت یہ ہے کہ "وں" کا وجود پہلے سے ہو بعد میں "و" کی جگہ ضمہ (پیش) نے لے لی اور نون غنہ پر نقطہ آ گیا، چنانچہ "لگوں" سے "لگُن" بنا۔ پھر "نون" گر جانے سے "لگّ" اور "لگ" باقی رہا۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ اردو کے قدیم ترین دستیاب نمونے "کدم راؤ پدم راؤ" میں "لگوں" ملتا ہے، البتہ "لگن" دیکھنے میں نہیں آتا۔ "لگن" کو وجہی نے "سب رس" میں اور اس کے بعد بعض دوسرے لوگوں نے اپنے کلام میں برتا ہے جس کی مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ لیکن "لگوں" سے "لگن" اور پھر "لگ" کے سلسلے میں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ "لگ" کا استعمال بالکل ابتدا ہی سے (کدم راؤ پدم راؤ میں موجود ہے اور اس کے بعد بھی مسلسل استعمال ہوا ہے) موجود رہا ہے، اس کے ساتھ "لگوں" لیکن بہت عام نہیں۔ پھر کچھ عرصے کے لیے "لگوں" اور "لگن" کا استعمال ہوتا ہے اور متروک ہو جاتا ہے۔ "لگ" البتہ عرصے تک اردو میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس پر "جو" اور "تو" بڑھا کر "جو لگ" اور "تو لگ" استعمال کیا گیا، جب اور تب کے ساتھ "جب لگ" اور "تب لگ"، یہی بعد میں "جلگ" اور "تلگ" کی صورت میں سامنے آتے ہیں

'جو' اور 'تو' اپنی بالکل ابتدائی صورت میں 'جے' اور 'تے' کی صورت میں تھے لہٰذا 'لگ' کے ساتھ مل کر جلگ اور تلگ ہو سکتے ہیں۔ قدیم اردو میں 'گ' اور 'ک' میں سبب فرق نہیں ہوتا تھا جیسا کہ یائے معروف و مجہول میں بھی فرق نہیں کرتے تھے، اس زمانے کے املا سے یہ بات ثابت ہے۔ چنانچہ یہی "تلگ" بعد میں 'تلک' ہو گیا۔ یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ کہیں 'گ' کے استعمال کے ساتھ 'تلگ' اور کہیں 'ک' کے ساتھ 'تلک' استعمال ہوا۔ یہی سبب ہے کہ دونوں کا استعمال ساتھ ساتھ مل جاتا ہے۔

اس کے برعکس "وگھن" میں قلبِ بعض کا ذکر، پھر 'ونگھ' کے تینوں حروف کا دوسرے حروف سے بدل جانا، وہ بھی ایسے حروف سے جو عام طور پر ہمارے یہاں ایک دوسرے کا بدل نہیں ہوتے مثلاً واؤ کا 'ت' سے بدل جانا۔ جب کہ عام طور پر واؤ کا تبادل 'ب' کے ساتھ دیکھا گیا ہے جیسے سنسکرت "وِنشتِ" اردو "بیس"[۱]۔ [۱] نون البتہ لام سے بدل جاتا ہے [۲] لیکن 'گھ' کا 'ک' سے تبادل کس طرح ہوا جب کہ اصولی طور پر سنسکرت کے مخلوط ہا حروف میں سے وقفیہ گر جاتا ہے اور حرف 'ہ' باقی رہ جاتی ہے یہ تغیر 'تھ'، 'گھ'، 'دھ' اور 'بھ' میں زیادہ ہوا ہے مثلاً سنسکرت 'میگھ' - اردو 'مینہ'۔[۳] ایسی صورت میں 'ونگھ' کا ان مختلف حروف سے تبادل اور پھر 'تلک' بن جانا دور از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

'تک' اور 'تلک' کے ماخذ کے سلسلے میں مولوی عبدالحق نے اس خیال کا اظہار کیا ہے :-

"تک سنسکرت میں ایک لفظ 'ترتیا' ہے جس کی اصل 'تری' ہے اور جو سنسکرت میں انہیں معنوں میں آتا ہے جیسے اردو میں 'تک'۔ 'تری' کے ساتھ 'کو' اضافہ کیا گیا تو 'تریکو' ہوا۔ واؤ اڑ گئی 'تک' رہ گیا۔"[۴]

---

[۱] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۱۰۱ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے اردو زبان کا ارتقا ص ۱۲۳

[۳] ایضاً ص ۱۲۹

[۴] مولوی عبدالحق۔ قواعد اردو۔ ص ۱۴۶، جی ایف پریس لاہور۔

وہ مزید لکھتے ہیں :۔

"تلک" کی بھی اصل یہی ہے "تریکو" میں 'ر' 'ل' سے بدل گئی (ر اور ل کا

بدل عام طور پر ہوتا ہے) تو "تلیکو" بنا اور "تلیکو" سے "تلک" بن گیا۔

ہندی اور پرانی اردو اور آج کل کے دیہات میں بھی "لگ" بمعنی "تک" کے آتا ہے۔ ۲۵؎

مولوی صاحب نے جلگ، تلگ، لگوں اور لگن وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے اس امر کی بھی کوئی وضاحت نہیں کی کہ "ترتیا" خود کن معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ نیز یہ کہ سنسکرت "تری" اس کی اصل ہے اور بعد کو اس سے "ترتیا" بنا، تو 'تری' کے ساتھ 'کو' کا اضافہ کس دور کی پیداوار ہے؟ اگر "ترتیا" سے بعد کی ہے تو کس طرح؟ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ 'تری' کے ساتھ 'کو' کا اضافہ کس اصول کے تحت کیا گیا اور کیوں؟ اس کے بعد "تریکو" سے آخری واؤ کیوں اڑ گیا؟ بعد میں وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "تلک" کی اصل بھی یہی "تریکو" ہے۔ اس کی تبدیلی ان کے نزدیک اس طور پر ہوئی کہ "تریکو" کا 'ر'، 'ل' کے ساتھ بدل گئی اور "تلیکو" وجود میں آیا۔ پھر تلیکو سے 'تلک' بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ہندی اور پرانی اردو میں اور آج کل کے دیہات میں بھی "لگ" بمعنی "تک" کے آتا ہے" لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ تک، تلک اور لگ میں سے زیادہ قدیم کون سا ہے؟ انہوں نے اس بات کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا کہ 'لگ' کا ماخذ کیا ہے۔

غور طلب امر یہ بھی ہے کہ "تریکو" کا آخری واؤ اڑ گیا، 'ر'، 'ل' سے بدل گیا تو "تلیک" بننا چاہئے نہ کہ "تلک"۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ 'ی'، تخفیف کی نذر ہو گئی ہو۔ اس صورت میں اس کی حرکت ماقبل حرف یعنی 'ل' پر آجانی چاہئے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو 'ل' پر زیر کے ساتھ "تِلک" بننا چاہئے تھا نہ کہ "تَلَک" (بفتح 'ل')۔ لیکن "تِلک" ادب اردو میں کبھی استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کی تمام لغات میں

۲۵؎ مولوی عبدالحق۔ قواعد اردو ص ۱۲۶۔ جی الیف پریس لاہور۔

دل، پر زبر کی حرکت معلوم ہوتی ہے ۔ لگن، لگوں، لگ، تک، تلک سبھی بفتح لام ہیں، بکسر لام نہیں۔ ان (غالباً) امور پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماخذ کے بارے میں انہوں نے غالباً دوسرے لسانیین کی معلومات پر اکتفا کیا ہے۔ ان پر اضافہ نہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں اپنے ماخذ (اپنی معلومات کے ماخذ) کا کوئی حوالہ دیا ہے۔

شوکت سبزواری نے ماخذ کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں ایک لغت "لاگ" بھی ہے۔ اگر "لاگ" کو درمیانی کڑی سمجھیں تو اسے ماننے میں تامل ہوتا ہے کیونکہ "لاگ" دراصل "لگ" یعنی حد کے تعین کے معنوں میں نہیں اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً غالب کا یہ شعر دیکھیے:-

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں "لگاؤ"
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

اس میں "لاگ"، دشمنی اور دوری کے معنوں میں ہے قرب اور انتہا بتانے کے لیے نہیں۔

ہمارے نزدیک امکان اس بات کا ہے کہ "لگّ" (بتشدید) میں 'گ' کو اردو نے اپنے رجحانِ تسہیل کے مطابق سہل کر لیا ہو اور تشدید گرادی گئی ہو۔ اس طرح 'لگ' بنا۔ اور چونکہ اردو کے قدیم میں 'گ' اور 'ک' میں املائی فرق کم کیا جاتا تھا لہذا ایک ہی حرف کہیں دو کشش کے ساتھ 'گ' اور کہیں ایک کشش کے ساتھ 'ک' لکھا ہوا ملتا ہے۔ مثلاً مخدوم سید محمد حسینی شہباز گیسو دراز کے "شکار نامہ" کا یہ جملہ:- "دیکھتے ہی لک واں یک محراب تھا۔" [۴۶] اسی طرح "معراج العاشقین" کا ایک جملہ ہے:- "جبرائیل لک اسے اپڑنا، اون پانچ خواص کوں یکجا میلانا۔" [۴۷] شیخ وجیہ الدین گجراتی کی کتاب "تاج الحقائق" کا ایک جملہ ہے:- "سمجتے سمجتے جو اس حد لک آتے ہیں۔" [۴۸]

---

[۴۶] مخدوم سید محمد حسینی شہباز گیسو دراز۔ شکار نامہ ص ۲۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۶۹ ۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

[۴۷] معراج العاشقین (منسوبہ بہ گیسو دراز) ص ۲۶۔ مرتبہ حسینی سروری۔ دکن دارالاشاعت کراچی سنہ ۱۹۶۱ء

[۴۸] شیخ وجیہ الدین گجراتی۔ تاج الحقائق ص ۳۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۷۱۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

جان ٹی پلیٹس نے "لگ" کا ارتقا اس طور پر دکھایا ہے :۔

'لگ' ہندی۔ लग ۔ پراکرت میں اس کی شکل یہ تھی: लग्गि یا लग्ग لگّ

سنسکرت लग्ने ۔لگنِ ۔(لگنا کی ظرفی حالت ہے)۔ مادہ लग् سے ۔اس کے معنے انہوں نے دوسرے معنوں

کے علاوہ قریب یا نزدیک (close to) لکھے ہیں ۴۹

مولوی عبدالحق نے "تک" کو ترتہا سے ماخوذ مانا ہے اور اس کی اصل "تری" کو قرار دیا ہے ۔

اس سلسلے میں پلیٹس کی تحقیق کے مطابق 'تری' ہندی لفظ ہے جو Postposition ہے اور 'تلا' اور 'تلے' کے

معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔(तरि تری) ۵۰

اس کے علاوہ پلیٹس نے ایک لفظ "ترتیو" तरत्य بھی لکھا ہے ۔ یہ سنسکرت لفظ بتایا ہے

اور لکھا ہے کہ یہ "تیرے" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۵۱ لہٰذا یہ 'تک' کا ماخذ کیسے ہو سکتا ہے؟

پلیٹس کی تحقیق سے ثابت ہے کہ "تری" اور "ترتیو" "تک" اور "تلک" کی اصل نہیں ہو سکتی کیونکہ

یہ 'تک' اور 'تلک' سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔

آر ایل ٹرنر نے "لگ" کی مختلف صورتیں یہ دی ہیں :۔

لگ ۔ لگیا ۔ لگنَ ۔ لگنِ ۵۲ اور اس کے معنے یہ لکھے ہیں ۔ Sticking to — Fixed on — Touching

یہ وہی "لگ" ہے جس کے استعمال کی مثالیں قدیم اردو نمونوں میں دستیاب ہیں ۔ لگنَ اور لگنِ میں الف

یائے مجہول کو اس لیے حذف کیا گیا ہے کہ سنسکرت املا میں بغیر الف اور یائے مجہول کے لکھا گیا ہے اور ابتدائی

ادب اردو کے نمونوں سے ثابت ہے کہ الف اور یائے مجہول کی جگہ حرکات مستعمل تھیں ۔ یہی سبب ہے کہ کسی

قدیم اردو نمونے میں 'لگ' اور 'تک' کے معنوں میں "لگنا" اور "لگنے" نہیں بلکہ ان معنوں میں "لگنَ" ملتا ہے ۔

---

۴۹ ۔ John T. Platts - A Dictionary of Urdu, Classical Hindi & English, P: 960

50 Ibid - P: 321

51 Ibid - P: 321

52 R. L. Turner - A Comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages. P: 630

یہ تمام امور ہمیں شوکت سبزواری کی تحقیق کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ انہوں نے جیسا کہ لکھا ہے کہ "لگ، تلگ، تک بلحاظ معنی اور اصلیت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان میں اصل اور بنیادی صلہ "لگ" ہے جو سنسکرت "لگن" سے ماخوذ ہے۔ "لگن" مادۂ "لگ" (چمٹنا) سے اسم مفعول ہے ...... پراکرت میں "ن" کے "گ" میں مدغم ہو جانے سے "لگّ" (بتشدید) بنا۔"[53-1]

اس میں شبہ نہیں کہ اصل اور بنیادی صلہ "لگ" ہے۔ کیونکہ لگن، لگنَ، لگنِ۔ لگوں۔ لگیا۔ لگے۔ لگت وغیرہ میں "لگ" مادہ ہے اور باقی اس کی متغیرہ شکلیں۔ اگر "لگن" سنسکرت ہے تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس کا استعمال ہندی اور پراکرتی زمانے سے قبل کسی دور میں رہا ہوگا اور اسی سے بعد میں پراکرت سے ہوتا ہوا ہندی اور اردو میں آگیا۔ ایسی صورت میں "لگن" کا استعمال قدیم ترین اردو کے دستیاب نمونے "کدم راؤ پدم راؤ" میں ملنا چاہئے تھا مگر نہیں ملا۔ اس میں اس استعمال کے بجائے "لگ" اور "لگوں" ملتا ہے اور اس کے بہت بعد کے دور میں "سب رس" میں "لگن" استعمال ہونے لگتا ہے اور اس کے قریبی زمانے کی بعض تخلیقات میں۔ اس کے بعد یہ غائب ہو جاتا ہے۔ جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "لگن" بعد کے زمانے کی پیداوار ہے یا پھر "کدم راؤ پدم راؤ" کے دورِ تصنیف کے تعین پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔[53-2]

شوکت صاحب نے "لگن" کو مادۂ "لگ" (چمٹنا) سے اسم مفعول مانا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر "لگ" کو مصدر "لگنا" (چمٹنا۔ چپک جانا۔ لگ جانا) کا مادہ مانا جائے اور "لگن" کو اسم مصدری کہا جائے تو کیا قباحت ہے۔ کیونکہ اردو قاعدے کے مطابق علامتِ مصدر گرا دینے سے مادہ حاصل ہوتا ہے "لگنا" سے علامتِ مصدر "نا" دور کر دیں تو "لگ" باقی رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں "گ" کو تشدید دینے کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ اس کی توجیہہ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ دکنی میں الفاظ کو مشدد کرکے

[53-1] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۱۲۱۔ دی اسٹی پریس ڈھاکہ۔ جولائی ۱۹۵۶ء

[53-2] کدم راؤ پدم راؤ کا زمانۂ تصنیف ۸۲۵ و ۸۳۹ ہجری ہے جب کہ "سب رس" ۱۰۴۵ھ کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔

ادا کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے لہٰذا انھوں نے اسے بہ تشدید ادا کیا ہوگا چنانچہ "لگّ" استعمال کیا، شمالی ہند
کی اردو میں مشدد کو مخفف کرنے اور سہل بنا لینے کا رجحان ہے لہٰذا "لگ" بلا تشدید استعمال ہوا ہوگا۔ اس
سلسلے میں دستیاب ادب کے نمونوں کی مثالیں پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ مزید برآں شوکت صاحب نے "لگ" میں
الف کے اضافے سے "لاگ" بنا کر اسے لگاؤ یا لگنے (چمٹ جانا یا چپک جانا، ٹنک) کے معنوں میں دیا ہے حالانکہ
یہ ایک مختلف لفظ ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ "لگ" (مادہ) سے لگاؤ (بہ اضافہ "اؤ") بن سکتا ہے اور یہ اپنے
انہی معنوں میں ہے یعنی نزدیکی و قربت اور لگنے کے مفہوم میں۔ اس قسم کی مثالیں اردو میں بہت مل جائیں گی
مثلاً سنانا مصدر ہے، مادہ "سن"؛ اس پر "اؤ" کے اضافے سے سناؤ۔ چنانچہ "لگ" سے لاگ نہیں البتہ "لگاؤ"
بنا قرینِ قیاس ہو سکتا ہے یہاں آر ایل ٹرنر کی رائے کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ٹرنر نے "لگ" کی
لغات لکھتے ہوئے جو لفظ لگنا "lagna" لکھا ہے یہ اردو "لگ" کا مصدر "لگنا" معلوم ہوتا ہے۔ پلیٹس
نے بھی "لگن" लग्न کا ذکر کیا ہے اور اسے "لگنا" کی ظرفی حالت بتایا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "لگ" دراصل "لگنا" سے نکلا ہے۔ اس پر سابقے کے طور پر
"جب"، "جھ" اور "تے" بڑھائے گئے تو جیلگ اور تیلگ بن گیا۔ "جب" اور "تب" کو لگایا گیا تو جب لگ اور تب لگ نہ
"گ" اور "ک" میں املائی فرق واضح نہ ہونے کی وجہ سے قدیم نمونوں میں کہیں "لک" (کاف کے ساتھ) اور
کہیں "لگ" (گاف کے ساتھ) لکھا ہوا ملتا ہے۔ دکنی میں چونکہ مشدد کرنے کا رجحان ہے لہٰذا اسی "لگ" کو بہ تشدید
"لگّ" ادا کیا گیا۔ اس پر "تے"، "تو" اور "تب" وغیرہ کے اضافے سے "تب لگ"، "تو لگ" اور "تلگ" وغیرہ بنا اور غالباً
"تلگ" بھی کاف کے ساتھ اور کہیں کاف کے ساتھ لکھا گیا یہی سبب ہے کہ ادب کے قدیم نمونوں میں "تلگ" اور
"تلک" کا استعمال پہلو بہ پہلو مل جاتا ہے۔ اسی کو بغیر لام کے "تک" ادا کیا گیا جو آج بھی اسی طرح مروج
مستعمل ہے زیادہ زور و اثر ظاہر کرنے کے لیے بہ اضافۂ لام "تلک" بولا جاتا ہے۔

شوکت صاحب کے نزدیک بھی "تلک" سے تخفیف پاکر "تک" بنا ہے (یعنی "تک"، "تلک" کا مخفف ہے)
البتہ کیلاگ اور پلیٹس کے نزدیک "تک" کی اصل سنسکرت "ٹنگن" ہے۔ جو قلب بعض کی وجہ سے "ٹنگھ" ہوا پھر واؤ
"ت" سے "ن"، "ل" سے اور "گ" "ک" سے بدل کر "تلک" بن گیا۔ لیکن ادب اردو کے نمونوں سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا۔

صحیح یہ ہے کہ تنگ اور تلک، تلگ اور لگ وغیرہ کی اصل "لگنا" مصدر ہی ہے۔ اس سلسلے میں شوکت سبزواری سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے تاکہ بات زیادہ واضح ہو جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قوسی اور غنہ کے اجتماع کی صورت میں اگر قوسی پہلے ہو اور غنہ بعد میں تو (اردو میں) غنہ گر جائے گا۔ مثال کے طور پر:۔

اردو	پراکرت	سنسکرت
آگ	اگّ	اگنِ
لاگ	لگّ	لگن

وہ مزید لکھتے ہیں کہ "اردو میں 'لاگ' کے معنے 'عداوت' کے ہیں۔ دوستی کے لیے 'لگن' ہے جو 'لاگ' کا ماخذ ہے لیکن اس میں 'گ' اور 'ن' ایک دوسرے سے الگ کر لیے گئے ہیں" ۵۴

اوپر سنسکرت کے لفظ "اگنِ" میں حرف اول متحرک اور مفتوح ہے 'گ' ساکن ہے اور 'ن' متحرک اور مکسور (زیر کے ساتھ)۔ اسی طرح "لگن" دراصل "لگنِ" ہے۔ پلیٹس نے بھی سنسکرت شکل लग्ने (لگنِ) لکھی ہے اور اسے "لگنا" کی ظرفی حالت لکھا ہے۔ ہندی تک پہنچتے ہوئے یہ "لگ" رہ گیا ۵۵ "لگنِ" جس کا املا اگر نون کے زیر کی جگہ یائے مجہول کے ساتھ کیا جائے تو "لگنے" ہوگی اور یہ بالکل اسی طرح ظرفی حالت کہی جا سکتی ہے جس طرح شوکت سبزواری صاحب نے "سہارے، کنارے" وغیرہ کو بھی ظرفی لکھا ہے ۵۶ اور یائے مجہول (ے) کو ظرفیت کی علامت لکھا ہے جو سنسکرت، پراکرت اور مغربی ہندی وغیرہ دور سے گزرتے ہوئے ہی باقی رہ گئی ۵۷

اس تمام بحث سے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "لگ" کی اصل "لگن" ہے اور یہ مصدر ہے۔

---

۵۴ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا۔ ص ۱۳۸ دی کی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

۵۵ پلیٹس A Dictionary of Urdu, Classical Hindi & English P. 960 -

۵۶ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل ص ۱۰۳-۱۰۱۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۲ء

۵۷ ایضاً ص ۱۰۲۔

اردو میں "لگن" کا املا ہم "لگنا" کرتے ہیں۔ اس سے علامتِ مصدر "نا" دور کر دیں تو صرف "لگ" رہ جاتا ہے جو امر واحد حاضر کا صیغہ ہے۔ اس میں تصریف سے دوسرے صیغے حاصل ہوتے ہیں۔ "لگنے" کو ظرفی کہا گیا ہے۔ یعنی یہ ایسی علامت ہے جو وقت و مقام کا تعین کرتی ہے۔ "لگ" میں یہ مفہوم موجود ہے۔ یہ وقت اور مقام کی حد کے تعین کے لیے آتا ہے مثلاً چار بجے تک (وقت کا تعین) یہاں سے کراچی تک (مقام کا تعین، فاصلے کا تعین) صبح سے شام تک۔ اس سے مجھ تک وغیرہ۔

اوپر قوسی اور غنہ کے اجتماع کے سلسلے میں شوکت سبزواری سے جو اقتباس نقل کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ پراکرتی دور میں الفاظ مشدد ہونے کا رجحان آ گیا۔ چنانچہ سنسکرت "اگن" پراکرت میں "اگّ" ہو گیا اور سنسکرت "لگن" پراکرت میں تشدید کے ساتھ "لگّ" بن گیا۔ دکنی میں الفاظ کو مشدد کرنے کا رجحان غالباً اسی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح یہ الجھن خود بخود دور ہو جاتی ہے کہ "لگّ" پر تشدید کہاں سے آئی اور کیوں؟ شمالی ہند کی اردو میں یہ تشدید دیکھنے میں نہیں آتی۔

سنسکرت "لگن" جب پراکرتی دور میں داخل ہوا تو "لگّ" ہو گیا، جب اسے مؤرّد کر لیا گیا تو تشدید ختم ہو گئی۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ "لگن" قدیم شعری تصنیف "کدم راؤ پدم راؤ" میں نہیں ملتا اور اس کے بہت بعد یعنی ۱۰۴۵ ہجری میں وجہی کی "سب رس" میں مل جاتا ہے، حالانکہ خود وجہی نے ۱۰۱۸ ہجری میں (یعنی سب رس سے بہت پہلے) مثنوی "قطب مشتری" لکھی لیکن اس میں "لگن" کا استعمال نہیں ملتا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ بول چال کی زبان میں رہا ہوگا اور نثر چونکہ بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہوتی ہے لہٰذا نثر میں آ گیا۔ عین ممکن ہے کہ اگر "کدم راؤ پدم راؤ" کے زمانے کی مستقل نثری تصانیف دستیاب ہو جائیں تو ان میں "لگن" کا استعمال مل جائے۔ "سب رس" میں استعمال میں آنے کے بعد چند شعرا نے بھی اس لغت کو استعمال کیا ہے ان میں لفرتی اور شاہی شامل ہیں مگر بعد کو اسے متروک کر دیا گیا۔ لگ، لک، تلگ اور تلک ابتدا ہی سے پہلو بہ پہلو استعمال ہوتے رہے اور اب "تک" اور "تلک" کی صورت میں استعمال ہو رہے ہیں۔ شمالی ہند میں "لگن" کا استعمال بالکل نہیں ملتا البتہ کچھ عرصے کے لیے وہاں "تلک" کے علاوہ صرف "لگ" دیکھنے میں آتا ہے مگر پھر متروک ہو جاتا ہے اور صرف تک اور تلک کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

ظرفی "پر" کا استعمال

ظرفیت کے اظہار کے لیے "میں"، "اور" "پر" وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ "میں" کے تغیرات علیحدہ
زیر بحث لائے گئے ہیں یہاں صرف "پر" کا تاریخی حیثیت کے ساتھ مطالعہ مقصود ہے۔
اردو میں "پر" کے ساتھ "پہ" بھی مستعمل ہے اور کہیں "اوپر" بھی بولا جاتا ہے۔ دستیاب
اردو ادب میں کیا صورت رہی اس کا مطالعہ درج ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" (۸۲۵ و ۸۳۹ھ)
کا مصرع ہے:

چمکن لگے جب کنک بہت پر ؎۱

میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ) کے یہاں سے استعمال دیکھیے:۔

ع روکھی سوکھی اوپر ہوتی کہاں بڑائی مان ؎۲

شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲ھ) کا مصرع ہے:۔

صوفی ان پر تھکے۔ ؎۳

شاہ علی محمد جیوگام دھنی کا بھی ایک مصرع یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

سیوں حاجی ہوں کعبہ آیوں آپیں آپیں اوپر واروں ؎۴

شاہ برہان الدین جانم (م ۹۹۰ھ)، میراں جی شمس العشاق بیجاپوری کے فرزند ہیں ان کا ایک
مصرع یہاں درج ہے:۔

صورت پر اعتبار نہ راکھیں جیسے ہیں حیوان ؎۵

؎۱ فخر دین نظامی دکنی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۷۳ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۷۳ء

؎۲ مولوی عبدالحق۔ اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵۲۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت چہارم سنہ ۱۹۷۷ء

؎۳ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۲۷۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

؎۴ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۱ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

؎۵ ایضاً ص ۵۱۔

شاہ برہان الدین جانم کا ایک رسالہ "کلمۃ الحقائق" نثر میں ہے جس کا ایک جملہ حسبِ ذیل ہے :-

جس پر کرم خدا کا ہوئے ؎۶

شیخ خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کے یہاں بھی "پر" دیکھنے میں آتا ہے مثلاً ع پر ماضی پر محبت لیل ؎۷

قلی قطب شاہ کا ایک مصرع ہے :-

سو جارے کر اسمان پر پر اک بھی تارا ہے ؎۸

حسن شوقی کے یہاں "اپر" استعمال ہوا ہے جیسے ان کا یہ مصرع :-

نظر شاہ کا اُس اُپر جیوں پڑی ؎۹

ملا وجہی نے بھی "اپر" اور "اُپر" استعمال کیا ہے۔ دو مصرعے دیکھیے :-

۱۔ جیسی حکمتاں ہوئے عیاں اُس اُپر

۲۔ کمل پر توں بھونرے کوں لبدا ٹیا ؎۱۰

ان کی نثری تصنیف "سب رس" کا جملہ ہے :-

وہم کی باتاں کا اس پر اثر چڑیا ؎۱۱

سید میراں حسینی (م ۱۰۷۹ھ) گولکنڈہ کے صالحین سے ہیں اور عبداللہ قطب شاہ کے معاصر۔ ان کا ایک شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

کروں ناز اسی قدرت پاک پر + شرف دی سیہ خاک کوں سر بسر ؎۱۲

؎۶ مولوی عبدالحق۔ اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص۵۹۔ بحوالہ شاہ برہان الدین جانم۔ کلمۃ الحقائق۔

؎۷ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ ص۲۲۶ (بحوالہ شیخ خوب محمد چشتی) اشرف پریس لاہور۔ ۱۹۷۲ء

؎۸ قلی قطب شاہ۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ، مرتبہ محی الدین زور۔ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء

؎۹ حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول ۱۹۷۱ء

؎۱۰ ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص۳ / ؎۱۱ ملا وجہی۔ سب رس ص۱۵۱۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۴ء

؎۱۲ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص۶۶۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ ۱۹۳۰ء

ملا قطبی بھی سلطان عبداللہ شاہ کے معاصر ہیں۔ ۱۰۴۵ھ ہجری میں انہوں نے شیخ یوسف دہلوی کی تصنیف "تحفۃ النصائح" کا دکنی میں ترجمہ کیا۔ ان کے یہاں بھی "ہور" دیکھنے میں آتا ہے مثلاً :-

ہجرت تھے دس سو سال ہور + چالیس پر بھی پانچ اتھے ۱۳

کمال خان رستمی بیجاپوری نے فارسی "خاور نامہ" کا دکنی ترجمہ ۱۰۵۹ھ میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس سے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیے :-

۱۔ اوہیر جائے کر دیکھ افلاک کوں

۲۔ در معرفت تجھ اُپر باز ہے

۳۔ سپاہ ملک گیری او نجائی ہیر ۱۴

ان کے یہاں اوپر، اُپر اور پر کے علاوہ ایک لفظ "اُپرال" دیکھنے میں آئی جو اور کسی کے یہاں نظر سے نہیں گزری۔ مثلاً رستمی کا یہ مصرع دیکھیے :-

گیا مارتی اُپرال او شست کمند ۱۵

البتہ نصرتی کے یہاں "بھیتر" کی ایک صورت "بھتراں" بروزن "اپراں" ضرور دیکھنے میں آتی ہے۔

ملا غواصی گولکنڈہ کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے انہوں نے ملا ضیاء الدین نخشبی کے فارسی "طوطی نامہ" کا ترجمہ کیا جو ۱۰۴۹ ہجری کو اختتام پذیر ہوا۔ اس کا ایک شعر یہ بھی ہے :-

برس ایک ہزار ہور چالیس یو کو لو

ہوئے تھے یو موتیاں پورویا ہوں تو ۱۶

---

۱۳ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۶۹ (بحوالہ ملا قطبی)۔ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء۔

۱۴ کمال خان رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ۔ ص ۳۱-۲ ص ۸ ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

۱۵ ایضاً ص ۳۱۔

۱۶ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۹۹۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

گویا میراں کی ایک لغت 'پر' بھی تھی مگر اس کا استعمال عام نہیں رہا۔ کسی کے یہاں دیکھنے میں آ یا۔

ابنِ نشاطی بھی گولکنڈہ کا باشندہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے فارسی کتاب "بساتین" کا منظوم ترجمہ "پھولبن" کے نام سے مثنوی کی صورت میں کیا۔ میجر اسٹوارٹ نے اس کا سنِ تصنیف ۱۰۵۹ھ بیان کیا ہے۔ کتب خانہ انڈیا آفس کے نسخے سے ۱۰۶۶ ہجری میں تصنیف ہونا ظاہر ہوتا ہے لیکن کتب خانۂ آصفیہ میں جو نسخہ موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۰۷۶ ہجری میں تمام ہوئی۔ اس مثنوی کا ایک شعر یہاں نقل ہے:۔

اتھا تاریخ لیا نوں یہ گلزار

اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پر چار ۱۷؎

ملک الشعرا ملا نصرتی (م ۱۰۸۳ھ) کا ایک مصرع ہے:۔

تلنگ شاہِ صاحبقران تخت پر ۱۸؎

اس کے ساتھ ساتھ 'پہ' کا استعمال بھی ملتا ہے مثلاً ان کا یہ مصرع:۔

بڑھا رہے ہیں ہمنا پہ یوں لکھ قیاس

قاضی محمود بحری اور ولی ہم عصر ہیں۔ دونوں کے یہاں 'پر' اور 'پہ' کا استعمال پہلو بہ پہلو ہوا ہے مثلاً بحری کے یہ مصرعے:۔

۱۔ پاؤں رکھیا جل کے سر اوپر کتھا ل

۲۔ یاں الوالارواح کے سر پر ہے کام

۳۔ سر پہ رکھیا افسرِ شاہی اسے ۱۹؎

۱۷؎ شمس اللہ قادری ۔ اردوئے قدیم ص ۱۰۵ ۔ نولکشور پریس لکھنؤ ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۱۸؎ نصرتی ۔ دیوانِ نصرتی ۔ مرتبہ جمیل جالبی ۔ مطبعِ توسین لاہور ۔ اشاعتِ اول ۱۹۷۲ء

۱۹؎ قاضی محمود بحری ۔ کلیاتِ بحری ص ۲۷۵، ص ۲۶۵، مع مقدمہ و تشریح، مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حنیظ، مطبع نولکشور لکھنؤ

ولی کے دو مصرعے دیکھیے :-

۱۔ جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رکھ لال

۲۔ تب سوں انگاروں پہ لوٹے ہے ولی ۲۰ے

دکنی و گجراتی شعرا کے اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ عام طور پر "اُپر"، "او پر"، "پر" اور "پہ" استعمال ہوئے ہیں البتہ دو ایک شعرا کے یہاں ایک دو دوسری لغات بھی دیکھنے میں آئیں مثال کے طور پر غواصی کے یہاں "پو" اور کمال خاں رستمی کے یہاں "اُپرال" استعمال ہوا ہے۔ اب شمالی ہند کو لیجیے۔

شمالی ہند میں امیر خسرو (۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) کے یہاں عام طور پر "پر"، "پہ" استعمال ہوا ہے۔ چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

۱۔ گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس

۲۔ تم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر ۲۱ے

۳۔ ایک تھال موتی سے بھرا سب کے سر پر اوندھا دھرا ۲۲ے

فائز دہلوی کے یہاں "پر" اور "پہ" استعمال ہوئے ہیں۔ دو مصرعے دیکھیے :-

۱۔ جیو بلبل کا تجھ قدم پہ نثار

۲۔ جس کی نظر اے یار پڑے تیری حنا پر۔ ۲۳ے

اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں میں "اوپر" اور "پر" کا استعمال ملتا ہے ملاحظہ ہو :-

۱۔ پہرایا پیراہن سفید تن اوپر

۲۔ ہوئی سب خوش وقت اوس وقت پر ۲۴ے

۲۰ے ولی - کلیاتِ ولی ص۱ مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی - مطبوعہ انجمن پریس کراچی - اشاعتِ دوم سنہ ۱۹۵۴ء

۲۱ے حافظ محمود شیرانی - پنجاب میں اردو ص۱۲۸ - اشرف پریس لاہور اشاعتِ چہارم سنہ ۱۹۷۲ء

۲۲ے شوکت سبزواری - داستانِ زبانِ اردو ص۲۰۵ - انجمن پریس کراچی - سنہ ۱۹۶۰ء

۲۳ے فائز دہلوی - دیوانِ فائز - ص۱۷۸-۱۷۹، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب - عمدہ پریس دہلی سنہ ۱۹۴۶ء

۲۴ے اسمٰعیل امروہوی - اردو کی دو قدیم مثنویاں - مرتبہ نائب حسین نقوی - نقوش پریس لاہور - اشاعتِ اول ۱۹۶۹

تاباںؔ (م ۱۱۶۱ یا ۱۱۶۵ھ) کے دو شعر دیکھیے :-

۱۔ تو مجھ کو سعادت سے سایہ نہ کر ٭ ہما شیر اقبال اڑ جائے گا

۲۔ ۲۵

دردؔ کے بجائے اثرؔ نے پر اور پہ کے علاوہ "پو" بھی استعمال کیا ہے مثالیں ملاحظہ ہوں :-

۱۔ در و دیوار پو پر اک طرف سے

۲۔ یہ خاک نشیں تیرے سر راہ پہ جو بیٹھا

۳۔ یہاں تک ہے رے سپر شری پر ہائے موثر ۲۶

نثر میں فضلیؔ کی کربل کتھا سے نمونے دیکھیے :-

جملہ ۱ :- اگر دروازہ اس پر موندیں۔

۲ :- اوس پہ جو رووے دل کی رقت سوں۔ ۲۷

حاتمؔ (م ۱۱۹۷ھ) کے یہاں اوپر، پراور پہ تینوں استعمال ہوئے ہیں۔ چند مصرعے دیکھیے :-

۱۔ خط پشت لب اوپر سورۂ والشمس کی اسناد ہے

۲۔ نہ پھول اب اس قدر بلبل گلوں کی آشنائی پر ۲۸

سوداؔ کا مصرعہ ہے :-

وقتِ اخیر سوداؔ بالیں پہ اس کے رو رو ۲۹

---

۲۵ تاباںؔ - دیوانِ تاباںؔ - ص ۱۹-۲۱ مرتبہ مولوی عبدالحق - انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء

۲۶ اثرؔ - دیوانِ اثرؔ - ص ۱۲ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقیٔ اردو انڈیا۔

۲۷ فضل علی فضلیؔ - کربل کتھا ص ۱۵-۶۶ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دلی۔ اشاعتِ اول ۱۹۶۵ء

۲۸ حاتمؔ - شاہ حاتمؔ، حالات و کلام - مرتبہ غلام حسین ذوالفقار - جدید اردو ٹائپ پریس لاہور ۱۹۶۴ء

۲۹ سوداؔ - کلیاتِ سودا (جلد اول) ص ۲۲۶ مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔

میرؔ کے ہی دو مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔

۲۔ کل پاؤں ایک کاسۂ سر پہ جو آگیا ۳۰

سوائے میرؔ کے، تقریباً تمام شعراء کے یہاں 'پر' یا 'پہ'، ملتا ہے۔ گو یا شمالی ہند میں یہ استعمال نثر و نظم دونوں میں اسی طرح پر تھا۔

ہریانوی شاعر محبوب عالم عرف شیخ جیون ۳۱ کے یہاں بھی یہ استعمال دیکھئے۔ ایک مصرع ہے:۔

پڑا عاقبت خاک پر تاک سے ۳۲

جارج گرائرسن نے مغربی ہندی کی زبانوں میں 'پر' کے لغات کی نشاندہی اس طور پر کی ہے:۔

۱۔ دکنی میں:۔ پو۔ پہ۔ پر

۲۔ برج بھاشا:۔ پے یا پہ (Pai)۔

۳۔ قنوجی میں:۔ پر

۴۔ ہندوستانی:۔ پر ۳۳

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً اردو (کھڑی، ہندوی، ہندوستانی) کی اپنی لغت 'پر' ہے۔ اور پر، پہ اور پہ ایک ہی اصل کی متغیرہ شکلیں معلوم ہوتی ہیں۔ 'پر' کے بجائے 'پہ' اور 'پر' عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اب بھی کر لیا جاتا ہے۔ انشاؔ کے نزدیک یہ صحیح نہیں وہ کہتے ہیں:۔

"بعض فصحا اس پر الف اور واؤ بڑھا کر اوپر بولتے ہیں

ان کی گردن پر فصاحت کا خون ثابت ہے"۔ ۳۴

۳۰۔ میر تقی میرؔ۔ کلیاتِ میرؔ حصہ ۲، ص ۲۔ بترتیبِ جدید مع مقدمہ و فرہنگ۔ باہتمام کیسری داس مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۱ء

۳۱۔ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۲۵۱۔ شیخ جیون گیارھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ سید میراں بھیکہ چشتی صابری (م ۱۱۳۱ھ) کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حالاتِ زندگی پوری طرح معلوم نہیں۔

۳۲۔ ایضاً ص ۲۵۲۔

۳۳۔ George Grierson. Linguistic Survey of India. Vol IX Ps: 60-80-85-57 Calcatta Government Printing India - 1916

۳۴۔ شوکت سبزواری۔ داستانِ زبانِ اردو ص ۱۵۶، بحوالہ انشاؔ۔ ترجمہ دریائے لطافت ص ۳۲۹۔

ماخذ کی بحث

"پر" کے ماخذ کا جہاں تک تعلق ہے اس سلسلے میں ماہرینِ لسانیات نے اختلافی آرا کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ہورنلے "پر" کا ماخذ "پرے" کو ٹھہراتے ہیں۔ جو سنسکرت میں "پرے" اور اپ بھرنش "پرِ" تھا[۳۵] اول تو یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ جس ماخذ سے کوئی لغت مشتق ہو، ارتقائی مدارج طے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اصل شکل کھو دیتی ہے اور نئی شکل میں نمودار ہوتی ہے جب کہ "پرے" اب بھی اپنی اسی شکل میں موجود و مستعمل ہے۔ نیز یہ کہ "پرے" دور کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی فاصلے کا اظہار کرتا ہے اس اعتبار سے اسے ظرفی کہہ سکتے ہیں لیکن ظرفی لاحقے "پر" سے اس کا سلسلہ نہیں جوڑ سکتے۔ کیونکہ ظرفی "پر" کسی شے یا چیز کی اوپری سطح کا مفہوم ادا کرتا ہے مثلاً چھت پر (اوپری سطح کا مفہوم موجود ہے) گھوڑے پر، آسمان پر، زمین پر۔ لیکن "پرے" میں اوپری سطح کا مفہوم نہیں فاصلے کا مفہوم ہے۔ شوکت سبزواری کے نزدیک یہ اشتقاق صحیح نہیں وہ کہتے ہیں :۔

> "پرے اردو میں ہے لیکن 'پر' یا 'اوپر' کے بجائے دوسری طرف یا دور کے مفہوم میں۔ جیسے پرے ہٹو۔ پرے رہو۔ اس کی اصل سنسکرت 'پرے' اور پراکرت 'پرے' ہے۔ 'پر' اور 'پرے' اردو میں جدا جدا لفظ ہیں جن کے ماخذ بھی جدا ہیں"[۳۶]

بھنڈارکر کا خیال ہے کہ 'پہ' (پہ یا پے) کی اصل سنسکرت پارشو ہے اور اس کے تغیرات یہ ہیں :۔

پارشو ۔ پاس ۔ پاہ ۔ پہ[۳۷]

---

[۳۵] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۹ بحوالہ ہورنلے ۔ گوڑین گرامر ۔ پارہ ۳۷۸

[۳۶] ایضاً ۲۳۹

[۳۷] ایضاً ص ۲۳۹ بحوالہ بھنڈارکر ۔ لیکچرز ص ۲۶۱

اگر بھنڈارکر کے کہنے کے مطابق پہ (پہ یا پے) کی اصل سنسکرت پارشو۔ پاس۔ پاہ اور لپہ ہے تو اس صورت میں ہمیں 'ہیر' کی مترادفات کے بارے میں سوچنا پڑے گا کہ انہیں کس سے ماخوذ مانا جائے۔ نیز یہ کہ آیا وہ سب اُہیر، اوہیر، ہیر، پہ، پے کسی ایک اصل کی شاخیں ہیں یا مختلف ماخذ سے مشتق ہیں۔ دوسرے یہ کہ بھنڈارکر نے جو تغیرات دکھائے ہیں ان میں سے کوئی ادبِ اردو کے قدیم نمونوں میں مستعمل نہیں رہا گو یا لسانی شواہد سے یہ ثابت نہیں کہ یہ لغات یا ان میں سے کوئی ان معنوں میں (اوہیر یا ہیر کے معنوں میں) استعمال ہوئی ہو۔ آر ایل ٹرنر نے یہ لفظ اپنی تقابلی لغت میں نہیں دیا ہے۔ جان ٹی پلیٹس نے البتہ اس کا ذکر کیا ہے لیکن 'ہیر' سے مختلف معنوں میں۔ پلیٹس نے 'پارشو' کے معنے "Iron" اور "[illegible]" "Mixed caste" لکھے ہیں ^۳۸^ اس اعتبار سے 'ہیر' اور 'پہ' کا 'پارشو' سے دور کا بھی واسطہ معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے مقابلے میں ہری اودھ اور کیلاگ کی رائے زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ان دونوں لسانیین کے نزدیک 'ہیر' سنسکرت उपरि (اُپری) سے منحوث ہے۔ ^۳۹^ اوپر اور اُپر اردو میں بھی ہے جیسے کوٹھے کے اوپر۔ اوپر ہی بات۔ اوپر ہی اوپر۔ 'پہ' اس کا مخفف ہے ^۴۰^ ادب اردو کے قدیم نمونے اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔

آر ایل ٹرنر نے بھی اپنی تقابلی لغت میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ 'ہیر' ہندی لفظ ہے اور سنسکرت میں یہ उपरि (اُپری) تھا ^۴۱^ شوکت سبزواری اور مولوی عبدالحق نے اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ 'ہیر' سنسکرت "اُپری" سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق اپنی قواعدِ اردو

---

۳۸ John. T. Platts. A Dictionary of Urdu, Classical Hindi & English.

۳۹ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۹ بحوالہ ہری اودھ "ہندی بھاشا" ص ۸۵، کیلاگ ص ۱۳۳

۴۰ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۳۹۔ داس گپتا پریس ڈھاکہ۔ اشاعت اول ۱۹۵۶ء

41 R. L. Turner. A Comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages. P:104

ص ۱۰
پر

میں لکھتے ہیں "پر سنسکرت کے "اُپری" سے ہے"۔ ۲؎ "اُپری" کی 'ی' تخفیف و تسہیل کی نذر ہوئی تو "اُپر" باقی رہا۔ دستیاب ادب کے قدیم نمونوں میں "اُپر" کا استعمال ہوا ہے۔ "اُپر" میں الف کا پیش اشباع کی نذر ہوا تو 'و' بن گیا، اور 'اوپر' وجود میں آیا۔ بعض جگہ حرفِ اول یعنی الف کو گرا کر صرف 'پر' استعمال کیا گیا۔ 'پر' کا 'ر'، 'واؤ' سے بدلا جیسا کہ بعض مقامات پر دیکھنے میں آتا ہے اور حرکت سبزواری کی مثال کے مطابق مثلاً پران سے پوان) تو 'پو' ہوا۔ اردو کے قدیم نمونوں میں کہیں کہیں اس کا استعمال ملتا ہے مگر کثرت سے نہیں۔ 'و' 'ہ' سے بدلا تو 'پہ' ہو گیا۔ اس طرح یہ ایک ہی لفظ تھوڑے فرق کے ساتھ پہلو بہ پہلو استعمال ہوتا رہا۔ ان سب کا ماخذ ایک ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے سنسکرت کا उपरि اُپری۔

۲؎ مولوی عبدالحق۔ قواعد اردو ص ۱۲۶۔ جی ایف ہیر پریس لاہور۔

حروفِ اضافت

اردو میں حروفِ اضافت کا، کے اور کی ہیں۔ اس مطالعے سے یہ جائزہ لینا مقصود ہے کہ آج یہ حروف جس صورت میں ہمارے سامنے ہیں کیا ابتدا ہی سے اسی صورت میں مستعمل ہیں یا ان میں وقتاً فوقتاً کسی قسم کے تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو کی قدیم ترین مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کو لیں تو درج ذیل لغات سامنے آتی ہیں:

۱- مچھندر کیرا پوت آکھو رنات

۲- کھوڑا کیری چال چھیلی نہ جائے

۳- ہمیں کیا جو اس کا نہ پیویں نہ کھائیں

۴- نہ ہر ہے نہ کر جب بن اس کے سروپ [۱]

واضح ہوا کہ کا، کے وغیرہ اس وقت بھی اسی موجودہ صورت میں مستعمل تھے البتہ ان کے ساتھ دوسری لغات 'کیرا' اور 'کیری' بھی موجود تھیں۔

شاہ میرانجی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ) کے یہاں کا، کے اور کی کے علاوہ دوسری لغات بھی استعمال ہوئی ہیں مثلاً یہ مصرعے:-

۱- بگ دیکھے تو ان کیرے

۲- رزاق سبھوں کیرا [۲]

حسن شوقی، قلی قطب شاہ کا معاصر ہے۔ اس کے یہاں ان لغات کا استعمال ملاحظہ ہو:-

۱- وہ حکمت کیرا مالک ہے روم شام

۲- گھر بار لکھنے کتک کیر ناؤں

۳- سو آفت کیری باد ایسی اوڑی [۳]

---

[۱] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۳ء

[۲] مولوی عبدالحق۔ اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۸۹ ع سب پیروں کیری کان ایضاً ص ۹۰ کا، کے اور کی بھی ان کے یہاں استعمال ہوا ہے مثلاً ع اس کا نجر دریا۔ ایضاً ص ۹۰۔ ع اسی کی باس ایم کو باسا پھول پھوکٹ لی آنی۔ ایضاً ص ۹۰

[۳] حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ اول سنہ ۱۹۷۱ء

حسن شوقی کے یہاں اسی کے پہلو بہ پہلو، کا، کے اور کی بھی استعمال ہوئے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے :۔

۱۔ الہی کرم کا کرن ہار توں

۲۔ خدا کی صفت کوں نہ کچھ انت پار

۳۔ جن یا جوج و ماجوج کے باند یا ہے حد [4]

شاہ برہان الدین جانم (شمس العشاق بیجاپوری کے فرزند) کے چند مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ عشق کے آنکھیں کیا ہے نام

۲۔ سادھو کا انت سادھو جانے دوجے کوں نہیں چین

۳۔ جگ کی ہانسی کیا مجھو ہوئے [5]

ان کا ایک رسالہ نثر میں "کلمۃ الحقایق" ہے۔ اس کے چند جملے دیکھیے :۔

۱۔ اللہ کرے سو ہوئے کہ قادر تو اتنا سوے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرنہار۔

۲۔ ایسا حال سمجھنا خدا اتی خدا کوں جس پر کرم خدا کا ہوئے۔

۳۔ اے عارف ظاہر تن کے منلی سوں گزریا۔ [6]

شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجراتی (م ۹۷۳ھ) سے مثالیں دیکھیے :۔

۱۔ جنوں من پرم کا بھٹا + تنلیں تل ینہہ کا کھٹا

سو جانے مرم کا لٹا

۲۔ پیئے جس ینہہ کی آٹا۔

۳۔ بھیس بندوں کے کر سو بنگ او بھا پر ہو نا ز گزاروں [7]

---

[4] حسن شوقی - دیوان حسن شوقی - مرتبہ جمیل جالبی - انجمن پریس کراچی - اشاعت اول ۱۹۷۱ء

[5] مولوی عبدالحق - اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۵۸-۵۷ انجمن پریس کراچی - ۱۹۵۳ء

[6] ایضاً ص ۶۱ -

[7] ایضاً - ص ۷۱ -

ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" میں کا، کے اور کی کے پہلو بہ پہلو کیرا، کیرے اور کیری بھی استعمال ہوا ہے۔ کا، کے، کی وغیرہ کی مثالیں دیکھیے:۔

۱- عمل کا تو نیں کچ کچہ میرے پاس

۲- ولے تیری بخشش کی ہے بھوت آس

۳- رہیا ایں توں آدم کے دل تنگ میں ۸ے

اسی مثنوی کے چند مصرعے مزید برائے ملاحظہ ہوں:۔

۱- عجب تیری قدرت کیرے کام ہے

۲- محبت کیرا مے جو پیتا اہے

۳، سلامت نہیں جب کیری بات میں ۹ے

شیخ خوب محمد چشتی گجراتی (م ۱۰۲۳ھ) سے بھی چند مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں:۔

۱- دھیان خدا کا ذکر دجو چھوڑے اسے کہیں جگ مانہہ

۲- حمد خدا کی خوب کر کہ صلواۃ رسول

۳- بعاؤ بعید کے سعر کے خوب جو بجھ آپ آتن ۱۰ے

ملا وجہی کی "سب رس" (تصنیف ۱۰۴۵ھ) میں یہ استعمال دیکھیے:۔

۱- ھنا ہماری نہایت کی معلوم نیں ہوتی خبر، اس کے نہایت کی کسے خبر۔

۲- الو کا عشق فاش ہوا تو یو حکایتاں چلیاں آجنوں ۱۱ے

۸ے ملا وجہی۔ قطب مشتری (تصنیف ۱۰۱۸ھ) ص۵ تا ۴، مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ اشاعت دوم سنہ ۱۹۵۳ء

۹ے ایضاً ص۱۲ ق ۶ تا ۳۔

۱۰ے مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص۲۳۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت چہارم سنہ ۱۹۷۷ء

۱۱ے ملا وجہی۔ سب رس ص۲۲ تا ۳۶۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۷ء

بحری، ولی کے معاصر ہیں ان کے یہاں یہ استعمال ملاحظہ ہو:۔

ع ۱۔ شاہاں جگ کے غزار سو لہے اس کا نشان تل

۲۔ تن دوست کی خبر اس دوست سوں نہ پوچھ اے دوست

۳۔ تلاواں کوں دیا روپ کیرا رنگ ۱۷

ولی کے بھی چند مصرعے یہاں نقل ہیں:۔

۱۔ تجھ سحر کی روالی سینا جب سوں اے ولی

۲۔ نم ناک ہے تدھی ستی دامن سحاب کا

۳۔ کہ یہ تحفہ ہے سالک کوں بزرگ حق کے لجانے کا ۱۸

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ دکنی و گجراتی اردو میں حروفِ اضافت کا، کے اور کی کے ساتھ کیرا، کیرے اور کیری کا استعمال بھی ملتا ہے لیکن نسبتاً کم۔ پھر یہ بتدریج متروک ہوتا جاتا ہے اور ولی کے دور تک آتے آتے تقریباً ختم ہو جاتا ہے صرف کا، کے اور کی کا استعمال برقرار رہتا ہے۔ اب شمالی ہند کو لیجیے۔

شمالی ہند میں اسمٰعیل امروہوی سے لے کر فائز، فغاں، تاباں، حاتم، درد، میر و سودا سبھی کے یہاں صرف کا، کے اور کی استعمال ہوا ہے۔ امیر خسرو کے یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اسمٰعیل امروہوی اور فغاں کے یہاں دکنی اثرات بعض مقامات پر واضح ہیں لیکن کا، کے اور کی کے ساتھ کیرا، کیرے اور کیری کا استعمال ان کے یہاں بھی نہیں ملا۔ البتہ لسانی شواہد سے ثابت ہے کہ 'کا' بھی 'کیرا' کی طرح قدیم ہے۔ کیونکہ دستیاب ادب میں دونوں کا استعمال پہلو بہ پہلو ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے شیخ فرید شکر گنج کا ایک قول نقل کیا ہے اس میں بھی 'کا' کا استعمال موجود ہے قول یہ ہے:۔ پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے ۱۹

---

۱۷ بحری۔ کلیاتِ بحری۔ ص ۱۳۰ تا ۲۵۸۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حنیف۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

۱۸ ولی۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ سوم سنہ ۱۹۵۴ء

۱۹ مولوی عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۱ انجمن پریس کراچی۔ اشاعتِ چہارم سنہ ۱۹۷۷ء

شیخ فرید شکر گنج کی ولادت ۵۶۹ھ اور وفات ۶۶۴ھ میں لکھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "کا" کا وجود بہت پہلے سے رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ شیخ فرید شکر گنج کا یہ قول بھی ملاحظہ ہو:۔

اسا کیری کہی سوریت ۔ جاؤں نائے کہ جاؤں مسیت [20]

گویا کا، کی، اور کیرا، کیری دونوں پہلو بہ پہلو استعمال ہوتے آئے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کا، کے، کی اور کیرا، کیرے، کیری میں سے کس کا استعمال زیادہ قدیم ہے۔ دستیاب ادب اردو کے نمونوں سے صرف اس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ کا، کے، کی اور کیرا، کیرے، کیری، دونوں ساتھ ساتھ استعمال ہوتے آ رہے ہیں، پھر کیرا، کیرے اور کیری کا استعمال کم ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتا ہے اور صرف کا، کے، کی برقرار رہتا ہے اور آج تک یہ استعمال موجود ہے۔ جس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا تو کیرا، کیری، کیرے، کسی قریبی زبان سے اردو میں آ گئے اور پھر غیر اردو ہونے کے باعث رفتہ رفتہ متروک ہو گئے یا پھر اول اول یہی استعمال ہوتے ہوں گے بعد میں اردو کے رجحانِ تسہیل و اختصار نے اسے مختصر کر کے اپنا لیا۔ ماخذ کی بحث اس امر کو واضح کرے گی۔

ماخذ کی بحث

اکثر علمائے لسانیات کا خیال ہے کہ پراکرت میں "کیرکم" اور "کیرے و" بطور لاحقۂ اضافت اکثر استعمال ہوتے ہیں اور اردو "کا" کی طرح تذکیر و تانیث کے اعتبار سے ان میں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں۔ "کیرے و" کا مونث "کیرے ا" تھا جو "کیرکا" سے بنا تھا۔ یہ "کرپور منجری" میں ہے [21] ماگدھی میں یہ "کیلکے" ہے [22] "کیرے و" سے "کیرو" اور "کیرے ا" سے "کیری" وجود میں آئے۔ یہ روپ چند بردائی کے "راسو" میں ہے مثلاً:۔

۱۔ دورے گیج اندہ چوھان کیرو ۔ (چوہان کے ہاتھی اندھے بن کر دوڑے)

---

[20] مولوی عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۱ ۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۶۸ء

[21] شوکت سبزواری ۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۲۱ ۔ بحوالہ وولنر ۔ مبادیاتِ پراکرت ص ۱۱۵۔

[22] ایضاً ص ۲۲۱۔

٢- عبدی درشٹی سوں درشٹی جیہاں کیری (جہاں کی نظر اس منظر کو دیکھ کر جاتی رہی) ٢٣

تلسی داس کے یہاں "کر" اور "کرِ" استعمال ہوئے ہیں۔ شوکت صاحب کے خیال میں یہ بھی "کیر" اور "کیری" سے وجود میں آئے ہیں۔ ان کا آخری روپ "کے" ہے جو جائسی کے یہاں ہے جیسے :-

دھن پتی اُٹھے جے دھک سنسارا (دھن والا وہ ہے جس کا سنسار ہے)۔

اس لاحقے کے مختلف سلسلے وار تغیرات یہ بتائے ہیں :-

کیرکو - کیرشو - کیرو - کیر - کر - کے - کا ٢٤

چند بردائی کے "راسو" کا جہاں تک سوال ہے اس میں کا، کے اور کی، بھی استعمال ہوئے ہیں چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :-

١- سا برسوں کا جیونا + تھوڑا ئی ہے بھلاؤں

٢- لو اجن گدار دیتی بنگ جتن + گئے دلیو ہندوؤں کے بھی تبّن

٣- اجمیر ہیر نم پر گڈ ہو + کنگ دیس کے انترے ٢٥

پرتھی راج کے فرامین اور پرتھا بائی کے خطوط میں بھی کا، کے اور کی استعمال ہوئے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں شیخ فرید شکر گنج کے یہاں "کا" کا استعمال موجود ہے۔ پہلو بہ پہلو "کیری" کا استعمال بھی ہوا ہے۔ لہٰذا دونوں میں سے کوئی ایک، دوسرے سے ماخوذ معلوم نہیں ہوتا۔

شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ اردو میں علامتِ اضافت "ک" ہے جس کی تین حالتیں ہیں: "کا" واحد مذکر کے لیے "کی" واحد اور جمع مونث کے لیے۔ "کے" جمع مذکر کے لیے۔ وہ لکھتے ہیں "اس کی اصلیت میں اختلاف ہے۔ کچھ علما اسے سنسکرت لاحقے فاعلی कृत سے یا इदं क سے ماخوذ مانتے ہیں۔ کایک (جسمانی، جسم کا)، رومک (روم کا رہنے والا)

---

٢٣ شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا صفحہ ٢٢١-٢٢٢ - دی مسلم پریس ڈھاکہ - اشاعتِ اول سنہ ١٩٥٦ء

٢٤ ایضاً صفحہ ٢٢٢ -

٢٥ حافظ محمود شیرانی - پرتھی راج راسا (مطالب و تنقید و تبصرہ) صفحہ ٢٢٧-٢٢٨ - انجمن ترقی ہند - دہلی - سنہ ١٩٤٢ء

شیام سندر داس کہتے ہیں کہ قدیم ہندی میں 'کا' کی جگہ حرف 'ک' استعمال ہوتا تھا [۲۶] اگر یہ حرف 'ک' کی صورت میں استعمال ہوتا تھا تو غالباً اس پر فتحہ (زبر) ہوگا جو بعد میں اشباع کے باعث الف بن کر واضح ہوا ہوگا۔ (کَ - کا)۔

تلسی داس اور کبیر داس کے علاوہ 'ودیاپتی' کے یہاں بھی یہ 'ک' ملتا ہے جیسے :-

سجنک پریتی پاشان رسم ریکھا۔ (اچھے آدمی کی محبت پتھر کی لکیر ہے) [۲۷]

اس میں "سجنک" اضافی حالت میں ہے جو 'سجن' (اچھا انسان) اور 'ک' اضافی کا مجموعہ ہے۔ اردو 'کا' سنسکرت कृते سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر ٹرمپ کا خیال بھی یہی ہے [۲۸] ایک خیال یہ ہے کہ اردو 'کا' پراکرت इक्क یا अक्क سے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ دونوں خیال ایک ہیں۔ پراکرت 'اک' ظاہر ہے سنسکرت 'ک' ہی کا ایک روپ ہے [۲۹] بوپ نے 'کا' اضافی کو "اسمائے" کے 'م' سے ماخوذ مانا۔ یہ دیکھ کر کہ موجودہ بولیوں کے لاحقے اکثر ضمیروں کے لاحقوں سے تراش لیے گئے ہیں یہ قیاس صحت سے بعید معلوم نہیں ہوتا [۳۰]

بیمز کے نزدیک "کر" اصل میں "کاریہ" تھا۔ 'کاریہ' کے معنے ہیں وہ کام جو کسی کی طرف منسوب ہو۔ شیر کی گرج "سنگھ کاریہ" کہلاتی ہے اس لیے وہ اس کی طرف منسوب ہے۔ 'کاریہ' پراکرت میں 'کیر' ہوا جیسے "پرینت" سے "پیرنت" اور 'آشچریہ' سے 'اچھیر' [۳۱] بیمز ہورنلے کے ہم خیال ہیں۔ ہورنلے کا کہنا ہے کہ اس کی اصل سنسکرت कृत (کرتا، 'کر' سے اسم مفعول) ہے۔ جس پر الحاقی क اضافہ کرنے سے कृतक بنا اور جب त حذف ہوئی تو करिअओ اور پھر केरआ ہوا [۳۲]

---

[۲۶] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص۲۲۰ (بحوالہ شیام سندر داس۔ ساہتیہ ص۱۴۳) دی سٹی پریس ڈھاکہ سنہ ۱۹۵۶ء

[۲۷] ایضاً ص۲۲۱

[۲۸] ایضاً ص۲۲۱ بحوالہ جرنل بنگال سوسائٹی جلد ۳۳ ص۹۸

[۲۹] اردو زبان کا ارتقا ص۲۲۱۔

[۳۰] ایضاً ص۲۲۲

[۳۱] ایضاً ص۲۲۲-۲۲۳

[۳۲] ایضاً ص۲۲۲۔

بھنڈارکر، پشل کے ہم خیال ہیں (یعنی کیرٗ، کاریہ' سے ماخوذ ہے) اور ہورنلے کے اشتقاق پر انہوں نے کئی اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انہیں 'کرت' کی کوئی شکل "کرے" نہیں ملی۔ 'کرت' سے 'پراکرت' कअ اور किअ بنتے ہیں دوسرے 'کرتے' کی ' ے ' (ए) ایک عارضی، غیر مستقل اور وقتی چیز ہے ممکن نہیں کہ وہ اتنی پائندگی حاصل کرلے کہ وہ ए کی شکل میں مستقل طور پر ए (ضمیر) علامت اضافت بن جائے۔ (ک + ی ر)۔ تیسرے 'کرت' اسم کے طور پر تو استعمال ہو سکتا ہے لیکن یہ بعید نظر آتا ہے کہ وہ ملکیت بتائے [۳۳]

شیام سندر کہتے ہیں کہ "کاریہ" کا تعلق مستقبل سے ہے اور اضافت کا ماضی سے۔ اس لیے "کاریہ" کا اضافی علامت کے طور پر استعمال کچھ ٹھیک نہیں [۳۴]

مولوی عبدالحق، کا، کے اور کی کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ لفظ 'کرتا' کی خرابی (یعنی بگڑی ہوئی صورت) ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پراکرت میں 'کرتا' کے ساتھ مفعولی علامت کا اضافہ کیا گیا بعد ازاں "ت" نکل گئی اور "ری" کا "ی ر" سے بدل ہو گیا اور لفظ کی صورت 'کیرا کا' ہو گئی۔ پراکرت میں یہ لفظ اضافی حالت کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اضافت ٹوٹ گئی اور یہ اس کی جگہ قائم ہو گیا۔ اسی لفظ سے بعد میں کیرو۔ کیرا۔ کرا۔ کر۔ کے۔ نکلے جو قدیم ہندی میں حالتِ اضافی کے لیے استعمال ہوتے تھے اور انہیں کی مختلف صورتیں برج اور ہندی کے کون، کو اور کا ہیں اور جب ان کے شروع سے 'ک' نکل گیا تو باقی "را" اور اس کی دوسری صورتیں 'ری'، 'رے' پیدا ہو گئیں جو ضمیر ذاتی میں صرف متکلم کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں۔[۳۵]

"کیرا" کو 'کے' اور 'را' سے مرکب بھی مانا جا سکتا ہے۔ 'را' ہر چند مفعول کے لیے ہے لیکن فارسی اور پہلوی میں یہ اضافت اور نسبت کے لیے استعمال ہوا ہے 'حامد را پسرے بود' میں 'را' اضافی ہے۔ اضافت اور مفعول میں کچھ اتحاد اور یگانگی ہے "ہند ایرانی" زبانوں میں ایک کا استعمال دوسرے کی جگہ ہوتا تھا۔ [۳۶]

---

[۳۳] اردو زبان کا ارتقا ص ۲۲۳ (بحوالہ بھنڈارکر۔ لیکچرز ص ۲۵۷) دی سٹی پریس۔ ڈھاکہ سنہ ۱۹۵۶ء

[۳۴] ایضاً ص ۲۲۳ بحوالہ شیام سندر۔ ساہتیہ ص ۱۴۰

[۳۵] مولوی عبدالحق۔ قواعد اردو ص ۱۲۵۔ جی ایف پریس۔ لاہور۔

[۳۶] اردو زبان کا ارتقا ص ۲۲۳۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

یہ بتانا مشکل ہے کہ 'کا' اور 'را' میں سے کون سی علامت اصل کے اعتبار سے اضافت کے لیے ہے اور کونسی مفعول کے لیے۔

ہورنلے بھی 'کار' کو 'کا' اور 'ر' سے مرکب بتاتے ہیں [۳۷] وہ دونوں کو اضافی کہتے ہیں ان کے نزدیک 'کار' دوہرا اضافی لاحقہ ہے۔

شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ 'کا' اور 'کی' خاص اردو علامات ہیں۔ شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ، امیر خسرو کے معاصر ہیں۔ ان کا ایک کچھ مندرہ مشہور ہے۔ اس میں کا، کے، کی علامات استعمال ہوئی ہیں۔ امیر خسرو کے کلام میں بھی کا اور کی دیکھے گئے ہیں [۳۸] کیرا اور کیری، اودھی یا راجپوتانہ کے علاقے سے دکنی اردو میں آئیں۔ یہ بات اس لیے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ دکنی میں تو کیرا، کیرے اور کیری کا استعمال ملتا بھی ہے لیکن شمالی ہند کی اردو میں نہیں ہے۔ بعد دکنی اردو میں بھی عام طور پر کا، کے اور کی استعمال ہوئے ہیں البتہ نہایت کمی کے ساتھ کیرا، کیرے اور کیری استعمال ہوئیں اور بتدریج متروک ہو گئیں۔ چٹرجی نے لکھا ہے کہ 'کیر' راجپوتانہ اور بنگال میں مستعمل تھا [۳۹]

اردو 'کا' کا ماخذ 'اودھی' 'کیر' سے مختلف ہے۔ بھنڈارکر نے سنسکرت 'کرت' سے اسے نکالا ہے۔ تلسی کرت کاویہ، کی اردو تلسی کی شاعری ہے۔ بیری اودھا نے اردو 'کا' کو سنسکرت نسبتی یا صفتی क سے ماخوذ قرار دیا ہے [۴۰] 'کا' اور 'کیر' کا ماخذ جدا ہونے ہی کا سبب ہے کہ یہ دونوں عرصے تک ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو مستعمل رہے۔ بعد میں اردو سے مخصوص لاحقے (یعنی کا، کے، کی) باقی رہی اور دوسرے اثرات کے تحت در آنے والی لاحقے کو اردو نے ترک کر دیا۔

---

[۳۷] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ص ۲۲۲-۲۲۳ بحوالہ ہورنلے۔ گرامر ص ۲۲۳ ذیل ۳۷۲

[۳۸] حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو ص ۱۲۱ - اشرف پریس لاہور۔ ۱۹۷۲ء

[۳۹] اردو زبان کا ارتقاء ص ۲۲۲ بحوالہ چٹرجی (سنیتی کمار)۔ بنگالی ص ۷۵۳

[۴۰] ایضاً ص ۲۲۲ بحوالہ بھنڈارکر ہندی بھاشا ص ۸۵۔

"نے" کے نحوی استعمالات

"نے" ، اردو میں فاعل کی علامت ہے اور فعل متعدی معروف کی ماضی مطلق ، ماضی قریب ، ماضی بعید ، ماضی احتمالی کے فاعل کے ساتھ "نے" (بطور علامتِ فاعل) لاتے ہیں ۔ ماضی شرطی یا تمنائی کے فاعل کے ساتھ صرف اس صورت میں علامتِ فاعل لاتے ہیں جب فعل پر لفظ "ہوتا" بڑھا یا گیا ہو مثلاً: ۔

۱ ۔ اس نے کیا (ماضی مطلق)

۲ ۔ اس نے کیا ہے (ماضی قریب)

۳ ۔ اس نے کیا تھا (ماضی بعید)

۴ ۔ اس نے کیا ہو، کیا ہوگا (ماضی احتمالی)

۵ ۔ اس نے کیا ہوتا ۔ (ماضی شرطی یا تمنائی)

ان ماضیوں کے تمام صیغوں میں اسی طرح فاعل پر "نے" داخل کیا جاتا ہے ۔ یہ قاعدہ اردو میں شروع سے اسی طرح برتا گیا ہے اس میں کوئی خاص تغیر دیکھنے میں نہیں آتا ۔ سوائے اس کے ، کہ بعض اوقات شعراء حضرات نے نو مشقی کے سبب یا قادر الکلام شعرائے ضرورتِ شعری کے باعث کہیں کہیں علامتِ فاعل کو حذف بھی کر دیا ہے اس سلسلے میں حاتم کی مثال اور ان کے شاگرد رنگین کی ترمیم کا ذکر صرفی بحث برائے علامتِ فاعل میں کیا جا چکا ہے ۔ حذف کی مثالیں میر و سودا تک کے یہاں دیکھنے میں آجاتی ہیں ۔ سودا کے شاگرد قائم کے یہاں بھی جہاں "نے" کا استعمال ملتا ہے وہیں اس کے عدم استعمال کی مثالیں بھی عنقا نہیں ۔ لیکن اس کا استعمال جہاں بھی ہوا ہے قاعدے کے تحت ہوا ہے ۔ ہاں البتہ قدیم اردو میں یہ بات ضرور دیکھنے میں آتی ہے کہ بعض مقامات پر فاعل علامت کے طور پر "نے" داخل تو کیا گیا ہے لیکن حرفِ عاملہ کے طور پر اس کا اثر نظر نہیں آتا ۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کرکے مفعول کے ساتھ قائم کر دیتا ہے ۔ لیکن قدیم اردو بالخصوص دکنی و گجراتی اردو میں اس قسم کی مثالیں عام ہیں جن میں فاعل پر "نے" داخل ہونے کے باوجود فعل بلا شعور اپنے فاعل کی مطابقت کرتا ہے یعنی فعل کا تعلق بلا شعور فاعل سے قائم رہتا ہے اور جنس و عدد میں فاعل ہی کے مطابق رہتا ہے ۔ اسی چیز کو لسانیین نے بے قاعدگی سے تعبیر کیا ہے ۔

'نے' کے سلسلے میں چونکہ بہت سی مثالیں حرفی بحث میں درج کی جا چکی ہیں لہٰذا یہاں عہد بعہد اس کے استعمال کی مثالیں درج کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ 'نے' کے استعمال کے سلسلے میں ایک عام غلط فہمی جو بعض لسانیین میں راہ پا گئی ہے یہ ہے کہ ان کے نزدیک قدیم اردو ادب میں 'نے' یا تو بالکل موجود ہی نہ تھا اور اگر موجود تھا تو اس کے استعمال کا قاعدہ متعین نہیں تھا اور یہ کہ ان کے نزدیک اس کا استعمال نہ صرف فاعلی علامت کے طور پر ہوا ہے بلکہ مفعولی علامت کے طور پر بھی کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جارج گریرسن کا کہنا ہے کہ 'نے' کے استعمال کے قواعد سب سے پہلے ۱۷۷۸ء میں مرتب ہوئے ۱؎ جب کہ مولوی عبدالحق نے یہ نظریہ قایم کیا کہ 'نے' فاعل کی علامت کے طور پر قدیم ہندی میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ ۲؎ حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ "دکنی 'نے' کے استعمال میں بالکل بے قاعدہ ہے۔ اس زبان میں وہ فاعل اور مفعول دونوں کے لیے آتا ہے ۳؎ جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مزید انوکھا اور چونکا دینے والا انکشاف کیا ہے کہ "قدیم ہندی تو کیا، اردو ادب میں بھی اس کا وجود نہیں"۔ ۴؎ حالانکہ یہ درست نہیں امیر خسرو، اردو (ہندوی، ہندی) کے قدیم ترین شاعر ہیں۔ انہوں نے ۷۲۵ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے حسب ذیل شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاعلی علامت کے طور پر 'نے' کا استعمال اس قدیم دور میں بھی نہ صرف موجود تھا بلکہ قاعدے کے عین مطابق تھا۔ ملاحظہ کیجیے:۔

میرا جو من تم نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دیا
غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر ۵؎

۱؎ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل۔ ص ۱۷ بحوالہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۴ء

۲؎ مولوی عبدالحق۔ قواعد اردو ص ۱۸۴۔ مطبوعہ جی ایف پریس لاہور۔

۳؎ حافظ محمود شیرانی۔ مقالات حافظ محمود شیرانی (جلد اول) ص ۲۲۹۔ شفیق پریس لاہور ۱۹۶۶ء

۴؎ ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ص ۱۶۱۔ مطبع عالیہ لاہور۔ پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۶

۵؎ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۶۲ء

محمد افضل جھنجھانوی، سولہویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں ان کا ایک شعر ہے :۔

پیا نے کر پکڑ کر سوں لگائی

تمامی آگ تن من کی بجھائی ؎۶

چندر بھان برہمن، عہد شاہجہانی کا ایک مشہور فارسی شاعر ہے۔ پنڈت کیفی کا خیال ہے کہ شمالی ہند میں سب سے پہلے اردو میں غزل اسی نے لکھی۔ اس غزل کا مطلع ہے :

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے

نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے ؎۷

اسمٰعیل امروہوی بھی شمالی ہند کے قدیم شاعر ہیں۔ ان کی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہ رض" ۱۱۰۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس کا مصرع ہے، جو آواز ہاتف نے دی سن امیر ؎۸

مندرجہ بالا چند مثالیں اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں کہ ۱۷۸۱ء سے پہلے "نے" کا استعمال سرائے بیان قاعدے کے مطابق ہوا ہے۔ گویا ۱۷۸۱ء سے پیشتر یہ قاعدہ اسی صورت میں موجود و مستعمل تھا نیز یہ کہ قدیم ہندی یا اردو ادب میں "نے" کا استعمال سرے ہی سے مفقود قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ مندرجہ بالا مثالیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ہندوی یا اردو شاعروں نے اسے استعمال کیا ہے اور قدیم اردو ادب سے اس کی وافر مثالیں دستیاب ہیں جو کہ صرفی بحث میں نقل کی جا چکی ہیں۔ رہی یہ بات کہ دکنی میں "نے" فاعل اور مفعول دونوں کے لیے آتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کہنا درست نہیں۔ دکنی میں بھی "نے" فاعلی علامت ہی کے طور پر استعمال ہوا ہے البتہ "سب رس" اور "معراج العاشقین" میں جس قسم کے جملے دیکھنے میں آتے ہیں ان سے اکثر حضرات غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں ملا وجہی کی "سب رس" میں "نے" دراصل

؎۶ حافظ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ اشرف پریس لاہور۔ ۱۹۷۲ء

؎۷ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۶۲ء

؎۸ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور ۱۹۶۹ء

فاعلی علامت ہی کے طور پر استعمال ہوا ہے مثلاً "ان نے سنیا کہ دل رتال جاتا ہے"۔ یہ استعمال آج کے قاعدے کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض جگہ اس قسم کے جملے بھی دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً :-

۱۔ عزرے نے نوکوں اپنے گھرلے کر گیا۔

۲۔ اس خاطر زلیخا نے کیا کر ای۔

۳۔ بادشاہاں نے دنیا کا حظ چھوڑے خلق کا دل توڑے ۹

۴۔ ~~عزرے نے نوکوں اپنے گھرلے کر گیا۔~~ ۹

اس قسم کے جملے غلط فہمی کا باعث بنتے ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ استعمال بھی فاعلی علامت کے طور پر ہی ہوا ہے۔ البتہ حرفِ عامل کے طور پر بعض جگہ اس کا اثر نظر نہیں آتا۔ یعنی فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کر کے مفعول سے قایم کر دے۔ مندرجہ بالا جملوں میں سے پہلا جملہ دیکھیے۔ "نے" فاعل کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ حروفِ عامل جب ایسے مذکر اسمائے واحد کے ساتھ آتے ہیں جن کے آخر میں الف یا ہائے ہوز ہو تو امالہ کیا جاتا ہے یعنی الف یا ہائے ہوز کو یائے مجہول سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً گھوڑا، لڑکا ان پر "نے" داخل کریں تو کہیں گے گھوڑے نے۔ لڑکے نے۔ وغیرہ۔ "سب رس" کے محولہ جملے کو دیکھیے۔ فاعل (عزرہ) پر "نے" داخل کیا گیا تو امالہ ہوا اور "عزرہ" بدل کر "عزرے" ہو گیا۔ اس طرح حرفِ عامل کے طور پر یہاں اس کا اثر واضح ہے لیکن آج کی اردو میں ایسے موقع پر "نے" داخل نہیں کیا جاتا چنانچہ "نے" کا یہ استعمال بے موقع ہے۔ اہلِ پنجاب البتہ اس طرح بولتے ہیں میں نے کھانا ہے، میں نے جانا۔ میں نے دینا ہے وغیرہ۔ اردو میں اس طرح بولنا درست نہیں۔ قدیم دکنی میں ایسے موقعوں پر غالباً یہ اس لیے روا تھا کہ مفعول اور فاعل میں تمیز کی جا سکے۔ چنانچہ جہاں موقع نہ ہو وہاں بھی فاعل پر "نے" داخل کر دیا ہے۔ مندرجہ بالا جملوں میں سے دوسرے اور تیسرے جملے میں بھی "نے" فاعلی علامت ہی کے طور پر آیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ حرفِ عاملہ کے طور پر اس کا اثر نظر نہیں آتا۔ یعنی نہ تو اس نے امالہ کیا اور نہ فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کر کے مفعول سے قایم کیا

---

۹ ملا وجہی - سب رس - انجمن پریس کراچی - سنہ ۱۹۷۷ء

یہی سبب ہے کہ فعل اپنے فاعل کی مطابقت میں آیا ہے۔ چنانچہ فاعل واحد مونث ہونے کی صورت میں فعل بھی واحد مونث آیا ہے اور فاعل جمع مذکر کی مطابقت میں فعل جمع مذکر آیا ہے۔ [10] اس سلسلے کی مزید تفصیل بحث "فعل و فاعل کی مطابقت" کے تحت کی گئی ہے۔

حروفِ عاملہ کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ اسمائی جمع 'وں' کی علامت کے ساتھ لائی جاتی ہے۔ [11] مثلاً عورتوں سے عورتوں نے۔ مردوں کو وغیرہ۔ لیکن مندرجہ بالا مثبت جملے میں یہ اثر بھی مفقود ہے اور اسم کی جمع 'وں' کے بجائے 'اں' سے بنائی گئی ہے۔ لیکن یہ دکنی قاعدۂ جمع کی خصوصیت ہے۔ دکن میں موجود قاعدۂ جمع کے علاوہ عام طور پر جمع 'اں' کے اضافے سے بنائی جاتی ہے۔ اس کا مفصل ذکر "جمع کے قواعد" کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ یہاں چونکہ 'نے' کا ذکر بطور حرفِ عاملہ، ذکر کرنا ضروری سمجھا گیا لہٰذا اختصار کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ بہرصورت دکنی میں بھی 'نے' فاعل علامت کے طور پر ہی استعمال ہوا ہے مفعولی طور پر نہیں۔ لیکن چونکہ کہیں کہیں ایسے موقع پر بھی فاعل پر 'نے' داخل کر دیا گیا ہے جس پر ضرورت نہ تھی، اور کہیں حرفِ عاملہ کے طور پر چونکہ جملے پر 'نے' کا اثر نظر نہیں آتا اس لیے بعض حضرات کے نزدیک 'نے' کا یہ استعمال مفعولی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دکنی اردو میں 'کو' کا وجود نہ ہوتا، فاعل و مفعول دونوں کے لیے 'نے' کا استعمال کافی ہوتا۔ اس کے برعکس دکنی میں علامتِ مفعول 'کو' نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کا استعمال تسلسل کے ساتھ ملتا ہے اور موجودہ قاعدے کے مطابق ہے۔ اس سلسلے میں یہاں مثالیں درج کرنا ضروری نہیں چونکہ اس قسم کی بحث 'کو' کے حرفی مباحث کے تحت کی گئی ہے اور بہت سی مثالیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔ دکنی میں، ان امثال کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ 'کو' کا استعمال بطور علامتِ مفعول اسی وقت سے ملتا ہے جب سے 'نے' کا استعمال بطور فاعل ملتا ہے۔ ان کا پہلو بہ پہلو ملنا اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ دکنی شعرا و ادبا علامتِ فاعل و مفعول میں فرق و امتیاز کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ 'کو' کی جگہ 'نے'، اور 'نے' کی جگہ 'کو' عام طور پر استعمال کرتے۔ لیکن دکنی ادب کے مطالعے سے

---

[10] اس قاعدے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: "مصباح القواعد" (صرف و نحو) فتح محمد خاں جالندھری اور "جامع القواعد" حصۂ نحو۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔

[11] ایضاً۔ مزید تفصیل باب: "جمع کے قواعد" میں دیکھیے۔

اس قسم کی مثالیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔

خواجہ گیسو دراز سے منسوب قدیم نثری تصنیف "معراج العاشقین" جو دراصل ان کی نہیں بلکہ ان کے بہت بعد کی تصنیف ہے اس میں بھی نسبتاً کم، جیسے جملے دیکھنے میں آئے ہیں۔ دو جملے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ خدائے تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمائے ہیں۔

۲۔ ہور حضرت نے تمام آج کی خبر بولے۔ [۱۲]

ان دونوں جملوں میں "نے"، فاعلی علامت کے طور پر آیا ہے نہ کہ مفعول کے لیے۔ البتہ دوسرے جملے میں جس موقع پر "نے" استعمال کیا گیا ہے وہاں اس کی ضرورت نہ تھی۔ مصدر "بولنا" کے ساتھ اب "نے" داخل نہیں کیا جاتا۔

مخدوم سید محمد حسینی شہباز کے رسالۂ تصوف "شکارنامہ" کا ایک جملہ ہے:۔ مرشداں نے یوں فرمائے ہیں [۱۳]

۳ شکارنامہ۔

خواجہ گیسو دراز کے "رسالۂ تصوف" میں "کو" کا استعمال ملاحظہ ہو:۔

۱۔ سوائے دم کو یاد الٰہی سے خالی نہ کھونا۔

۲۔ یاد الٰہی کو ٹوٹنے نہ دینا۔

۳۔ جب تک اندھیرے میں دیل کو نہیں پہونچا (پہونچا) تب تک ذات معلوم نہیں ہوتی ہے [۱۴]

۲۱

تینوں جملوں میں "کو"، مفعولی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اگر اس وقت علامت مفعول موجود نہ ہوتی تو خواجہ صاحب کے رسالے میں اس کا استعمال نہ ہوتا۔ اس کی جگہ "نے" ہی استعمال ہوا ہوتا۔

دکنی اردو میں ایک اور تصنیف باقر آگاہ کی "عقاید مذہب امامیہ" ہے۔ مخطوطے پر سن تصنیف ۱۰۷۵ھ درج ہے۔ جب کہ فہرست انجمن ترقی اردو ص ۲۸۱ پر اسے سن کتابت لکھا گیا ہے [۱۵] اس مخطوطے میں "نے" کا استعمال

---

[۱۲] معراج العاشقین، مرتبہ تحسین سروری۔ دکن دار الاشاعت کراچی ۱۹۷۱ء جمیل جالبی نے اسے مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ "کدم راؤ پدم راؤ" - اور لکھا ہے کہ یہ گیارھویں صدی کے اواخر اور بارھویں صدی کے اوایل کی لکھی ہوئی ہے۔

[۱۳] مخدوم سید محمد حسینی شہباز۔ مخطوطہ "شکارنامہ"۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۲۹ ص ۳۔ مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی۔

[۱۴] خواجہ گیسو دراز۔ رسالۂ تصوف۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۲۲ ص ۲۱۔ مخزونہ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

[۱۵] افسر صدیقی امروہوی۔ فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو۔ کراچی ص ۲۸۱۔ انجمن پریس کراچی۔

ملاحظہ ہو :-

۱۔ حضرت پیغمبر نے (نے) فرمائے کہ میں تجھی (تجھے) بشارت دیتا ہوں۔

۲۔ معور لوتی (لولے) کہ خدائی (نے) تجھی سلام بول کر بولیا ہے کہ علی کوں بشارت دے [16]

البتہ شہاب الدین قریشی کی تصنیف "بھوگ بل" میں فاعل و فعل کی مطابقت "نے" کے آجانے پر آج ہی کی طرح نظر آتی ہے جیسے درج ذیل ہے :-

خدائے قریش کوں فرصت دیا + تو سب کو ک کوں نظم دکنی کیا [17]

شیخ داؤد ضعیفی کی "ہدایاتِ ہندی" (تصنیف ۱۱۰۰ھ) میں "نے" کا استعمال دیکھیے :-

کہ جوں حق تعالیٰ نے بولیا اہے + جو قرآن کے بیچ لکھ لیا اہے [18]

شاہ محمد حق نما کی "خزانۂ معرفت" کا ایک شعر ہے :-

سب او خدا نے رکھیا ہے چھپا + سکل بھید اس کا کسے نا دیکھا [19]

یقین دکھنی کی "نعمۃ المبین" (تصنیف ۱۱۸۲ھ) کے دو شعر درج ذیل ہیں :-

کسی نے غسل پانی میں کیا جا + کیا سردی نے اس کے تن میں آجا

کسی نے تیل کوں مکروہ کہتا ہے + کتب میں ہر مفتہ کے یہ لیا ہے [20]

یہ استعمال قاعدے کے مطابق ہے۔

اس سلسلے میں مزید قدیم مثال دیکھنی ہو تو قطبِ عالم گجراتی (م ۸۵۷ھ) کا یہ جملہ دیکھیے :-

---

[16] باقر آگاہ ۔ عقایدِ مذہبِ امامیہ ۔ ص ۲۳۹ ۔ مخطوطہ نمبر ۸۹/۱ ۔ مخزونہ نیشنل میوزیم ۔ کراچی۔

[17] شہاب الدین قریشی ۔ بھوگ بل ۔ تصنیف ۱۰۲۳ھ (سن کتابت ۱۰۸۲ھ) ص ۱۹۵ مخطوطہ نمبر ۱۱۸/۱ ۔ نیشنل میوزیم ۔ کراچی۔

[18] شیخ داؤد ضعیفی ۔ ہدایاتِ ہندی ۔ (تصنیف ۱۱۰۰ھ) ص ۲۰۶ ۔ مخطوطہ نمبر ۱۴/۱ ۔ نیشنل میوزیم ۔ کراچی۔

[19] شاہ محمد حق نما ۔ خزانۂ معرفت ۔ ص ۷ (تصنیف ۱۱۸۱ھ) ۔ مخطوطہ نمبر ۱۳۵/۱ ۔ نیشنل میوزیم ۔ کراچی۔

[20] یقین دکھنی ۔ نعمۃ المبین ۔ ص ۲۳-۲۴ (تصنیف ۱۱۸۲ھ) ۔ مخطوطہ نمبر ۶۴/۱ ۔ نیشنل میوزیم ۔ کراچی۔

چشموں نے پکائی اور اسے بنجاریوں نے کھائی [21]

یہ استعمال موجودہ قاعدے کے مطابق ہے "نے" کا جملے پر اثر بھی نظر آ رہا ہے۔ اسما کا امالہ بھی ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم اردو میں "نے" کے دو طرح کے استعمال نظر آتے ہیں ایک تو وہی ہے جو آج کا قاعدہ ہے دوسرا وہ جس میں موجودہ قاعدے کے خلاف بعض مقامات پر "نے" حرف عاملہ کے طور پر نہ تو جملے کو متاثر کرتا ہے اور نہ اس میں فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کر کے مفعول کے ساتھ قائم کرتا ہے۔ اس صورت میں امالہ کا قاعدہ بھی برتا نہیں گیا ہے۔ مزید برآں "نے" بعض اوقات ان موقعوں پر بھی استعمال ہوا ہے جہاں اس کے استعمال کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تغیر عموماً دکنی و گجراتی اردو میں دیکھنے میں آتا ہے شمالی ہند کی اردو میں یہ تغیر اتنا عام نہیں۔ صرف چند ابتدائی تصانیف مثلاً اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں اور کربل کتھا وغیرہ میں دکھائی دیتا ہے البتہ حذفِ "نے" کی مثالیں بہت بعد تک بھی مل جاتی ہیں۔

"نے" کے نحوی استعمال کے سلسلے میں شوکت صاحب کے خیالات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "نے" اردو میں اگر فاعل کی علامت ہوتا تو وہ اسم کی فاعلی حالت بتاتا تو فعل ہمیشہ اس اسم کے مطابق ہوتا جس کے بعد "نے" ہے اور ہر جگہ فاعل کے بعد اس کا اضافہ جائز اور صحیح سمجھا جاتا۔ اردو میں فعلِ حال، فعلِ مستقبل، اور فعل لازم کی ماضی کے ساتھ اگر فاعل کا ذکر کیا جاتا ہے تو "نے" استعمال نہیں ہوتا جیسے سورج نکلا۔ حامد اسکول جاتا ہے۔ میں کتاب پڑھوں گا۔ ان مثالوں میں "سورج" "حامد" اور "میں" فاعلی حالت میں ہیں مگر ان کے بعد "نے" نہیں اور نہ لایا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ "نے" فاعل کی علامت نہیں فعلِ مجہول کے فاعل کی علامت ہے۔ اور انگریزی "By" کے ہم معنی ہے۔ انگریزی میں اس نوع کے فاعل کو Agent (نائب فاعل) کہتے ہیں [22]

گویا شوکت صاحب کے نزدیک اگر "نے" فاعل کی علامت ہوتا تو فعل لازم میں بھی فاعل پر "نے" داخل کیا جاتا۔ لیکن چونکہ فعل لازم میں اس کا استعمال نہیں ہوتا لہذا یہ فاعلی علامت نہیں حالانکہ یہ قاعدہ

---

[21] شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۲۱۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۰ء

[22] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۲۲۵-۲۲۶۔ دی سٹی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

عملیہ ہے کہ فعلِ لازم میں فاعل پر "نے" داخل نہیں کیا جاتا۔ "نے" کا استعمال فاعلی علامت کے طور پر متعدی سے مخصوص ہے۔ وہ بھی صرف پانچ ماضیوں یعنی ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی احتمالی اور ماضی شرطی یا تمنائی میں۔ ماضی استمراری میں فاعل پر "نے" داخل نہیں کیا جاتا۔ مزید برآں فعل لازم (مفرد یا مرکب) کے فاعل کے ساتھ "نے" نہیں آتا مگر اس قاعدے سے بعض لازم افعال مخصوص مستثنیٰ ہیں مثلاً تھوکنا، پسکنا وغیرہ۔ نیز نہانا، موتنا (مفرد حالت میں)، تھوک دینا، سنک دینا، سونٹ لینا وغیرہ (مرکب حالت میں)۔ واضح رہے کہ ان مرکب افعال میں فعلِ الحاقی لینا، دینا، فعلِ متعدی ہے لیکن اگر ایسے فعل الحاقی لائے جائیں جو لازم ہوں (مثلاً آنا، جانا وغیرہ) تو علامتِ فاعل نہیں لاتے۔ ۲۳؎

شوکت صاحب کا کہنا ہے کہ "نے" اردو میں اگر فاعل کی علامت ہوتا اور اسم کی فاعلی حالت بتاتا تو فعل ہمیشہ اس اسم کے مطابق ہوتا جس کے بعد "نے" ہے۔ یہاں اس امر پر توجہ دینا ضروری ہے کہ "نے" فاعلی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ حرفِ عاملہ بھی ہے۔ جب کسی جملے میں فاعل پر "نے" داخل کیا جاتا ہے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فعل کا تعلق فاعل سے ٹوٹ جاتا ہے اور مفعول کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ "نے" والے جملوں میں فعل، فاعل کے بجائے مفعول کے تابع ہوتا ہے۔ البتہ فعل لازم میں چونکہ "نے" داخل نہیں کیا جاتا لہٰذا ایسے جملوں میں فعل، فاعل کی مطابقت کرتا ہے۔ نیز یہ کہ انگریزی By کے ہم معنی اردو کا حرف "سے" ہے۔ شوکت صاحب کہتے ہیں کہ "نے" فاعل کی علامت نہیں، فعلِ مجہول کے فاعل کی علامت ہے۔ تو یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فعلِ مجہول اسی وقت ہوتا ہے جب فاعل نہ معلوم ہو مثلاً "خط لکھا گیا۔ کتاب پڑھی گئی۔ کہانی سنائی گئی"۔ جب مجہول میں فاعل معلوم ہی نہیں ہوتا تو علامت فاعل کا داخل کرنا کیا معنی؟

یہاں ایک اور صاحب کے نظریات کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ یہ مرے کالج سیالکوٹ کے پروفیسر

۲۳؎ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ جامع القواعد (حصہ نحو) ص ۱۲۵، نیو حبیب پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔ اشاعت اول ۱۹۶۲ء۔
اور مولوی عبدالحق۔ قواعدِ اردو۔ ص ۱۸۷۔ جی ایف پریس۔ لاہور۔

امان اللہ ہیں۔ رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ان کا ایک مضمون "نے علامتِ فاعل؟" شائع
ہوا۔ اس میں انہوں نے "نے" بارے کہنے کے سلسلے میں بہت سے عجیب و غریب انکشافات کیے ہیں اور واضح کیا
ہے کہ آج تک تمام نحوی اور لسانیین "نے" کے سلسلے میں سخت غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب
کا کہنا ہے کہ آج تک بھی قواعد نویس اور ماہرینِ لسانیات "نے" کو اردو میں فاعل کی علامت قرار دیتے
آئے ہیں حالانکہ جسے قواعد نویس فاعل کہتے ہیں نہ وہ فاعل ہے اور نہ "نے" علامتِ فاعل"۔ ان کا دعویٰ ہے
کہ اگر "نے" فاعل کی علامت ہوتا تو فعل اپنے فاعل کے تابع ہوتا لیکن اردو میں جن جملوں میں "نے" استعمال
ہوتا ہے ان میں فعل، مفعول کے تابع ہوتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ "نے" فاعلی علامت نہیں۔
کیونکہ جن جملوں میں "نے" نہیں آتا وہاں فعل واقعی اپنے فاعل کا تابع ہوتا ہے [۲۴]

اس نکتہ سے بحث کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فعل لازم اور فعل متعدی کو سمجھا جائے۔ فعل
لازم وہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا پایا جائے مگر اس کا اثر صرف کام کرنے والے یعنی فاعل تک محدود رہے اور بس۔
گویا فعل لازم میں صرف فاعل اور فعل مل کر کام پورا ہو جاتا ہے اس میں مفعول کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے
احمد آیا۔ فعل متعدی وہ ہے جس میں فعل کا اثر فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچے۔ گویا فعل متعدی میں
ایک کام کا کرنے والا، ایک کام کا سہنے والا اور ایک کام (فعل) ضروری ہے ان کی یکجائی سے کام مکمل ہوتا
ہے۔ جیسے احمد نے حامد کو مارا۔ اس میں بیک وقت دو افراد موجود ہیں اب یہ واضح کرنے کے لیے کہ کام کا
کرنے والا کون ہے اور سہنے والا کون؟ علامت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاکہ کسی قسم کا اشتباہ نہ رہے۔
چنانچہ کام کرنے والے کے لیے علامتِ فاعل "نے" اور سہنے والے کے لیے علامتِ مفعول "کو" استعمال ہوتا ہے۔
جس کی وجہ سے فاعل اور مفعول کا تعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لازم میں صرف فعل اور فاعل ہی ہوتا
ہے لہٰذا کسی اشتباہ کا احتمال نہیں رہتا اور علامت کی ضرورت بھی اس لیے پیش نہیں آتی۔ فعل لازم میں
چونکہ کوئی مفعول نہیں ہوتا اس لیے فعل، فاعل ہی کے تابع ہوتا ہے جب کہ "نے" والے جملوں میں (افعال متعدی

---

[۲۴] پروفیسر امان اللہ: "نے علامتِ فاعل؟" رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۲ء

میں) فاعل کے علاوہ مفعول بھی ہوتا ہے لہٰذا ایک طرف فاعل کے تعین کے لیے "نے"۔ داخل کیا جاتا ہے دوسری جانب
"نے" کے سبب سے یہ تغیر واقع ہوتا ہے کہ فعل کا تعلق فاعل سے منقطع ہو جاتا ہے اور مفعول سے قایم ہو جاتا ہے
لازم اور فعلِ متعدی میں فعل کی اسی مطابقت اور عدم تطابق نے پروفیسر امان اللہ کو متعجب کر دیا۔ انھوں نے
اس کے اصول کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بجائے اپنے سطحی علم (صرف و نحو سے متعلق) کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ افعالِ
متعدی میں فعل اپنے فاعل کا تابع اس لیے نہیں رہتا کہ جسے قواعد نویس فاعل کہتے ہیں نہ وہ فاعل ہے اور
نہ "نے" علامتِ فاعل۔ مذکورہ بالا حقایق کی روشنی میں حقیقت خود بخود کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ پروفیسر
صاحب کتنی شدید غلط فہمی کا شکار رہیں جس کے تحت انہوں نے تمام قواعد نویس اور لسانیین کے نظریات کی نفی کر دی ہے۔

پروفیسر امان اللہ گریرسن اور شرڈل کی تقلید و تائید کرتے ہوئے ان جملوں کو جن میں "نے" آتا ہے طورِ مجہول
بتاتے ہیں مثلاً "میں نے کھانا کھایا" ان کے نزدیک "میں" مجرور ہے "نے" حرفِ جر، "کھانا" قائم مقام فاعل اور "کھایا"
فعل متعدی مجہول۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں نے کھانا کھایا" کا صحیح انگریزی ترجمہ "Meal was taken by me" ہے۔
اگر پروفیسر صاحب کی انگریزی دانی اور قواعد فہمی کا یہ حال ہے تو ان سے کس درجہ صحیح نتائج کے استخراج کی
توقع کی جا سکتی ہے؟ اگر "میں نے کھانا کھایا" کا یہ ترجمہ ہے تو "مجھ سے کھانا کھایا گیا" کا ترجمہ غالباً وہ اس طرح
کریں "I took Meal" اگر صورتِ حال یہی ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انگریزی ماہرین
لسانیات کی انگریزی کتابوں کو پڑھ کر کس حد تک سمجھا ہوگا۔ پھر اگر انہوں نے عجیب عجیب انکشافات کیے ہیں تو
انہیں معذور سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ سب ان کی ذاتی علمی استعداد، لسانیات شناسی، انگریزی فہمی اور تقلید و
تتبع کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر صاحب کے پیش کردہ نکات کی مزید تفصیل "نے" کی صرفی بحث میں ملاحظہ کی جا سکتی
ہے۔

اگر پروفیسر صاحب اردو قواعد سے واقف ہوتے تو ضرور جانتے ہوتے کہ "میں نے کھانا کھایا" فعلِ
متعدی معروف (ماضی مطلق) ہے۔ جس کا طورِ مجہول ہوگا "کھانا کھایا گیا"۔ طورِ مجہول کو مجہول اس لیے کہا جاتا
ہے کہ اس میں فاعل لا معلوم ہوتا ہے۔ مفعول اور فعل پر کام ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کہیں فاعل کو ظاہر کیا
جاتا ہے تو اس طور پر "مجھ سے کھانا کھایا گیا"۔ اس طرح "مجھ" دراصل فاعل نہیں رہتا بلکہ مفعول قائم مقام فاعل

بن جاتا ہے جیسے حرفِ جر "سے" کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اردو میں حرفِ جر "سے" ہے جو پہلے یہاں سے موجود و مستعمل ہے لہٰذا "نے" کو کھینچ تان کر حرفِ جر بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

پروفیسر صاحب کا پیش کردہ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ :-

"۱۔ احمد نے ایک شیر مارا ۔ ۲۔ ایک شیر احمد کے ہاتھ سے مارا گیا۔

دونوں جملوں کا مفہوم بالکل ایک ہے اور طورِ کلام بھی ایک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں فقط "نے" سے وہ مطلب پورا ہو گیا ہے جو دوسرے میں "کے ہاتھ" سے پورا ہوا ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ "نے" بمعنی ذریعہ یا واسطہ استعمال ہوا ہے۔ دوسرا یہ نکلا کہ "نے" کے ساتھ فعلِ ماضی دراصل حالیہ تمام کی مخفف شکل ہوتی ہے یعنی یہ جملہ دراصل یوں تھا احمد نے ایک شیر مارا گیا یا مارا ہوا۔" [۲۵]

مذکورہ بالا دونوں جملوں میں پہلا طور معروف ہے اور دوسرا مجہول۔ پروفیسر صاحب نے دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ شمالی ہند (جو اردو مولد و ماخذ کے سلسلے میں مرکز رہا ہے) میں اس قسم کے جملے "احمد نے ایک شیر مارا گیا" ہمیں دستیاب نہیں ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی بول چال میں اس طرح بولنے کا رواج کبھی نہیں رہا۔ مزید برآں "نے" ذریعے اور واسطے کے لیے نہیں، فاعل کی علامت کے طور پر ہے۔ ذریعے اور واسطے کے معنوں میں اردو میں "سے" مستعمل ہے۔ اس کے فاعل کو آلی فاعل یا نائب فاعل کہہ سکتے ہیں۔ مفعول، قائم مقام فاعل بھی اسی کو کہتے ہیں اور اس پر "نے" داخل نہیں کیا جاتا، "سے" داخل کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں شوکت صاحب کی بحث کا تذکرہ بھی برمحل ہے۔ انہوں نے "نے" کے ساتھ ساتھ "سے" کو بھی علامتِ فاعل قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "نے" دراصل آلی فاعل کی علامت ہے اور قدیم اردو کے علاوہ مرہٹی میں بھی اس کا استعمال اسی طور پر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بھنڈارکر کے حوالے سے کچھ مثالوں کا ذکر کرنے کے علاوہ انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ مرہٹی شاعر گیانیشور (۱۲۹۰ء۔ جسے امیر خسرو کا معاصر سمجھنا چاہیے) کے یہاں "نی" اردو "نے" کی طرح استعمال ہوا ہے۔

۲۵۔ پروفیسر امان اللہ۔ رسالہ اردو، جنوری ۱۹۵۲ء۔

لیکن یہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے اور "سے" آلے یا ذریعے کے معنے بتاتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے حسبِ ذیل مثالیں دی ہیں:۔

"یے نیں جانیں" (اس معیار سے)۔ "جے نیں نوشیں" (جس اطمینان سے)۔ "یے نیں ہر سا دیں" (اس عنایت سے)۔ ۲۶

ان مثالوں کے اندراج کے ساتھ شوکت صاحب لکھتے ہیں کہ "ان مثالوں میں "نیں" جو اردو "نے" کا ایک روپ ہے آلے یا ذریعے کے معنے میں ہے اور یہی مفہوم اردو "نے" کا ہے"۔

"نے"، اور "سے" اس اعتبار سے ہم مفہوم ہو سکتے ہیں کہ یہ اپنے کام کرنے والے یا جس کے ذریعے کام وقوع پذیر ہوا، کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مقام پر "نے"، اور دوسرے مقام پر "سے"، لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ یقیناً دونوں طرح کے جملوں میں کچھ فرق ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے مختلف علامتیں (یہی "نے" اور "یہی "سے") استعمال کی جاتی ہیں۔ خود شوکت صاحب نے گیانیشور کے حوالے سے جو مثالیں پیش کی ہیں ان سے بخوبی واضح ہے کہ یہ "نیں" (بیائے مجہول) دراصل مجبوری "سے"، کے طور پر اور انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسے ہم فاعل کی علامت نہیں کہہ سکتے۔ ہاں البتہ مفعول قائم مقام فاعل جسے شوکت صاحب نے آلی فاعل یا Agent کا نام دیا ہے، کہہ سکتے ہیں۔ اس "سے"، انگریزی By کے ہم معنی ہے۔ حقیقت میں یہ اس بات کی جانب اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ کام کس کے ذریعے سے انجام پایا؟ گویا "سے"، آلے، سبب یا ذریعے کی علامت ہوئی نہ کہ فاعل کی؟ اردو ایک اختصار پسند رجحان رکھنے والی زبان ہے ارتقا کے ادوار سے گزرتے ہوئے اس نے اسی اختصار پسندی کے تحت فالتو لاحقے اور حروف کی متفرق لغات ترک کر دیں لہٰذا اگر "نے" اور "سے"، بالکل ہم معنی ہوتے اور صرف فاعل کی علامت کے طور پر آتے تو ضرور تھا کہ اردو ان میں سے کسی ایک کو ترک کر دوسرے کو اختیار کر لیتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ یہ دونوں علامتیں کام کے وقوع پذیر ہونے کی دو مختلف صورتوں کو واضح کرتی ہیں۔

پروفیسر اماز اللہ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ قدیم اردو میں "نے"، نہیں تھا۔ دکن کی اردو قدیم اردو ہے۔ ان کے نزدیک وہ تقریباً آج تک ویسی ہی سینکڑوں سال پرانی چلی آتی ہے۔ دلی کی زبان میں برابر ارتقا ہوتا رہا اس لیے وہ بدل دکن والوں کو اردو کے اس ارتقا کا علم نہ ہو سکا اس لیے وہ جوں کی توں رہی اور "نے"، بدل اس میں راہ نہ پا سکا۔

---

۲۶ شوکت سبزواری۔ لسانی مسائل ص ۶۵۔ بحوالہ فلالوجیکل لیکچرز ص ۲۰۲

ان کا کہنا ہے کہ "نے" اگر قدیم اردو میں ہوتا تو دکن کے مصنفین اس کو استعمال کرتے اور آج بھی روزانہ بول چال میں اس کا سراغ ملتا۔ لیکن یہ نہ دکن کے شعرا اور نثر نگاروں کے یہاں ہے اور نہ آج کی زبان میں۔

میر منیر صاحب کا یہ دعویٰ بھی ان کے دوسرے دعووں کی طرح مہمل اور بے بنیاد ہے۔ غالباً انہوں نے دکن کے قدیم ادب کا بذاتِ خود مطالعہ نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو اس دعوے کی خود بخود تردید ہو جاتی۔ دکنی اور گجراتی اردو قدیم اردو ہے۔ اس لیے کہ تحریری سلسلے کے اولین نمونے ہمیں پہلے وہیں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اردو اپنے مرکز (دہلوی اردو) سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی سوائے اس کے کہ اس پر اپنی علاقائی اور پاس پڑوس کی بولیوں کے بھی کچھ اثرات نظر آتے ہیں جنہیں میر و سودا، حاتم و مظہر جانجاناں وغیرہ نے بعد کو ترک کر دیا اور اسے دہلوی اردو کے مطابق کر لیا گیا۔ اب آئیے اس بات کی جانب کہ اس قدیم اردو میں "نے" نہیں تھا اگر ہوتا تو وہاں کے شعرا اور نثر نگار اپنی تحریروں میں اسے استعمال کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قدیم اردو میں "نے" بالکل ابتدا ہی سے علامتِ فاعل کے طور پر موجود تھا اور تمام شعرا اور نثر نگاروں کے یہاں تسلسل سے اس کا استعمال ملتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں "نے" کی حرفی بحث میں گزر چکی ہیں۔ چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔

معراج العاشقین منسوب بہ خواجہ گیسو دراز کے چند جملے دیکھیے:-

۱۔ جبرئیل نے نبی علیہ السلام کو خوشی خبری کا حال سنائے۔

۲۔ جبرئیل بولے ہم نے دودھ پئے سو خوب کیے

۳۔ اللہ کی محبت نے خواہش کیا بندوں کو فراز کرنے کو۔ [27]

شہاب الدین قریشی کی تصنیف "بھوگ بل" (تصنیف ۱۰۲۳ھ) کے دو شعر ملاحظہ ہوں:-

خدا نے قریشی کوں فرصت دیا + تو سب کو ک کوں نظم دکھنی کیا

سو چاروں کا بھوگی سچا ہے امیر + خدا نے عنایت دیا اس کی سیر [28]

۲۷ـــ معراج العاشقین منسوب بہ گیسو دراز۔ ص ۸۵ تا ۸۷۔ مخطوطہ نمبر ۲/۱۰۱۹۸۔ نیشنل میوزیم کراچی۔

۲۸ـــ شہاب الدین قریشی۔ بھوگ بل۔ ص ۶ تا ۱۹۵۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۱۸۔ نیشنل میوزیم کراچی۔

ملا وجہی کی "سب رس" اردو نثر کی قدیم کتابوں میں سے ہے۔ اس کے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ ان چورنے ان حرام خورنے چاڑاں کھایا۔

۲۔ جنوں کے دل میں دانش نے کیا تھا گھر۔

۳۔ ان نے سینا کہ دل اتال جاتا ہے۔ ۲۶

کمال خاں رستمی بیجاپوری کے "خاور نامہ" (۱۰۵۹ھ) کے مصرعے ہیں:۔

۱۔ دلاور نے باندھیا کمر کے اوپر

۲۔ جو مالک نے اس ادمیاں کوں دیکھیا ۳۰

باقر آگاہ کی تصنیف "عقاید مذہب امامیہ" (تصنیف ۱۰۷۵ھ) سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:۔

حضرت پیغمبرؐ (نے) فرمایے (فرمائے) کہ میں بجی (تجھے) بشارت دیتا ہوں لوں جان کہ اتال جبرئیل میرا (میرے) نزدیک آیے (آئے) تھے (تھے) ہور بولے (بولے) کہ خدائے (نے) تجے (تجھ) سلام بول کر بولیا ہے (ہے) کہ علی کوں بشارت دے۔ ۳۱

شیخ داؤد حقیقی کی "ہدایات ہندی" (تصنیف ۱۱۱۰ھ) کا شعر ہے:۔

کہ جوں حق تعالیٰ نے بولیا اہے

جو قرآن کے بیچ کھولیا اہے ۳۲

شاہ محمد حق نما کی "خزانۂ معرفت" (تصنیف ۱۱۸۱ھ) کا شعر ہے:۔

سب او خدانے رکھیا ہے چھپا ٭ سکل بعید اس کا کسے نا دیکھا ۳۳

---

۲۶ ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۱۲-۱۳۲۔

۳۰ کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ۔ ص ۲۸۳-۶۹م۔

۳۱ باقر آگاہ۔ عقاید مذہب امامیہ ص ۲۳۹۔ مخطوطہ نمبر ۱/۸۹۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

۳۲ شیخ داؤد حقیقی۔ ہدایات ہندی۔ ص ۲۰۶۔ مخطوطہ نمبر ۱/۶۴۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

۳۳ شاہ محمد حق نما۔ خزانۂ معرفت۔ ص ۷۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۲۵۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی۔

یقین دکنی کی "نقد المبین" (تصنیف ۱۱۸۲ھ) کا ایک شعر ہے :-

کس نے غسل پانی میں کیا جا

کیا سردی نے اس کے تن میں آجا ۳۴

ولی کا شعر ہے :-

ولی جن نے نہ باندھیا دل کوں اپنے نونہالاں سوں

نہ پایاں نے پھل ہرگز جہاں میں زندگانی کا ۳۵

یہ تمام دکنی اردو کی مثالیں ہیں جو اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں کہ 'نے' دکنی میں نہ صرف موجود تھا بلکہ اس کا استعمال فاعلی علامت ہی کے طور پر ہوتا تھا۔ یہ امر دیگر ہے کہ کہیں کہیں اس کا حذف بھی روا تھا (اس کی مثالیں شمالی ہند میں بھی ملتی ہیں) نیز کہیں کہیں ایسے موقعوں اور افعال کے ساتھ بھی 'نے' استعمال کیا جاتا تھا جن کے ساتھ اب 'نے' استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً مغل لایا، کے ساتھ 'نے' نہیں لا سکتے لیکن دکنی میں کہیں کہیں اس کے ساتھ بھی 'نے' استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 'سب رس' کے یہ دو جملے دیکھیے :-

۱- خدا نے اسے یاں لیایا۔

۲- دل کوں تو خدا نے باغ میں لیایا ۳۶

'نے' کے سلسلے میں انشا کی تصریحات کا اندراج یہاں برمحل معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"نے کہ دلالت بر فعل متعدی کند مخصوص بصیغۂ ماضی در جمیع افعال الا در 'لایا' که بظاہر متعدی نموده و دراصل لازم باشد۔ مانند 'لایا زید عمرو کو'۔ گوینده که 'الشش نے آیا زید عمرو کو' باشد و در 'بولنا' خلاف قیاس است، و صیغۂ حال و مستقبل،

---

۳۴ یقین دکنی۔ نقد المبین۔ ص ۲۳۔ مخطوطہ نمبر ۱/۱۹۶۴۔ نیشنل میوزیم کراچی۔

۳۵ ولی۔ کلیات ولی۔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت سوم ۱۹۵۴ء

۳۶ ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۲۲۱-۹۱۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت چہارم ۱۹۷۷ء

لازم و متعدی ہیئت صورت آید مثلاً 'زید جاتا ہے' یا 'آتا ہے' لازم،
اور 'زید لوٹتا ہے'، اور 'زید چھانتا ہے' متعدی، اور 'زید جاوے گا اور
عمرو آوے گا' لازم اور 'زید بچاوے گا'، اور 'زید پڑھے گا' متعدی" ۳۷

فعل 'لایا' کے ساتھ اب 'نے' استعمال نہیں ہوتا لیکن دکنی میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح فعل 'آیا'
اور 'چلا' کے ساتھ بھی 'نے' استعمال نہیں ہوتا لیکن دکنی میں کہیں کہیں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ کمال خاں رستمی
کے "خاور نامہ" کا ایک مصرعہ ہے :۔

جو مالک نے آیا بدرگاہِ شاہ ۳۸

علی عادل شاہ ثانی شاہی کا مصرع ہے :۔

سکھی سوڑلے چلی ہے چنچل نے گمان کر ۳۹

ہر چند کہ اب ایسے موقعوں پر 'نے' فاعل کے ساتھ استعمال نہیں کرتے تاہم دکنی اردو میں جہاں بھی ایسا استعمال
ملا ہے ہر جگہ 'نے' اپنے فاعل پر دلالت کرتا ہے یعنی فاعلی علامت کے طور پر ہی آیا ہے۔

مؤلفِ آئینِ اردو نے صراحت کی ہے کہ :۔

" جب الفاظ دل، طبیعت، جی بحالتِ فاعلیت استعمال کیے جائیں تو فعل
'چاہا' کے مثبت استعمال میں فاعل کے ساتھ علامتِ فاعل 'نے' استعمال
نہیں کرتے۔ جیسے میرا دل چاہا، میری طبیعت چاہی، اور منفی استعمال میں
'نے' مستعمل ہے جیسے میرے دل نے نہیں چاہا، میری طبیعت نے نہیں چاہا۔ میرے
جی نے نہیں چاہا" ۴۰

---

۳۷ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ جامع القواعد (حصۂ نحو) ص ۱۲۶ بحوالہ انشا۔ دریائے لطافت ص ۱۴۸۔

۳۸ کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ ص ۳۸۳۔ ایجوکیشنل پریس۔ کراچی۔ ۱۹۶۸ء

۳۹ علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی۔ ص ۱۷ مرتبہ سید مبارز الدین رفعت۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی۔ ۱۹۶۲ء

۴۰ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ جامع القواعد (حصۂ نحو) ص ۱۲۷ بحوالہ آئینِ اردو ۲۱۸۔

محولہ بالا الفاظ پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی اسم، بحالتِ فاعلیت استعمال ہو تو فعل "چاہنا"، کے زمانۂ ماضی کے ساتھ علامتِ فاعل "نے"، مثبت استعمال میں، داخل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن منفی استعمال کی صورت میں علامتِ فاعل "نے"، استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف دکنی میں "بولنا" اور "چاہنا" (منگنا، دکنی) کے مثبت استعمال کے ساتھ بھی بعض اوقات علامت فاعل "نے"، استعمال ہوئی ہے مثلاً معراج العاشقین کے جملے ہیں :-

۱۔ پیر حضرت نے تمام آج کی خبر بولے۔

۲۔ خدائے دوستاں نے بولے ہیں۔ [۱]

شاہی نے منگنا (بمعنی چاہنا) کے ساتھ "نے"، استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو :-

ع سدا سورج نے منگے نور اسی تھر انگے [۲]

"نے"، کے بارے میں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ یہ فاعل کی علامت ہے اور مفعول کے ساتھ کبھی نہیں آتی۔ لیکن جب "مجھ" اور "تجھ"، کے ساتھ کوئی صفت آتی ہے تو "نے"، استعمال ہوتا ہے۔ جیسے تجھ کم بخت نے یہ کب کہا تھا۔ مجھ خاکسار نے ایسا کیا۔ یا جیسے حاتم کا مصرع ہے :-

تجھ عشق نے یہ پھر سر نو سے جواں کیا [۳]

البتہ بعض جگہ صفت بطور فاعل استعمال ہوئی ہے اور اس پر "نے"، داخل کیا جاتا ہے مثلاً "باغ و بہار"، کا ایک جملہ ہے :- فقیر نے لاچار، خاطر سے مہمان کی، استقبال کر کر، نہایت تپاک سے، برابر اس جوان کے لا بٹھایا۔ [۴]

"سب رس"، کے چند جملے دیکھیے :-

① ان چور نے ان حرام خور نے چاردی کھایا۔ ② رقیب نے، روسیاہ نے بے نصیب نے بولیا [۵]

---

[۱] معراج العاشقین۔ ص ۲۱ - ۳۲ (منسوب بہ گیسو دراز) مرتبہ تحسین سروری۔ دکن دار الاشاعت کراچی۔ سنہ ۱۹۶۱ء

[۲] علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیات شاہی۔ ص ۱۲۳۔ مرتبہ سید مبارز الدین رفعت۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۲ء

[۳] ظہور الدین حاتم۔ شاہ حاتم، حالات و کلام۔ ص ۶۶ مرتبہ غلام حسین ذو الفقار۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور، سنہ ۱۹۶۴ء

[۴] میر امن۔ باغ و بہار۔ ص ۳۳۔ حمایت الاسلام پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۶ء

[۵] ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۷۱ - ۱۳۲۔ مرتبہ مولوی عبد الحق۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ دکنی میں علامتِ فاعل "نے" ایسے موقعوں پر بھی استعمال کی گئی ہے جہاں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گجراتی اور راجستھانی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے افعال اور ان کی ساخت سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آریائی زبان کو جدید (جدید ہند آریائی) کی منزل پر مجموعی طور سے صیغۂ ماضی کے لیے فعل لازم کی صورت میں معروف ساخت ملی (جس میں فعل صفت کی حیثیت رکھتا اور فاعل کی تعریف کرتا تھا) اور فعل متعدی کی صورت میں مجہول ساخت ملی (یہاں فعل صفت بن کر مفعول کی تعریف کرتا تھا) یا ایک مشترک ساخت ملی (اس میں فعل کا عمل کسی مفعول سے قطع نظر بجائے خود قایم ہوتا تھا اور مفعول ظرفی حالت میں بدل جاتا تھا مثلاً (معروف ساخت) So-gateh برج بھاشا "سو گیو" So gayau، ہندی "وہ گیا"۔ (مجہول ساخت) tena khaktam khaditam = ہندی "اس نے بھات کھایا"۔ (مشترک ساخت) tena Roti ka khadite = ہندی "اس نے روٹی کھائی"۔ tena rajanah krte drstam ہندی "اس نے راجا کو دیکھا"۔ یہ استعمالات مغربی ہندی اور مشرقی پنجابی میں محفوظ رہے۔" مزید لکھتے ہیں:۔

"گجراتی، راجستھانی میں مجہول اور مشترک ساختیں ضم ہو کر ایک ہو گئی ہیں مثلاً گجراتی tene stri ne mari "اس نے عورت نے ماری" (مارا گیا عورت)۔ اس کو ہندی کے ممکن جملے "اس نے استری کو ماری" (مارا گیا) کے ہمسر قرار دیا جا سکتا ہے۔"[۴۶]

اسی سے غالباً دکنی نے "نے" کا یہ استعمال لیا مثلاً "اس خاطر زلیخانے کیا کری" (کیا کر ڈالے)۔ یا مثلاً "غمزے نے نظر کوں اچک لے کر گیا"۔ یا مثلاً ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں ایک جملہ اسی قسم کا دیا ہے: "اس نے بندر نے ماری۔" دکنی کے تقلید و تتبع میں یہ استعمال شروع شروع شمالی ہند میں بھی رائج ہو گیا مگر بعد میں اردو کے خلاف پاکر ترک کر دیا گیا۔

ہریانی میں بھی "نے" استعمال ہوا ہے۔ اس زبان کا مشہور شاعر دکمیر کہتا ہے:۔

سب تری ڈوڈی میں لٹواویں ۔ تجھی نے پوجیں تجھی نے گاویں

میرے صاحب یو کے کینا ۔ مجھ نے دیس نکالا دینا [۴۷]

---

[۴۶] سنیتی کمار چیٹرجی۔ ہند آریائی اور ہندی (مترجمہ عتیق احمد صدیقی) ص ۱۱۶ تا ۱۱۶ ترقی اردو بورڈ۔ حکومت ہند۔ لبرٹی آرٹ پریس دہلی

[۴۷] پروفیسر احمد امان اللہ خاں۔ مضمون "نے علامتِ فاعل؟" رسالہ "اردو" جنوری سنہ ۱۹۵۲ء ص ۱۰۰۔

"نے" اسی قسم کا پنجابی مثال سنیتی کمار چٹرجی نے دی ہے "اس نے عورت نے ماری"؛ اس میں پہلی جگہ "نے" فاعلی علامت کے طور پر اور دوسری جگہ "کو" کے معنوں میں ہے۔ جب کہ دکنی اس معاملے میں تھوڑا فرق کرتی ہے یعنی دکنی میں "نے"، "کو" کے ہم معنی نہیں۔ "نے"، فاعلی کے طور پر ہے سوائے اس کے کہ وہ اس علامت کو ایسے موقعوں پر بھی ذکر کر دیتے ہیں جہاں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اب ایسے موقعوں پر "نے"، استعمال نہیں ہوتا۔

پروفیسر امان اللہ نے لکھا ہے کہ "نے"، ہریانی میں ہر جگہ "کو" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دکھنیم کے تین شعر نقل کیے ہیں۔ دو اوپر نقل کر دیے گئے تیسرا یہ ہے :۔

نبی صاحب کے چار سپائی + جنہاں نے ملکوں دھوم مچائی

لیکن یہ تیسرا استعمال "کو" کے معنوں میں نہیں بلکہ علامتِ فاعل کے طور پر ہوا ہے۔

پروفیسر صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "نے" دراصل "نوں" کی ایک شکل ہے۔ پنجاب میں دونوں کا استعمال بعض نحوی صورتوں میں یکساں معنی دیتا ہے۔ ہریانی میں "نے" ہر موقع پر "کو" کے معنوں میں آتا ہے۔" [۴۸] ان کا کہنا ہے کہ "نے"، اور "نوں" دونوں میں سے اردو میں صرف "نے" باقی رہا اور وہ بھی فعل متعدی کی پانچ ماضیوں کے ساتھ۔ "نوں" کے لیے اردو میں گنجائش نہ رہی اس لیے اس کا بدل "کو" (برج بھاشا) ہو گیا۔" اس سلسلے میں انہوں نے ہریانی میں "نے"، بمعنی "کو" کے استعمال کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "نے"، بہ خفیف سے تغیر کے ساتھ "نوں" کے معنی دیتا ہے۔" [۴۹] اردو میں "نے"، "نوں" کے معنوں میں کہاں کہاں استعمال ہوا ہے؟ اس سلسلے میں انہوں نے قدیم اردو ادب سے کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی۔ اس لیے کہ ایسی مثال اردو ادب کے قدیم ادوار میں انہوں نے تلاش ہی نہیں کی صرف پنجابی اور ہریانی (اور چند خود ساختہ جملوں) کو سامنے رکھ کر اردو کے بارے میں فیصلہ کر لیا اور نتائج پیش کر دیے۔ اگر وہ قدیم اردو ادب کا جائزہ لیتے تو ضرور اندازہ ہو جاتا کہ "نے"، اردو کے قدیم دور کے نمونوں میں "کو" کی جگہ نہیں بلکہ فاعلی علامت کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ قدیم اردو ادب میں ایسا بھی نہیں ہوا کہ پہلے "نے"، بطورِ علامتِ فاعل اور بطورِ علامتِ مفعول دونوں کی استعمال ہوتا رہا بعد میں برج بھاشا سے "کو" لے کر "نے"، کو صرف فاعل کے ساتھ منسوب کر دیا گیا اور "کو" مفعول کے ساتھ۔ اس لیے کہ "کو" قدیم اردو ادب میں اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ "نے"۔ [۵۰]

[۴۸-۴۹] پروفیسر امان اللہ خاں۔ رسالہ اردو۔ ص ۹۸-۹۹، ص ۱۰۰۔ جنوری ۱۹۵۲ء۔

[۵۰] اس سلسلے میں "نے" اور "کو" کی صرفی بحثوں میں استعمالات کے نمونے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

ے نحوی
۲۱ عدد

آخر میں علامتِ فاعل "نے" کے سلسلے میں دو ایک وضاحتیں اور بنا سب معلوم ہوتی ہیں۔ مؤلفِ "آئینِ اردو" لکھتے ہیں کہ :-

"ماضی مطلق میں جب فاعل کے ساتھ 'نے' آتا ہے تو کسی صیغے میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ہر حال میں واحد مذکر غائب کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے اس نے کہا۔ تو نے کہا۔ میں نے کہا۔ ہم نے کہا۔" [۵۱]

دکنی اردو اور شمالی ہند کے ابتدائی دور کی اردو اس معاملے میں بے قاعدگی کا اظہار کرتی ہے۔ چنانچہ فاعل مذکر ہونے کی صورت میں فعل مذکر اور فاعل مونث کی صورت میں فعل مونث استعمال کرتی ہے مثلاً مرد نے کہا۔ عورت نے کہی۔ بادشاہاں نے چھوڑے۔ عورتاں چلیاں۔ وغیرہ۔ مثالیں پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ مؤلفِ آئینِ اردو کے مولہ بالا اقتباس کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب نے صراحت فرمائی ہے کہ :-

"فعل 'کہا' کے ساتھ بے شک یہی صورت ہے لیکن یہ کلیہ نہیں بن سکتا۔ اصول یہ ہے کہ علامتِ فاعل آنے کے بعد فعل کا رشتہ فاعل سے منقطع ہو کر مفعول سے قائم ہو جاتا ہے اور فعل جنس وعدد میں مفعول کے مطابق ہو جاتا ہے مثلاً اس نے بات کہی۔ اس نے کہانی کہی۔ تو نے کہانی کہی۔ ہم نے نعرہ کہا۔ تم نے یہ جملے کہا وغیرہ اور مولف آئینِ اردو کی مثال بھی اس قاعدہ کلیہ کے تحت آتی ہے۔" [۵۲]

چنانچہ اب عام معینہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر فاعل پر "نے" داخل کیا جائے اور اس کے ساتھ مفعول نہ ہو تو کسی صیغے میں بھی فعل میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ ہر حال میں فعل واحد مذکر غائب کی صورت میں استعمال ہوتا ہے البتہ اگر مفعول بھی موجود ہو تو فعل کے مختلف صیغوں میں تبدیلی آجاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ مفعول کی موجودگی

---

۵۱ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ جامع القواعد (حصہ نحو) ص ۱۲۹ بحوالہ آئینِ اردو ص ۱۱۰

۵۲ ایضاً ص ۱۲۹۔

کے باعث ہوئے، یہ تغیر لاتا ہے کہ فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کرکے مفعول کے ساتھ قایم کردیتا ہے اور فعل جنس و عدد کے اعتبار سے فاعل کے بجائے مفعول کی مطابقت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "معجزۂ انار" (تصنیف ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء) کا مصرع ہے:۔

خدا نے بہوت حسن دیتا جمال [۵۳]

یہاں فعل "دیتا" اپنے مفعول "حسن" کی مطابقت میں واحد مذکر آیا ہے۔ اب ذرا تاباںؔ کا یہ شعر دیکھیے:۔

پہنچی نہ تجھ کو ہائے میرے حال کی خبر
قاصد گیا تھا ان نے بھی اپنی ہی کچھ کہی [۵۴]

دوسرے مصرع میں "اپنی" کی مطابقت میں فعل بھی واحد مونث استعمال ہوا ہے حالانکہ فاعل واحد مذکر ہے لیکن علامت فاعل "نے" اس کا رشتہ فعل سے منقطع کردیا ہے۔ نیز یہ بھی مطابقت ہی کا اثر ہے کہ بعض جگہ قدیم شعرا و اُدبا نے فعل کو جمع مونث بھی استعمال کیا مثلاً حاتمؔ کا مصرع ہے:۔

تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں [۵۵]

دردؔ کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ آنکھوں نے پھر یہ اور ہی آنکھیں دکھائیاں ہیں
۲۔ پھر سب تمہاری باتیں اب ہم نے پائیاں ہیں [۵۶]

دونوں جگہ مفعول کی مطابقت میں فعل جمع مونث (مچائیاں ہیں، دکھائیاں ہیں، پائیاں ہیں) استعمال ہوا ہے۔ ایک مصرع اور دیکھیے:۔

فرشِ راہ آنکھیں تو کیں میں نے پہ پھیرے مژگاں [۵۷]

۵۳۔ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ ص ۱۵۴ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۹ء

۵۴۔ تاباںؔ۔ دیوانِ تاباںؔ۔ ص ۱۹۰۔ مرتبہ عبدالحق (مولوی) انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن سنہ ۱۹۳۵ء

۵۵۔ شاہ حاتمؔ، حالات و کلام۔ ص ۱۴۴۔ مرتبہ غلام حسین ذوالفقار۔ جدید اردو ٹائپ پریس کراچی سنہ ۱۹۶۴ء

۵۶-۵۵۔ دردؔ۔ دیوانِ دردؔ۔ ص ۹۳-۹۸ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۲ء

"آنکھیں" کی مطابقت میں فعل جمع مونث آیا ہے "گئیں" (بھی گئی ہیں)۔ اگر آنکھوں کی جگہ کوئی مذکر مفعول ہوتا مثلاً 'دل' وغیرہ تو فعل بھی بدل کر واحد مذکر ہو جاتا مثلاً میر کا یہ شعر دیکھیے:-

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ

ایک عالم کا روشناس کیا [57]

"کربل کتھا" کا ایک جملہ ہے:-

حضرت فاطمہؓ نے ایک شخص اون (ان) کے بولانے (بلانے) کوں بھیجا۔ [58]

اس جملے میں بھی فعل اپنے مفعول کے تابع ہے جو "نے" کے باعث ہے۔ اور یہی قاعدۂ کلیہ ہے لیکن اب افعال کی جمع اردو میں عام طور پر مستعمل نہیں بلکہ فعل اصلی واحد آتا ہے اور اس کے ساتھ فعلِ امدادی کا جمع کا صیغہ، فعل اصلی پر اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ سونیا چرنی کووا نے بھی اس سلسلے میں مفید بحثیں کی ہیں اور امثال بھی پیش کی ہیں البتہ ان کا تعلق زیادہ تر زمانہ حال کے نحوی قاعدوں اور ادب سے رہا ہے [59]

---

[57] میر - کلیاتِ میر ص۱۲ - باہتمام کیری داس - مطبع نولکشور لکھنؤ - ۱۹۴۱ء

[58] فضل علی فضلی - کربل کتھا ص۶۷ - مرتبہ مالک رام و مختار الدین - دیال پرنٹنگ پریس دہلی - ۱۹۶۵ء

[59] سونیا چرنی کووا - اردو کے صیغے ص۲۰۰-۱۵۵ - دارالاشاعت ترقی ماسکو - زوبوسکی بلوار ۲۱ - ماسکو -

فعل و فاعل کی مطابقت

فعل وہ ہے جس سے کسی کام کا کرنا، ہونا یا سہنا ظاہر ہو۔ معنوں کے لحاظ سے فعل کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) لازم (۲) متعدی (۳) ناقص۔

فعل میں علاوہ جنس و تعداد کے تین چیزیں اور بھی پائی جاتی ہیں:۔

(۱) طور (۲) صورت (۳) زمانہ

طورِ فعل وہ حالت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کام خود فاعل سے صادر ہوا یا کام کا اثر کسی پر واقع ہوا۔ فعل کے طور دو ہیں:۔

(۱) معروف (۲) مجہول

جب فعل کے ساتھ فاعل بھی مذکور ہو تو اسے معروف کہتے ہیں مگر جب صرف وہ شے یا شخص معلوم ہو جس پر اثر واقع ہوا ہے اور فاعل معلوم نہ ہو تو اسے مجہول کہیں گے جیسے "اسے خط سنایا گیا" یہاں سنانے والا یعنی فاعل نامعلوم ہے اس لیے اسے مجہول کہتے ہیں۔

فعل لازم میں فعل اور فاعل کے ملنے سے جملہ مکمل ہو جاتا ہے۔ جب جملے میں فعل و فاعل کے علاوہ مفعول بھی ہو تو وہ متعدی کہلاتا ہے۔ اگر دو مفعول ہوں تو متعدی المتعدی۔

لازم اور متعدی کی مختصر طور پر اس طرح بھی تعریف کی جاتی ہے کہ جو فعل صرف فاعل کو چاہے وہ لازم ہے اور جو فاعل اور مفعول دونوں کو چاہے وہ متعدی ہے۔ فعل متعدی کی ایک یہ بھی شناخت ہے کہ کلام میں ماضی مطلق کے فاعل کے بعد "نے" آتا ہے ..... مگر لانا، لے جانا، بولنا مستثنیٰ ہیں اور پکارنا اور سیکھنا اور پڑھنا ایسے فعل ہیں کہ ان کے فاعل کے ساتھ "نے" آتا بھی ہے اور نہیں بھی آتا [۱]

فتح محمد خاں جالندھری لکھتے ہیں کہ متقدمین کبھی افعالِ متعدی کے صیغہ ہائے واحد متکلم سے علامتِ فاعل "نے" حذف بھی کر دیتے تھے مگر متاخرین علامتِ فاعل بالالتزام استعمال کرتے ہیں اور اب اس کا حذف جائز نہیں۔

---

[۱] فتح محمد خاں جالندھری۔ مصباح القواعد حصہ صرف ص۱۳۱ اور مولوی عبدالحق کی قواعد اردو ص۱۰۲

ہاں مجا ہا کا فاعل اگر دل اور جی ہو تو محاورے میں 'دل چاہا' اور 'جی چاہا' بغیر 'نے' کے بولا جاتا ہے [۲]۔

'نے' کے استعمالات کے سلسلے میں اگرچہ صرف و نحو دونوں کے تحت الگ الگ بحث کی جا چکی ہے لیکن یہ چونکہ علامتِ فاعل ہے لہٰذا فعل و فاعل کی بحث میں اس کا بار بار ذکر ناگزیر ہے۔

اردو کا موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ فعلِ لازم میں، فعل اپنے فاعل کے تابع ہوتا ہے جب کہ فعلِ متعدی میں علامتِ فاعل کے داخل ہو جانے سے فعل کا تعلق فاعل سے منقطع ہو کر مفعول کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فعل ہر اعتبار سے مفعول کی مطابقت کرتا ہے۔ قدیم اردو میں اس قاعدے کے ساتھ زیادہ تر عدم مطابقت کا اصول برتا گیا ہے۔ یعنی فعل لازم کی طرح فعلِ متعدی میں بھی فعل کو فاعل ہی کی مطابقت میں لایا گیا ہے۔ چنانچہ فاعل اگر جمع مذکر ہے تو فعل بھی جمع مذکر استعمال ہوا ہے، کہیں فاعل واحد مذکر ہے تو فعل میں تعظیماً جمع مذکر کا صیغہ لایا گیا ہے۔ کہیں فاعل واحد مونث ہے تو اس کی مطابقت میں فعل واحد مونث اور فاعل جمع مونث کی صورت میں فعل بھی جمع مونث استعمال کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مثالوں کے ذریعے بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

قدیم اردو کے مطالعے کے سلسلے میں اول دکنی کو لیں۔ 'کدم راؤ پدم راؤ' میں مطابقت دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ لیے بلیؔ پھل چھینکا پڑیا لوٹ کر

۲۔ سیانان کہاے ہور اپنا ایان

۳۔ لگا کون راوین دیوٗں مار کر [۳]

لیکن کہیں کہیں عدم مطابقت کی مثال بھی نظر آ جاتی ہے مثلاً ذیل کا مصرع:۔

امو لک تدرحیں دیے پاؤں تجہ [۴]

'قطب مشتری' میں بھی یہی صورت ہے۔ درج ذیل شعر دیکھیے:۔

---

[۲] فتح محمد خاں جالندھری۔ مصباح القواعد۔ حصۂ نحو ص ۶۷۔

[۳،۴] فخر دین نظامی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ص ۲۱۱-۲۱۱-۱۸۲-۱۸۱ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔

اُن کوں پتیا بات لولیا نہ جائے

الو کے کتے دل کوں کھو لیا نہ جائے

البتہ کہیں فاعل جمع مونث کی صورت میں فعلِ اصلی اور فعلِ امدادی دونوں جمع لائے گئے ہیں مثال کے طور پر "قطب مشتری" کا یہ شعر دیکھیے:۔

اتھا حوض ہور واں اتھیاں سندریاں

کہ پانی کنارے کھڑیاں تھیاں پریاں

یہ مطابقت اس درجہ ہے کہ فاعل کی مطابقت میں فعل کے علاوہ حرفِ تشبیہ اور حرفِ اضافت تک کی جمع لائی گئی ہے۔ اسی مثنوی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

پھریں چاند سیاں سندھریاں اس منے

ستارے نین کیاں پریاں اس منے

موجودہ قاعدہ یہ نہیں ہے۔ اس کے بجائے فعلِ اصلی واحد اور فعل امدادی جمع لایا جاتا ہے۔ اسی طرح حرفِ تشبیہ اور حرفِ اضافت کی جمع بھی استعمال نہیں ہوتی۔

اس مثنوی میں کہیں فاعل جمع مذکر کے ساتھ فعلِ امدادی جمع کے بجائے واحد آیا ہے۔ مثلاً یہ شعر:۔

دھرے نار دو مشتری شاہ نام

کتے بادشاہاں ہے اس کے غلام ؎۵

شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری کا رسالہ "شرح مرغوب القلوب" کا جملہ ہے:۔

پیغمبر کہے خدا کی آشنائی جے کوئی پوچھتا ہے الو کیاں لوں رہ کر الوں تھے لوں اس سوں چپ نکو اچھ ؎۶

؎۵ ملا وجہی۔ قطب مشتری صفحہ ۲۱۔ ۲۱۔ ۲۱۔ ۲۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۵۳ء

؎۶ محی الدین زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ صفحہ ۲۵ نشاط پریس کراچی۔ ۱۹۶۰ء

ملا وجہی کی نثری تصنیف "سب رس" اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب "معراج العاشقین" (جو (خواجہ گیسو دراز کی نہیں ان کے بہت بعد کے دور کی ہے) میں ایک بالکل ہی جداگانہ صورت نظر آتی ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اردو کا عام نحوی قاعدہ یہ ہے کہ جس جملے میں فاعل کے علاوہ مفعول بھی ہو اس میں فعل اپنے فاعل کی جگہ مفعول کی مطابقت کرتا ہے۔ لیکن دکنی کا عام متعین قاعدہ یہ نہیں ہے۔ اوپر جو مثالیں نقل کی گئیں ان سے اندازہ ہوتا ہے لیکن درج ذیل مثالوں سے یہ بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں افعال متعدی میں فعل لازم کی طرح، فعل اپنے فاعل ہی کی مطابقت کرتا ہے، مفعول کے ساتھ مطابقت عام نہیں ہے۔ "سب رس" کے چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ اس خاطر زلیخا نے کیا کری۔

۲۔ یو بات ہوئے پچھیں غمزے نے نظروں دلیں حسن کے حضور لیایا۔

۳۔ بادشاہاں نے دنیا کا حفظ چھوڑے خلق کا دل توڑے۔

۴۔ حسن دھن، من موہن، جگ جیون نے بولی۔ [1]

ان جملوں سے عدم مطابقت فعل و مفعول نمایاں ہے۔ سب میں فعل اپنے فاعل کے مطابق استعمال ہوا ہے۔

فعل متعدی کا ایک قاعدہ، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا یہ بھی ہے کہ جن جملوں میں فاعل پر "نے"، داخل کیا جاتا ہے ان میں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فعل کا تعلق فاعل سے منقطع کر کے مفعول کے ساتھ قائم کر دیتا ہے۔ اگر مفعول ایک سے زائد ہوں تو فعل اپنے قریب ترین مفعول کے مطابق لایا جاتا ہے لیکن مندرجہ بالا جملوں میں "نے" کا یہ اثر بھی نظر نہیں آتا اور فعل بدستور اپنے فاعل سے مطابقت رکھتا نظر آ رہا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ فاعل مونث کے ساتھ فعل بھی مونث استعمال ہوا ہے اور فاعل جمع مذکر کے ساتھ فعل کا بھی صیغۂ جمع مذکر استعمال ہوا ہے۔

---

[1] ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۹۱ تا ۹۰۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۵۲ء

"معراج العاشقین" منسوب بہ گیسو درازؒ کے چند جملے ملاحظہ ہوں :-

۱- خدائے تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمائے ہیں۔

۲- یوں حضرت اپنی مبارک زبان سوں حضرت بی بی عائشہؓ نے کہے ہیں۔

۳- سبحی حضرت نے تمام آج کی خبر بولے۔ ؁۸

اسی طرح کمال خاں رستمی کے "خاور نامہ" میں جہاں مطابقت نظر آتی ہے وہاں عدم مطابقت کی مثالیں بھی مفقود نہیں ہیں۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں :-

۱- جتے پہلواں دیکھ اس یوں کہے۔

۲- جو او بد گہر نے سبھی ابد لگام۔

۳- کہے یوں علیؓ نے بستیاں گرد ؁۹

ان کے یہاں بھی فاعل جمع مونث کی صورت میں فعلِ امدادی کے ساتھ ساتھ فعلِ اصلی اور حرفِ اضافت کی بھی جمع استعمال ہوئی ہے۔ دو مصرعے درج ذیل ہیں :-

۱- اچھیں گیاں اگر تجھ کوں بھی خواہراں۔

۲- شنے (سونے) کیاں شمع جلتیاں تھیاں واں چہار ؁۱۰

علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کے بھی چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

۱- سدا سورج نے منگے نور اسی تھر لگے۔

۲- سنی سکھی جب انتی تزک کرمی کروں گی اپنا پکارا

۳- عنایت کیے شاہ کوں ذوالفقار

؁۸ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (منسوب)۔ معراج العاشقین ص۲۱-۲۲-۲۳۔ دکن دارالاشاعت کراچی سنہ ۱۹۶۱ء

؁۹ کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ ص۵۶-۱۲-۲۹۔ مرتبہ شیخ چاند ابن حسین۔ ایجوکیشنل پریس کراچی سنہ ۱۹۶۸ء

؁۱۰ ایضاً ص۲۰۲-۵۲۶

۴- جتیاں اتھیاں بہت کیاں سکیاں کئی لاکھ حرفت کرمنا

۵- لیایاں بلا میرے کنے آن دلبرِ جانانہ را ۔۱۱

نصرتی کی "گلشنِ عشق" میں بھی یہی صورت ہے - چند مصرعے ملاحظہ ہوں:-

۱- دیکھے یو جو جتیاں نے مرشیاں کا حال

۲- ہوائے دکھ سوں خویشاں نے من لاعلاج

۳- نرن ہیں سو سب جل کیاں دھاراں دسیں

۴- ملیاں جب ڈھونڈ ڈھونڈ کے آیاں سو آٹ (آٹھ)

۵- لوہی کی لگیاں دیکھنے سب وہ باٹ ۔۱۲

بحری ولی کے معاصر ہیں۔ ان کے کلام سے بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

۱- کہیں اس باغ میں مالی شکی (سوکھی) ڈالی کاٹتے ہیں۔

۲- کدی کہتے تھے کہ بحری تری مری باتی

۳- اس نے سنگاب کوں شاہی دیے

۴- ہم نہ دیے آپ الہی دیے

۵- یو تینوں مل کیے مینخ مار کر گرد ۔۱۳

اضافت کے سلسلے میں ان کے یہاں بھی مثلِ امداد اس کے ساتھ فعل اصلی بھی جمع استعمال کیا گیا ہے، نیز حرفِ اضافت بھی جمع آیا ہے - چند مصرعے ملاحظہ ہوں:-

۱- سو سب سرن کرتیاں اتھیاں دیکھ اُس

۲-

---

۱۱ علی عادل شاہ ثانی شاہی - کلیاتِ شاہی ۔ ص ۱۲۶، ص ۱۲۲، ۱۳۰-۱۲۶، ص ۱۲۲ - مسعود پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۲ء

۱۲ ملک الشعرا ملا نصرتی ۔ مثنوی گلشنِ عشق ۔ ص ۷۰، ص ۷۰، ص ۱۰۹، ص ۱۷۱، ص ۹۸ ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سنہ ۱۹۵۲ء

۱۳ بحری ۔ کلیاتِ بحری ۔ ص ۲۵۱، ۲۶۶، ۲۶۶، ص ۱۵۸، ص ۱۷۹ ۔ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۹ء

۲۔ الس تیں بسر تیاں اتھیاں دیکھ اس

۳۔ نکر سیج باتی نگاراں سو بھتیاں

۴۔ نگر ناز کیاں شہر یاراں جو بھتیاں ۱۴

ولی کے دو مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ مکھ کو تیرے کہا ہوں آتش حسن

۲۔ ترے آنے کی باٹ اوپر بچھایا ہوں انکھاں اپنی ۱۵

ولی کے زمانے تک آتے آتے عدم مطابقت کی مثالوں میں کمی واقع ہوجاتی ہے البتہ شمالی ہند میں اردو کے دورِ قدیم میں یہی نامطابقت نظر آتی ہے جو دکنی و گجراتی اردو میں عام ہے۔ اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں سے چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ سبھی عورتاں بولے سن یو تبھی

۲۔ سلامت بی بی کا رہنے ان کیے

۳۔ خدانے بڑائی دیا ہے مدام ۱۶

فضلی کی "کربل کتھا" کے جملے دیکھیے :۔

۱۔ اور کہتیاں اے کاش ماں ہماری فاطمۃ الزہرا جیوتی ہوتی ..... یا مدینہ میں دادا کی قبر پر ہوتیاں، تا دردِ دل اپنا اوس قبر سے کہتیاں۔

۲۔ ہم بغیر تیرے دنیا میں کیونکر جو رہیں گیاں اور بغیر تیرے دیدار کے کیونکر زندگی کریں گیاں ۱۷

---

۱۴ بحری۔ کلیاتِ بحری۔ ص ۲۴۷۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ ۱۹۳۹ء

۱۵ ولی۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۵۴ء

۱۶ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ ص ۱۱۲-۱۲۸۔ نقوش پریس لاہور ۱۹۶۹ء

۱۷ فضل علی فضلی۔ کربل کتھا۔ ص ۸۹۔ دیال پرنٹنگ پریس۔ دلی۔ ۱۹۶۵ء

لیکن شمالی ہند میں عدم مطابقت کی مثالیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ حاتم کا مصرع ہے :۔

رات ہم سپہر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

اپنی کا ایک اور مصرع ہے :

بلبل کو سب گلوں سے ہوا ہے عزیز چشم۔ ۱۸

قائم کے دو مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ سنتا تھا ہم بھی کہ ہے شہر زندگی شیریں

۲۔ کھول کر آنکھیں جدھر دیکھے تھا میں برسات تھی ۱۹

البتہ حذفِ "نے" کی مثالیں شمالی ہند میں عام ہیں۔ اس کی مثالیں "نے" کی بحث میں تفصیل سے درج کی گئی ہیں۔ ناسخ سے قبل تک یہی صورت تھی کہ علامتِ فاعل کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کا حذف بھی جائز تھا البتہ ناسخ نے اس کا بیان فرض کر دیا۔ مثلاً "میں کہا" کی جگہ "میں نے کہا" اور "ہم دیکھا" کی جگہ "ہم نے دیکھا"۔ ۲۰

جہاں تک فعل کی جمع کا تعلق ہے دکنی کی تقلید و تتبع میں شمالی ہند میں بھی کچھ عرصے تک یہی صورت رہی۔ حاتم کے شاگرد، تاباں کا شعر ہے :۔

افسوس اے صنم تم ایسے ہوئے ہو اب تو

ملتے ہو غیر سے جا ہم سے رکھا نہاں ہیں ۲۱

میر کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں

۱۸۔ ظہور الدین حاتم ۔ دیوان زادہ۔ ص ۸۱ مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۷۵ء

۱۹۔ قائم ۔ دیوانِ قائم ص ۱۸۴-۲۷۔ مشمولہ اردوئے معلی (قائم نمبر)۔ مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی یونیورسٹی

۲۰۔ مسز حسین بانو بیگم حسین۔ ناسخ اور ان کے تلامذہ ص ۱۷ (مقالہ برائے پی ایچ ڈی) زیرِ نگرانی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ سندھ یونیورسٹی۔

۲۱۔ تاباں ۔ دیوانِ تاباں۔ ص ۱۹۸۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ دکن۔ سنہ ۱۹۳۵ء (مرتبہ مولوی عبدالحق)۔

۲۔ ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں ۲۲

سودا کے بھی دو شعر یہاں نقل ہیں :۔

۱۔ وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

۲۔ خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں

اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں ۲۳

میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کا شعر ہے :۔

ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں

پھریں اپنے جوبن پہ اتراتیاں ۲۴

میر شیر علی افسوس کی "آرایشِ محفل" کا جملہ ہے :۔

حمام میں نہانے کے لیے جاتیاں ہیں، خاوند کو اصلاً و مطلقاً خاطر میں نہیں لاتیاں ۲۵

افعال کی جمع کا یہ قاعدہ شمالی ہند میں عرصے جاری رہا تا آنکہ تحریکِ اصلاح کے تحت میں اس قاعدے میں ترمیم کر دی گئی۔ چنانچہ ناسخ نے جمع مونث کے صیغوں کے ساتھ فعل اول میں جمع کو ترک کیا اور فعل امدادی میں برقرار رکھا مثلاً 'بہتیاں ہیں کی جگہ بہتی ہیں' 'کہتیاں ہیں کی جگہ کہتی ہیں' 'بولتیاں ہیں کی جگہ بولتی ہیں' اختیار کیا ۲۶

---

۲۲ میر تقی میر۔ کلیاتِ میر ص ۲۵-۲۴ ۔ مطبع نولکشور۔ لکھنؤ۔ ۱۹۴۱ء

۲۳ مرزا رفیع سودا۔ کلیاتِ سودا ص ۱۴۴-۱۵۹ مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔

۲۴ میر حسن ۔ مثنوی سحر البیان۔ ص ۴۰ ۔ مطبوعہ نامی پریس لاہور۔ اشاعتِ اول دسمبر ۱۹۶۴ء

۲۵ میر شیر علی افسوس۔ آرایشِ محفل۔ ص ۲۳۱ ۔ (ترجمہ خلاصۃ التواریخ)۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ اشاعتِ اول ۱۹۶۳ء

۲۶ مسز حسین بانو بیگم حسین۔ ناسخ اور ان کے تلامذہ (پی ایچ ڈی کا مقالہ)۔ ص ۱۷ سندھ یونیورسٹی۔ جامشورو۔

مولانا شیرانی کو ایسی اصلاحات سے اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ :-

"انہوں نے (اردو شعرا نے) اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح و ترمیم نے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری و بے ربطی پیدا کر دی ہے۔ قدیمی اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی جامع، مفید اور کار آمد تھے۔" ۲۷

اس سلسلے میں شیرانی نے جمع کے قاعدے کے تحت افعال کی جمع کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ :-

"پرانی جمع کے قاعدے کو انہوں نے بالکل بیکار اور باطل کر دیا۔ اقلیم زبان سے حرف علت اور نون غنہ کے اخراج میں ہم ان سے متفق ہو سکتے ہیں لیکن افعال و اسماء سے جمع مونث کے ترک کرنے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا ہے۔" ۲۸

حالانکہ جدید دبستانِ لسانیات کا امام یسپرسن، زبانوں میں اس قسم کی تبدیلیوں کو زبان کی برتری، تفوق اور اصلاح کی ایک اچھی اور صحت مند علامت قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل سوال جس کی کوئی اہمیت ہے یہ ہے کہ زبان میں تغیر کا رخ ترقی کی طرف ہے یا تنزل کی طرف؟ زبان روپ بدل کر آگے بڑھتی ہے یا پیچھے ہٹتی ہے؟ اس میں ابتری و بے ربطی رونما ہوتی ہے یا برتری و ہمواری؟

یسپرسن کا کہنا ہے کہ مختلف زبانوں کے تاریخی ارتقا کے جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صرفی نحوی اصول کے لحاظ سے زبان کا عام و فطری رجحان ہے کہ وہ ابتری سے برتری کی طرف قدم بڑھائے اور ناہمواری (Chaos) سے ہمواری (Cosmos) کی طرف۔ قدیمی اصولوں کو جن پر زبان کی تعمیر ہوئی جامع، مفید اور کار آمد بتانا جدید نظریۂ ارتقا کے منافی ہے۔ یسپرسن کا کہنا ہے کہ آریائی زبانوں کے قدیم ادوار کا جدید ادوار سے مقابلہ کرنے پر پتہ چلتا ہے

۲۷-۲۸ شوکت سبزواری۔ داستانِ زبان اردو ص ۱۴۱ بحوالہ شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔

کہ زبان کے جدید ادوار کی صرفی شکلیں مختصر، کم تر، سادہ، باقاعدہ اور کس قدر عام ہیں۔ اس کے مقابلے میں قدیم دور کے صیغے اور ان کی صورتیں، طویل اور پیچیدہ، بے قاعدہ اور سنگین ہیں۔ یہ اصول تمام زبانوں میں تفاوتِ درجات کے ساتھ کارفرما رہا ہے۔ ۲۹

اردو بھی آریائی خاندان کی زبان ہے۔ ارتقا کا مذکورہ بالا اصول اس زبان میں بھی کارفرما رہا ہے۔ چنانچہ موجودہ مقالے میں اردو صرف و نحو کے تغیرات کا جو تاریخی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس سے یسپرسن کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ جدید ادوار کی صرفی شکلیں مختصر، کم تر، سادہ، باقاعدہ اور کس قدر عام ہیں۔ اردو زبان تراش خراش کی منزلوں سے گزرتی ہوئی برابر آگے بڑھتی رہی ہے۔ اس کے صرفی اصولوں اور نحوی قواعد میں جو تغیرات دیکھنے میں آئے ہیں وہ ابتری سے بہتری اور ناہمواری سے ہمواری کی طرف ہیں۔ تحریکِ اصلاحِ زبان نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور زبان کے مصلحین میں ناسخ کا نام بہت نمایاں ہے۔ بعض دوسری اصلاحات کے علاوہ انہوں نے جمع مونث کے صیغوں میں اختصار کر دیا، چنانچہ فعلِ اصلی کو جمع کے بجائے واحد استعمال کرنے پر زور دیا اور فعلِ امدادی کی جمع کو برقرار رکھا۔ آج تک اردو میں یہی قاعدہ چلا آ رہا ہے۔ اردو کے دورِ قدیم میں فعل و فاعل کی مطابقت اور بے موقع علامتِ فاعل کا جو استعمال دیکھنے میں آتا ہے یہ اردو میں کہاں سے آیا؟ اس سلسلے میں ماخذ کی بحث سے وضاحت ہو جائے گی۔

ماخذ

شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ سنسکرت میں افعال کے استعمال تین تھے۔ یہ "پر یوگ" کہلاتے تھے۔ معروف۔ مجہول۔ لازمی یا ذاتی۔

معروف استعمال میں فعل معروف ہوتا تھا اور اس کا فاعل کسی صلے یا علامت کے بغیر لایا جاتا تھا۔ اردو میں یہ استعمال پایا جاتا ہے۔ سورج نکلتا ہے۔ احمد کتاب پڑھتا ہے۔ ان مثالوں میں نکلتا ہے اور

---

۲۹ شوکت سبزواری۔ داستانِ زبانِ اردو ص ۱۱۵-۱۲۱۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۰ء

بحوالہ اوٹو یسپرسن۔ "Language, its Nature, Development & Origin."

پڑھتا ہے فعل معروف ہیں۔ سورج اور احمد ان کے فاعل ہیں۔ جو "نے" علامت آلی فاعل کے بغیر استعمال ہوئے ہیں۔

مجہولی استعمال میں فعل مجہول کے ساتھ ساتھ اس کے فاعل کا ذکر بھی کیا جاتا تھا اور اس پر "ینہ" علامت آلہ جو اردو "نے" کی اصل ہے اضافہ کر دی جاتی تھی۔ اس استعمال میں فعل، فاعل کی جگہ مفعول کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ اردو میں یہ استعمال نہیں۔

شوکت صاحب کا کہنا ہے کہ فعل مجہول ہر چند تذکیر و تانیث اور افراد و جمعیت میں مفعول یا نائب فاعل کے مطابق ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ فاعل مذکور نہیں ہوتا۔ جیسے کتاب پڑھی جاتی ہے۔ خط لکھا جاتا ہے۔ سنسکرت کا یہ استعمال اردو ماضی مطلق (اور ان تمام ماضیوں میں ہے جو ماضی مطلق سے بنائی گئی ہیں۔۔۔۔ اس نے کتاب پڑھی۔ شکاری نے ہرن مارا۔ ان مثالوں میں پڑھی اور مارا، افعال، کتاب اور ہرن کے مطابق ہیں۔ جو ان کے مفعول ہیں اور سنسکرت کی طرح "اس" اور "شکاری" پر جو معنوی طور پر ان کے فاعل ہیں "نے" علامت آلہ داخل کی گئی ہے۔ یہ استعمال سنسکرت "کرمنی پریوگ" (طور مجہول) کے مطابق ہے۔

تیسرا استعمال جسے سنسکرت میں "بھاوی پریوگ" کہتے ہیں لازمی افعال کے ساتھ خاص ہے۔ یہ ایک طرح سے فعلِ لازم کا مجہولی استعمال ہے۔ اس میں "ی" بڑھا کر فعل لازم کو مجہول بنالیا جاتا ہے اور عام معروف استعمال کے خلاف فعل ہر حالت میں ایک جیسا رہتا ہے۔ فاعل کے اختلاف سے اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اس کے فاعل پر مجہولی استعمال کی طرح آلی علامت (نے) بھی آتی ہے۔ मया गम्यते (میں نے گیا ہوں)۔ یہ استعمال اردو میں متروک ہے۔ البتہ ماضی متعدی میں جب مفعول پر "کو" ہوتا ہے تو فعل غیر متصرف ہو جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا۔ ماہرین لسانیات اردو کے اس استعمال کو ذاتی یا لازمی استعمال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سنسکرت کے "بھاوی پریوگ" سے ماخوذ ہے۔ جیسے شکاری نے ہرن کو مارا یا ہرنوں کو مارا۔ احمد نے کتاب کو پڑھا۔ لڑکی نے پھول کو کاڑھا یا پھولوں کو کاڑھا۔ ص[۳۰]

ص۳۰۔ شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۱۲-۳۱۱ ۔ دی ستی پریس ڈھاکہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء

گریرسن نے لکھا ہے کہ بول چال کی زبان میں ماضی مطلق فعل لازم کا استعمال بطور ذات دیکھا گیا ہے جیسے "کنھیا نے چلا" جو ترجمہ ہے "کرشنینہ چلیتم" کا۔ [۳۱] اس قسم کے استعمال کی مثالیں قدیم اردو میں عام طور پر مل جاتی ہیں مثلاً بے غم کھانے کے آدمی نے کیا سواد پانا ہے (سب رس)۔ عمر نے نفر کوں اپنے گھر لے گیا۔ (سب رس) اس قسم کی زیادہ مثالیں علامت فاعل "نے" کی صرفی و نحوی بحثوں میں زیادہ تعداد میں نقل کی گئی ہیں لہذا یہاں حذف کی جاتی ہیں۔

گریرسن کے مندرجہ بالا خیال سے اختلاف کرتے ہوئے شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ چیٹرجی نے گریرسن کی ہمنوائی میں اس استعمال کو عام بول چال میں صحیح بتایا ہے مگر یہ غلط ہے۔ شستہ اور معیاری زبان اور روزانہ بول چال میں "کنھیا نے چلا" کی جگہ "کنھیا چلا" کہتے ہیں۔ یہ معروف استعمال ہے۔

اردو میں مجہول استعمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجہول استعمال کی صورت میں مفعول، فاعل ہو جاتا ہے جو اصطلاح میں نائب فاعل کہلاتا ہے اور فعل تذکیر و تانیث میں اس کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن مفعول پر "کو" آ جانے کے بعد اس میں یہ صلاحیت نہیں رہتی کہ وہ فاعل کی جگہ لے سکے۔ اس لیے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اردو کے مجہولی استعمال کی کڑیاں اس طرح پر ہیں:۔

کرشنینہ پیشتا پچھتا۔ کرشن کرین پستا پچھتا۔ کنھیا نے پوچھیا پڑھی آ۔ کنھیا نے پوچھی پڑی [۳۲]

---

[۳۱] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقاء ص ۳۱۲ بحوالہ گریرسن۔ جائزہ جلد ۹۔ ص ۵۰

[۳۲] شوکت سبزواری۔ اردو زبان کا ارتقا ص ۳۱۲۔ دی اسٹوڈنٹس پریس ڈھاکہ۔ ۱۹۵۶ء۔

مضاف اور مضاف الیہ کی مطابقت

اردو کا عام نحوی قاعدہ یہ ہے کہ مضاف کو مضاف الیہ کے بعد لاتے ہیں۔ اس کے برعکس بھی صحیح ہے لیکن فصیح زبان اور نے پہلی صورت کو اختیار کیا ہے [۱] شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ "پہلے مضاف، مضاف الیہ پر مقدم ہوا کرتا تھا یہ عربی فارسی کا اثر تھا اور اردو کی اصل قدیم پراکرت کے خلاف تھا۔ سرسید کے عہد میں اس کی اصلاح ہوئی اور ماسوا، سوا، بجز وغیرہ چند الفاظ کو چھوڑ کر اردو کا قاعدہ یہ ہوا کہ مضاف الیہ، مضاف سے پہلے لایا جائے۔" [۲]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے مضاف، مضاف الیہ سے قبل لایا جاتا تھا لیکن بعد میں یہ قاعدہ متعین کیا گیا کہ مضاف الیہ پہلے ہونا چاہئے اور مضاف بعد میں۔ دیکھنا یہ ہے کہ قدیم اردو ادب کے مطالعہ سے کیا صورت سامنے آتی ہے۔

علامتِ اضافت، بحالتِ مذکر 'کا'، اور بحالتِ مونث 'کی' آتی ہے۔ قدیم اردو ادب میں 'کا' اور 'کی' کے مقام پر 'کیرا' اور 'کیری' بھی مستعمل رہے ہیں۔ جمع کی صورت میں یہ تبدیل ہو کر 'کیرے' اور 'کے' ہو جاتا ہے۔ اب قدیم اردو ادب کا مطالعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اول "کدم راؤ پدم راؤ" کو لیں۔ چند مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ دو دسا پانپ کا ہوئے جے کاوڑی

۲۔ نہ رووے کدمیں چور کی ماں پکار

۳۔ کھڑک مار یا او پری کے سرے

۴۔ جو آنکھو رکیرے پکوں کھول گئی [۳]

وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ اگر خام ہے شعر کا تجکوں چھند

---

[۱] ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ جامع القواعد (حصۂ نحو) ص ۱۱۲۔ یونیجیب پرنٹنگ پریس۔ لاہور۔

[۲] شوکت سبزواری۔ داستانِ زبانِ اردو۔ ص ۱۶۱۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۶۰ء

[۳] فخر دین نظامی دکنی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۷۳ء

۲- سلاست نہیں جس کیری بات ہیں

۳- کہ مہمانی اس دھات کی آج کوئی

۴- رتن یو اتھے دل کیرے کھان ہیں

۵- کتے بادشاہاں ہیں اس کے غلام

۶- ہزنکیاں ہیں یو بار یکیاں لاخ ہیں

۷- ملیاں سچ ناریاں سو سینا رکیاں ؎۴

ملا وجہی کی نثری تصنیف "سب رس" کے بھی چند جملے دیکھیے :-

۱- ہمنا ہماری نہایت کی معلوم نیں ہوتی خبر، اس کے نہایت کی کسے خبر۔

۲- ظاہر کی صورت تمہاری دیکھتے ہیں اپنے باطن کی سیماں کوں دکھاؤ۔

۳- جنوں کے دل میں دانش نے کیا تھا گھر، انو دیکھتے ہے کہ تمیں حق کے ہر حق پیمبر۔

۴- جس انکھیاں کوں دیدار کی لگی حیرانی، اس انکھیاں کا کیوں نہ ہووے ایسا پانی۔

۵- انو کے دلاں، انوں کیاں انکھیاں، انو کے کاناں، قدرت سوں باندکر غفلت کی دی گرہ۔ ؎۵

قلی قطب شاہ کے بھی چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

۱- تو جگ میں پایا رتبہ سو جم خاقان سکندر کا

۲- بنی سپر آل کے صدقے علی کا داس ہے قطبا

۳- صبا تو بات دکھلا ٹک ہمارے یار کے گھر کی

۴- بخشیا فصیح سحر معانی کے تیں خدا ؎۶

؎۴ ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص ۲۶-۱۵، ص ۳۱-۱۴، ص ۱۸، ص ۱۲ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ سنہ ۱۹۵۴ء

؎۵ ملا وجہی۔ سب رس۔ ص ۱۲، ص ۵۲، ص ۱۲، ص ۱۱۸، ص ۲۶۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت چہارم سنہ ۱۹۷۷ء

؎۶ محمد قلی قطب شاہ۔ کلیات قلی قطب شاہ۔ ص ۹۷، ص ۴۵، ص ۹۷، ص ۹۸۔ مرتبہ سید محی الدین قادری زور۔ اعظم اسٹیم پریس دکن سنہ ۱۹۴۰ء

کمال خاں رستمی بیجاپوری کے بھی چند مصرعے درج ذیل ہیں :۔

۱۔ جو صاحب ہے او عقل سور جان کا

۲۔ سہی بات یو بولنے کی نہیں

۳۔ اجت کیرے صورت کے کپڑے بنا

۴۔ سُنے کیاں شمع جلتیاں بتیاں واں چہار [7]

علی عادل شاہ ثانی شاہی کے یہاں بھی بعینہٖ یہی صورت ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ شریعت کا یہ مسطر توں حقیقت کا ہے منظہر توں

۲۔ اننددی بات تھی ساری محبت رات کی پیاری

۳۔ کنول چندر کے اشکوں سوں چھپایا پنکھ میں اپنے

۴۔ موہن پیا جب رہے انند میں انند بڑھانے کیاں بدھاوے [8]

بحری کے چند مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ دو دکھ دل کا بھار لیا لکہ بات دلبر کوں دکھاؤں

۲۔ سو روو پنج صباکی بی (بھی) طلب ہے یارب

۳۔ من نہ تھا لگ جیو کے جینے کوں المن تھا تمام

۴۔ جیو کے انکھیاں کوں ارے من سیت من انجن ہوا [9]

ولی کے بھی چند مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ کیا یک بات ہیں واقف مجھ رازِ نہانی کا

---

[7] کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ۔ ص ۲۰۴ - ۱ - ص ۲۰ - ۱ - ایجوکیشنل پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۸ء

[8] علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی۔ ص ۱۳۰ - ص ۱۰۴ - ۱۰۶ - ص ۱۰۵۔ مرتبہ سید مبارز الدین رفعت۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۲ء

[9] بحری - کلیاتِ بحری - ص ۱۲۳ - ص ۱۲۹ - ص ۱۲۹۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حفیظ۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

٢۔ وؔلی انکھیاں کی کرداوات پتلی کی سیاہی سوں

٣۔ تجھ علم کے چھپرے پہ نہیں رنگ گماں کا [١٠]

مندرجہ بالا تمام مثالوں سے ثابت ہے کہ دکنی میں اردو کے عام قاعدے کے مطابق مضاف کو مضاف الیہ کے بعد لاتے ہیں۔ یہ امر اردو کی اصل قدیم پراکرت کے مزاج کے مطابق ہے۔ البتہ موجودہ قاعدے کے تحت مطابقتِ مضاف الیہ میں حرفِ اضافت کی جمع نہیں آتی جب کہ قدیم دکنی میں حرفِ اضافت برائے مونث کی جمع بھی مستعمل رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تغیر دیکھنے میں نہیں آیا۔

دکنی کے بعد اب شمالی ہند کی قدیم اردو کو لیجیے۔ اسمٰعیل امروہوی کے چند مصرعے دیکھیے:۔

١۔ دیکھ یو بنی کی بیٹی کا مگر

٢۔ جو سکرات کا وقت مشکل بہت

٣۔ دامن میرا لے کے جو سر کے اوپر

٤۔ الٰہ کے تن ڈالیو رو رو سر [١١]

فائز دہلوی کے بھی چند مصرعے یہاں نقل ہیں:۔

١۔ اے سیہ مست میری انکھیوں کی

٢۔ لال بادل کی تجھ جھڑی ہے یاد

٣۔ نیناں میں اس کی جادو، زلفاں میں اس کی پھاندا

٤۔ دل کے شکار میں وہ شہباز ہے سراپا [١٢]

آبروؔ کے کلام سے بھی چند مصرعے یہاں نقل ہیں:۔

---

[١٠] وؔلی۔ کلیاتِ وؔلی۔ مرتبہ نور الحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت سوم سنہ ١٩٥٤ء

[١١] اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ صفحہ ١٢١-١١٧-١١٣۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور سنہ ١٩٦٩ء

[١٢] فائز دہلوی۔ دیوانِ فائز۔ صفحہ ١٧٨-١٧٧۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ عمدہ پریس دہلی۔ سنہ ١٩٤٦ء

۱- بھواں مٹکاو نا دیکھ اں سبھوں کا نام مت دھروا

۲- انکھیاں کی سیج ہوئی ہے مژگاں بھواں سے دو ٹی

۳- تم بن تو اور کے تئیں زلفاں سیں جان جکڑا ۱۳

گویا کے مصرعے ہیں :—

۱- روتے ہیں پھر دیکھ کر شبہائے ہجراں کی طرف

۲- پھر او نہیں زلفوں کا سودا سلسلہ جنباں ہوا ۱۴

افضل جھنجھانوی کا مصرع ہے :—

مرم دل درد مندوں کا نہ جانے ۱۵

پنڈت چندر بھان برہمن کا مصرع ہے :—

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں ۱۶

پرتھوی راج کے زمان (بارھویں صدی عیسوی) سے چند جملے دیکھیے :—

تم نے کاکا جی کے دوائی - آرام جتو جین کے رنج میں راکھر روپیہ ۵۰۰

تمرے آبائی گوڑے (گھوڑے) کا کھرچہ (خرچہ) سیوائے آوین گے کھاں سے انم

کو کوئی معاف کریں گے جین کو نبر کے اندھکاری ہو وین گے ۔۔۔۔ ۱۷

یہ استعمال بالکل موجودہ قاعدے کے مطابق ہے۔

---

۱۳ شاہ مبارک آبرو - دیوانِ آبرو - ص ۲۶، ۵۷، ۳۱ - مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن - یونین پرنٹنگ پریس - دہلی -

۱۴ گویا - دیوانِ گویا - ص ۲۵ - مطبعِ نامی منشی نولکشور -

۱۵ ڈاکٹر جمیل جالبی - تاریخِ ادب اردو (جلد اول) ص ۶۵ - بحوالہ افضل جھنجھانوی - بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی -

۱۶ ایضاً ص ۴۲ - بحوالہ پنڈت چندر بھان برہمن - انہی کا ایک مصرعہ یہ بھی ہے: برہمن وا سطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا سیں۔ (عباد اللہ گیانی - مجموعہ گرستی اور اردو)

۱۷ ڈاکٹر مسعود حسین خان مقدمہ تاریخ زبانِ اردو ص ۹۱ - مطبعِ عالیہ لاہور سنہ ۱۹۶۷ء پہلا پاکستانی ایڈیشن -

محمد شاکر ناجی کے بھی چند مصرعے ملاحظہ ہوں: ۔

۱۔ مرغِ دل عاشق کا تب سے صید ہے اس جال کا

۲۔ دیکھو ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم امید

۳۔ جو رویا درد کے انجھواں سے یوسف [18]

غلام مصطفیٰ یکرنگ کے مصرعے دیکھیے: ۔

۱۔ اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال

۲۔ اس کو مت جانو بیاں اوروں کی طرح

۳۔ جس کے درد دل میں کچھ تاثیر ہے [19]

امیر خسرو کی ایک پہیلی ہے: ۔

ایک تھال موتی سے بھرا + سب کے سر پر اوندھا دھرا [20]

مرزا مظہر جانِ جاناں کے بھی چند مصرعے درجِ ذیل ہیں: ۔

۱۔ کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دلبر اپنے کی

۲۔ کسی کا یار جب عاشق کہیں ہو گیا قیامت ہے

۳۔ ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار [21]

انعام اللہ یقینؔ کے بھی چند مصرعے دیکھیے: ۔

۱۔ نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

۲۔ بندہ جو تو بتاں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

---

[18] محمد حسین آزاد ۔ آبِ حیات ص ۱۰۴-۱۰۵-۱۰۳ ناشر شیخ مبارک علی ۔ لاہور سنہ ۱۹۵۰ء

[19] ایضاً ۔ ص ۱۰۷

[20] ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو ۔ ص ۱۰۲ ۔ مطبع عالیہ لاہور ۔ سنہ ۱۹۶۱ء

[21] ثناء الحق ایم اے ۔ میر و سودا کا دور ۔ ص ۲۰۸-۲۱۱ ۔ جاوید پریس کراچی سنہ ۱۹۶۵ء

۳۔ طرز یں سخن کے اس کی تجھ نے اڑائیاں ہیں [۲۲]

فضلی کی "کربل کتھا" کے چند جملے دیکھیے:۔

۱۔ کمال صفات جلال اوس کے کا، احاطۂ اوہام سے معرّا۔

۲۔ عقل عقلاؤں کی درک کرنے حقیقتِ ذات اور صفات اوس کی سے بیچ معنیٔ عجز و قصور کے لوا نہم بلتاؤں کے۔

۳۔ پاؤں نے بعید بلاغت اور فصاحت، اعجازِ کلام مجید اوس کے سے، بیچ مقام حیرت و فتور کے [۲۳]

شاہ ظہورالدین حاتم کے یہاں بھی یہی صورت ہے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ دل کے نگیں پہ اسم تمہارے کا نقش ہے

۲۔ گلگوں قبا سے بند ہوا ہے جنہوں کا دل

۳۔ اس طرح تجھ لب کے بوسے کا مجھے ہے اشتیاق [۲۴]

تاباںؔ (عبدالحئی) کہتے ہیں:۔

ہوا ہوں گم میں لشکر میں سپاہی رویاں کے ہی ظالم [۲۵]

میرؔ نے کہا ہے:۔

۱۔ تو حرف کن نے کیا گوش داد خواہوں کا

۲۔ ہے اس کی حرفِ زیرِ لبی کا سبھوں میں ذکر

۳۔ راتوں کے تئیں مصیبتیں گزریں [۲۶]

۲۲۔ ثناء الحق ایم اے۔ میر و سودا کا دور، ص ۲۱۴، ص ۲۲۳-۲۲۵۔ جاوید پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۵ء

۲۳۔ فضل علی فضلی۔ کربل کتھا۔ ص ۱۹۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دلی۔ سنہ ۱۹۶۵ء

۲۴۔ شاہ ظہورالدین حاتم۔ "شاہ حاتم حالات و کلام"۔ ص ۶۷-۶۹۔ مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۷۵ء

۲۵۔ عبدالحئی تاباںؔ۔ دیوانِ تاباںؔ ص ۲۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقیٔ اردو ہند، دکن۔ سنہ ۱۹۳۵ء

۲۶۔ میر تقی میرؔ۔ کلیاتِ میرؔ ص ۹۵۷، ص ۱۶-۲۰۔ باہتمام کیسری داس۔ مطبع نولکشور لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۴۱ء

درد کا مصرع ہے :۔

آتی ہے ہر نظر میں سبھوں کے جواں ہنوز ٢٧

میر امن نے ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف "اخلاقِ محسنی" کو اردو میں "گنجِ خوبی" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کے چند جملے یہاں نقل ہیں :۔

١۔ اور نشان ثبات کا دو چیز ہیں۔

٢۔ اور تھوڑے فائدے کی خاطر سیکڑوں جان کا نقصان کرتا۔

٣۔ حویلیاں اور جھونپڑیاں رعیتوں کی اپنے نوکروں کے اترنے اور رہنے سے محفوظ رکھے ٢٨

میر شیر علی افسوس کے ترجمے "باغِ اردو" کے دو جملے ملاحظہ ہوں :۔

١۔ خلافِ رائے عقلمندوں کا ہے کہ اس امید میں اور اس بیم میں اپنے تئیں ڈالیے۔

٢۔ اور کہا کہ چشم بصیرت بیں اس کی یہ ہے دیکھتی کہ غیروں کے تصرف میں ہے مملکت اس کی۔ ٢٩

افسوس کی "آرایشِ محفل" سے بھی دو جملے یہاں نقل ہیں :۔

١۔ سبھوں نے مارے شرم کے اپنی آنکھیں موند لیں۔

٢۔ جس خون کے انتقام کے باعث ہزار خون ہوئے ہیں۔ ٣٠

قائم کے بھی چند مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

١۔ نہ لٹ دعویٰ کی ہے ایسی نہ زلف سنبل کی

٢۔ لالہ ساں پھرنے اس گل کے دکھائے ہیں یہ دن

---

٢٧ خواجہ میر درد ۔ دیوانِ درد ۔ ص ٨ ۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ زرین آرٹ پریس لاہور سنہ ١٩٦٢ء

٢٨ میر امن ۔ گنجِ خوبی ص ٢٠ (ترجمہ اخلاقِ محسنی، ملا حسین واعظ کاشفی)۔ ادبی پرنٹنگ پریس بمبئی ٨۔ سنہ ١٩٦٦ء

٢٩ میر شیر علی افسوس۔ باغِ اردو ص ١٩-١٨-٢٠ ۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ سنہ ١٩٦٣ء

٣٠ میر شیر علی افسوس ۔ آرایشِ محفل۔ ص ٢٥٤-٢٥٥ ۔ مرتبہ کلب علی خاں فائق ۔ زرین آرٹ پریس لاہور سنہ ١٩٦٣ء

۳۔ دیکھیں ہیں شرے چشم کے بیمار کی شب نبض ۳۱

میر انیس کا مصرع ہے :۔

پھاڑا جو گریبان شب آفت کی سحر نے ۳۲

میر حسن کے مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ عجب لگی تھا انہوں کا جنہیں جواب لگا

۲۔ خط کا قاصد نہ جواب اس کے اگر لاوے گا

۳۔ پھر بھلا اس کی تو کچھ خیر خبر لاوے گا

۴۔ انھوں کے تو لینے میں اتنا عبث ۳۳

مرزا غالب کے چند جملے ملاحظہ ہوں :۔

آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا کو سجود اور خدا کی راہ بتانے والے انبیا کو درود ۔ پھر اکثر برس کا ناتواں آدمی دنیا میں عزت اور عقبیٰ میں نجات کا طالب ، ترک سلجوقی اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے ۔ ۳۴

انشا کے دو مصرعے ہیں :۔

۱۔ کیا قہر ہے یہ دیکھو برسوں جنھوں کی خاطر

۲۔ سبھوں کے طعنے جدا ناصحوں کے پند جدا ۳۵

مصحفی کے بھی چند مصرعے درج ذیل ہیں :۔

---

۳۱ قائم ۔ اردوئے معلیٰ قائم نمبر ص ۶۹ – ۹۶ – ۹۳ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ۔ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۔ جلد ۷ شمارہ ۸

۳۲ میر انیس ۔ مراثی انیس ۔ ص ۵۳ ۔ مرتبہ نائب حسین نقوی ۔ علمی پرنٹنگ پریس لاہور ۔ سنہ ۱۹۵۹ء

۳۳ میر حسن ۔ دیوان میر حسن ص ۸ – ۱۵ – ۳۰ ۔ مطبع منشی نولکشور ۔ لکھنؤ ۔

۳۴ مرزا غالب ۔ مجموعۂ نثر غالب اردو ۔ ص ۷ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ۔ شفیق پریس لاہور ۔ اشاعت اول سنہ ۱۹۶۷ء

۳۵ سید انشاء اللہ خاں انشا ۔ کلیات انشا ۔ ص ۳۹ – ۲۵۲ ۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ۔ نفیس ریڈنگ پرنٹنگ پریس لاہور ۔

۱۔ اے مصحفیؔ! آنکھوں کا کس کی ہے نظر کردہ

۲۔ تو اب کے بہت مجھ کو بیمار نظر آیا

۳۔ بھیجنے سے خط کے کچھ آیا نہ ہاتھ

۴۔ کیا وصل میں پوچھے ہے رونے کا رے باعث ۳۶

انشا کی نثری تصنیف "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" سے چند جملے درجِ ذیل ہیں:۔

۱۔ جیتے رہتے اور بیس سبھوں کا آسرا اور ان کے گھرانے کا رکھتا ہوں چھتیسوں گھڑی۔

۲۔ ان بھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے کس کس روپ کے پھول اگلتا ہوں۔ ۳۷

سرسید احمد خاں کی تصنیف "اسبابِ بغاوتِ ہند" سے اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ سرکشی کا جو ارادہ دلیں پیدا ہوتا ہے اس کا سبب ایک ہی ہوتا ہے یعنی پیش آنا ان باتوں کا جو مخالف ہوں ان لوگوں کی طبیعت اور طینت اور ارادہ اور عزم اور رسم و رواج اور خصلت اور جبلت کے جنہوں نے سرکشی کی۔

۲۔ جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقۂ حکومت کا، جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

۳۔ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قایم کر دیں گے تو ہماری بڑی نیکنامی گورنمنٹ کی ہوگی۔ ۳۸

شمالی ہند کے شعر و ادب کے اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں مُضاف کی مُضاف الیہ پر اور مُضاف الیہ کی مضاف پر تقدیم و تاخیر روا تھی۔ دوسرے یہ کہ مضاف الیہ جمع مونث ہونے کی صورت میں یہاں حرفِ اضافت کی جمع لانے کا دستور نہ تھا۔ ضمیر متکلم و حاضر میں اضافت کی علامت کا، کی، کے بجائے را، ری آتی ہے اور یہ دکنی اور شمالی ہند دونوں جگہ یکساں مستعمل رہی ہے۔ اس سلسلے میں نمونے نقل کرنے سے قبل ایک قدیم نمونے کا حوالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ

---

۳۶ غلام ہمدانی مصحفی۔ کلیاتِ مصحفی (دیوانِ اول) ص ۱۱۸ ۔ مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی۔ مطبع عالیہ لاہور۔ سنہ ۱۹۶۸ء

۳۷ سید انشاء اللہ خاں انشا۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی۔ ص ۴۷ ص ۴۵ ۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۵ء

۳۸ سرسید احمد خاں۔ اسبابِ بغاوتِ ہند۔ ص ۱۲۶ ص ۱۱۸ ص ۹۶ ، مع مقدمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مشہور پریس کراچی سنہ ۱۹۵۷ء

بابا فرید کا قول ہے۔ بابا فرید شکر گنج کا زمانہ ۵۸۰ھ تا ۶۶۴ھ ہے۔ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ نے اپنے تحقیقی مقالے "اُردو نثر کا آغاز وارتقا" میں بابا صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے :-

پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے۔ [۳۹]

ان کا ایک اور مقولہ بھی منقول ہے۔ ایک مرتبہ ایک مرید نے بابا صاحب سے دریافت کیا جسم میں عقل کا مقام کون سا ہے؟ بابا فرید نے جواب دیا "بیچ سر کے"۔ [۴۰]

انہی سے ایک منظوم قول بھی نقل ہے جس میں حرفِ اضافت 'کیری' استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو:-

اسا کیری بہی سو ریت + جاؤں نائے کہ جاؤں مسیت [۴۱]

شیخ شرف الدینؒ یحییٰ منیری (۶۶۲ھ تا ۷۶۲ھ) کا تعلق بہار کے مشہور صوفی خاندان سے تھا۔ سید سلیمان ندوی نے "معدن المعانی" سے اپنی تصنیف "نقوشِ سلیمانی" میں ان کے چند نثر پارے نقل کیے ہیں ان میں ایک فالنامے [۴۲] کے بھی چند فقرے درج کیے گئے ہیں۔ دو تین فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :—

۱۔ جو من کی منسا کیا ہوئی سو ہوئی۔

۲۔ راج پاٹ اچل کے دیا تم کوں

۳۔ تورے دن کے اب سکھ سو جتا ناہیں [۴۳]

اس فالنامے کی مکمل نقل ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے اپنی تصنیف "علمی نقوش" میں نقل کی ہے۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے ان کے بعض ہندی دوہوں کا حوالہ بھی دیا ہے جن میں مختلف بیماریوں کی مجرب دوائیں بتائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک سلیمان

---

۳۹ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ - اردو نثر کا آغاز وارتقا ص ۲۸ (مطبوعہ مقالہ پی ایچ ڈی) سندھ آفسٹ پرنٹنگ پریس کراچی۔ ۱۹۷۸ء

۴۰ ایضاً ص ۲۶

۴۱ ایضاً ص ۳۰

۴۲ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں۔ علمی نقوش ص ۶۲-۶۳ نشاط پریس - کراچی۔

۴۳ علامہ سید سلیمان ندوی۔ نقوشِ سلیمانی ص ۴۹ ۔ باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی۔ ۱۹۶۷ء دوسرا پاکستانی ایڈیشن۔

ندوی صاحب نے نقل کیا ہے ملاحظہ ہو :۔

لودہ بھنگڑی مرداسنگ ۔ ہلدی زیرا ایک ایک ٹنگ

اینین چنہ بھر رہیں چار اردبھر تھوتھا اس میں ڈار

پوستے پانی پوٹلی کرے نیناں پیڑا پل میں ہرے [۲۴]

اسی طرح مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (م ۸۰۸ھ) ہیں۔ ان کا بڑا عرصہ بنگال، بہار اور اودھ میں بسر ہوا۔ ان کے ملفوظات کے مشہور مجموعے "لطائفِ اشرفی" میں الفاظ، دعائیں اور منتر اردو نما ہندی میں ملتے ہیں۔ اس مجموعے کے مولف نظام حاجی غریب یمنی ہیں جو ۸۰۵ھ میں ان کے مرید ہوئے۔ اس مجموعے میں سید اشرف رح کی زبان سے سانپ اور بچھو کے کاٹے کے کئی منتر لکھے ہیں۔ ان میں سے بچھو کے کاٹے کا ایک منتر "نقوشِ سلیمانی" میں نقل ہے :۔

دھر بندھوں دھر کندھوں، سوالاکھ سپاری بندھوں اپنے بھگت گرو کے سکت سوں یہ جو آگیں (آگے) جھڑے۔

اسی طرح ایک اور منتر کا ایک جملہ دیکھیے :۔

کالی کوئی جنگل کے کا جل دھکا ناتھ پانچ جیز۔ الخ ۔ [۲۵]

"اردو نثر کا آغاز وارتقا" میں ان کی ایک ہندی شلی بھی نقل ہے جو یہاں درج کی جاتی ہے :۔

چھیری کے منہ کھنڈا سمائے [۲۶]

ان تمام مثالوں سے واضح ہے کہ اس قدیم دور میں بھی اردو میں مضاف اور مضاف الیہ کا قاعدہ موجودہ قاعدے سے مطابقت رکھتا تھا سوائے کہیں کہیں معمولی فرق کے۔ تاہم شمالی ہند میں مضاف الیہ کی مطابقت میں حرفِ اضافت جمع لانے کا ثبوت نہیں ملتا۔

پہلے ذکر کیا گیا کہ متکلم و حاضر میں کا، کی کے بجائے را، ری ہوتی ہے۔ جیسے میرا، میری۔ تیرا، تیری۔ ہمارا، ہمارے

---

[۲۴] علامہ سید سلیمان ندوی۔ نقوشِ سلیمانی۔ ص ۴۸۔ باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی۔ ۱۹۶۷ء دوسرا پاکستانی ایڈیشن

[۲۵] ایضاً ص ۵۰

[۲۶] ڈاکٹر رضیہ سلطانہ۔ اردو نثر کا آغاز وارتقا ص ۳۷۔ سندھ آفسٹ پرنٹنگ پریس کراچی۔ ۱۹۷۸ء

تمہارا، تمہاری۔ یہ استعمال دکنی اور شمالی ہندی اردو میں موجودہ قاعدے کے مطابق رہا ہے اس میں تغیر دیکھنے میں نہیں آتا۔ تاہم اپنی رائے کے ثبوت کے طور پر یہاں کچھ مثالیں نقل کی جاتی ہیں: "قطب مشتری" کے مصرعے دیکھیے:۔

۱۔ تیری قدرت انگے ہے ذرے تے کم

۲۔ اگر جو کرم ہوئے تیرا کس اوپر

۳۔ ہمیں نہیں سُنے چوک ہمارا ج ہے

۴۔ نبی آج ہمارے یہاں آئیں گے

۵۔ رتن بے بدل یو رہے جاں بکائیں ۲۷

"قطب مشتری" ۱۰۱۸ھ کی تصنیف ہے۔ "سب رس" اس کے سترہ برس بعد ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں یہ استعمالات ملاحظہ ہوں۔ چند جملے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ تیس دونوں بی میرے پر عاشق ہیں۔

۲۔ تمنا تمہاری نہایت کی معلوم نہیں ہوتی خبر، اس کے نہایت کی کسے خبر۔

۳۔ ظاہری صورت تماری (تمہاری) دیکھے ہیں، اپنے باطن کی حسن کوں دکھاؤ۔

۴۔ تیرے پاس بی (بھی)...... صاحب شمشیر، صاحب تدبیراں ہیں۔

۵۔ میرا گھر گھال، ان ...... نے مجھے دیس انتر دی۔ ۲۸

ملا وجہی کی مثنوی قطب مشتری اور نثری تصنیف "سب رس" کا یہ استعمال آج کی اردو کے مطابق ہے۔ لیکن ایک آدھ جگہ اس قاعدے سے انحراف بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مثنوی کا ایک مصرع ہے:۔

تمے گئے یہ تنہائی سوں میں مروں ۲۹

---

۲۷ ملا وجہی۔ مثنوی قطب مشتری صفحات: ۱۲، ۸، ۴، ۳، ۲۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان سنہ ۱۹۵۳ء

۲۸ ملا وجہی۔ سب رس۔ صفحات: ۲۵۵، ۳۸، ۱۱۸، ۲۲، ۱۱۹۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۷۷ء

۲۹ ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ ص ۲۲۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ سنہ ۱۹۵۳ء

"تمھے گئے ہے" یعنی تمہارے جانے پر۔ اب "سب رس" کا ایک جملہ دیکھیے:۔

تجھے تو وہ قاف کی پریاں میں ایک ھمزاد ہے [۵۰]

یہاں "تجھے" برائے "تیرا" استعمال ہوا ہے۔ اسی کا ایک اور جملہ ملاحظہ ہو:۔

تو ھمیں بھائی ہے

یعنی تو ھمارا بھائی ہے۔ اسی طرح ایک اور موقع پر "کوں"، "کا" کے معنوں میں استعمال کیا ہے جملہ حسبِ ذیل ہے:۔

قامت کوں یک غلام تھا۔ [۵۱]

یعنی قامت کا ایک غلام تھا۔ البتہ اس قسم کے استعمالات کم ہیں۔ عام استعمال موجودہ قاعدے سے مطابقت رکھتا ہے۔

"معراج العاشقین" بھی دکن کی مشہور نثری تصنیف ہے جو اگرچہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب رہی ہے لیکن ان کی نہیں بلکہ ان کے بہت بعد کی تصنیف ہے۔ اس کے جملے دیکھیے:۔

۱۔ اس کا معنا اے محمدؐ! جیکوئی تیری محبت مانیاں سو میری طاعت لیوں تو ہزار باتاں اللہ کیاں ہور رحمتاں کیاں ہو رہیا۔

۲۔ وہاں تے جبرائیل عرض کیے تمارا (تمہارا) اللہ کا ملنا ہوئے پر یک سجدہ کرو۔

۳۔ میری طرف سوں حضرت قبول کیے۔

۴۔ ہمارا اللہ تعالیٰ تماری (تمہاری) پرورش (پرورش) کی نماز کرتا ہے۔ [۵۲]

یہ تمام استعمالات موجودہ قاعدے کے مطابق ہیں لیکن ان کے یہاں یہ تغیر دیکھنے میں آتا ہے کہ "میری" کی بھی جمع بنالی گئی ہے۔ "معراج العاشقین" کا یہ جملہ دیکھیے:۔

ایتال میریاں باتاں خوب سن کہ تیری امت کوں میرے بندیاں کوں خبر دیتا ہوں [۵۳]

شمالی ہند میں چونکہ ایسا کوئی تغیر دیکھنے میں نہیں آتا لہٰذا بہ لحاظ طوالت کے خیال سے مثالیں حذف کی جاتی ہیں۔

---

[۵۰] ملا وجہی۔ سب رس۔ صفحات: ۲۸۸، ۱۹۴۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن پریس کراچی۔ اشاعت چہارم سنہ ۱۹۷۷ء

[۵۱] ایضاً۔ صفحات: ۲۸۸۔ ۸۰۔

[۵۲] منسوب بہ گیسو دراز۔ معراج العاشقین۔ صفحات: ۳۰، ۲۴۔ دکن دار الاشاعت۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۶۱ء (مرتبہ تحسین سروری)

[۵۳] ایضاً۔ صفحہ: ۲۴۔

صفت موصوف

صفت موصوف کے سلسلے میں عام نحوی قاعدہ یہ ہے کہ صفت کی تذکیر و تانیث، وحدت و جمع، موصوف کے مطابق ہوتی ہے مگر جب موصوف جمع مونث ہو تو صفت واحد آتی ہے جیسے اونچی دیواریں۔ اونچا محل لیکن جب موصوف جمع کو حذف کر کے صرف صفت استعمال کرتے ہیں تو صفت جمع لاتے ہیں جیسے بروں سے بچو۔ نیکوں کی صحبت اختیار کرو۔ صفت کبھی مفرد آتی ہے جیسے نیک آدمی۔ اور کبھی مرکب بھی آتی ہے جیسے نیک دل آدمی [1]

پنڈت کیفی نے تصریح کی ہے کہ اردو میں جب موصوف مونث اور جمع ہو تو صفت کا کلمہ وہی رہے گا جو مفرد مونث کے لیے ہے جیسے اچھی لڑکی۔ اچھی لڑکیاں۔

مذکر کی صورت میں صفت کا کلمہ بھی جمع بن جاتا ہے جیسے اچھا لڑکا۔ اچھے لڑکے۔

قدیم اردو میں مندرجہ بالا قواعد اسی طرح مستعمل تھے البتہ جمع مونث کے سلسلے میں صفت کا وہی قاعدہ بعض اوقات برتا گیا ہے جو جمع مذکر کی صورت میں مستعمل ہے۔ یعنی اگر موصوف جمع مذکر ہو تو صفت کا کلمہ بھی جمع بن جاتا ہے چنانچہ قدیم اردو میں اس اصول کی تقلید میں جمع مونث موصوف کے ساتھ صفت کے کلمے کو بھی جمع کر لیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں اور کوئی تغیر دیکھنے میں نہیں آتا۔ قدیم اردو سے مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ "کدم راؤ پدم راؤ" کا مصرع ہے :-

بڑی کھلبلی سندریاں رانیاں [2]

قلی قطب شاہ کا مصرع ہے :-

باتاں گھرسیاں رنگیلیاں واریا جو تیرے نالوں پر [3]

ملا وجہی کی "قطب مشتری" کے چند مصرعے دیکھیے :-

---

[1] ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں۔ جامع القواعد حصۂ نحو صفحہ ۱۴۔ نیو حبیب پرنٹنگ پریس لاہور۔ جنوری سنہ ۱۹۷۲ء

[2] فخر دین نظامی - مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۷۳ء

[3] قلی قطب شاہ - کلیات قلی قطب شاہ۔ مرتبہ محی الدین قادری زور۔ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن۔ سنہ ۱۹۴۰

۱۔ چھپیاں نعمتاں غیب کناں پائیں چل۔

۲۔ لٹویاں نعمتاں لٹو فلک بیچ بھر۔

۳۔ بھریں چاندسیاں سندریاں رس منے [۴]

"سب رس" کے جملے دیکھیے:۔

۱۔ برے لوگاں شہر میں کونچے کونچے ہورے ہیں۔

۲۔ حسن یو سواد بھریاں باتاں سن، یو کھریاں باتاں سن، تجہ فکر دل پر لیائی۔ [۵]

حسن شوقی کا مصرع ہے:۔

کہ بجلیاں جھمکتیاں ہیں بادل منے [۶]

شاہی کا مصرع ہے:۔

بتاں توڑ یا ہتیاں جیسے ندیاں ہتیاں ٹنکھایا ہے [۷]

اسمٰعیل امروہوی کا مصرع دیکھیے:۔

جتی بہشتی اُٹھیاں جو ہیں گی بنام [۸]

شاہ حاتم کے مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں

۲۔ یہ کیا خرابیاں ہیں کیا جگ ہنسائیاں ہیں۔

۳۔ گردش چشم مری رویاں سے پیمانہ کرو

---

[۴] ملا وجہی۔ مثنوی قطب مشتری۔ صفحات: ۲۱، ۱۸، ۸۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ سنہ ۱۹۵۳ء

[۵] ملا وجہی۔ سب رس۔ صفحات: ۹۲، ۴۸۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۷ء

[۶] حسن شوقی۔ دیوانِ حسن شوقی۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۱ء

[۷] علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی۔ صفحہ: ۱۰۶۔ مرتبہ سید مبارز الدین رفعت۔ مسعود پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۲ء

[۸] اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ صفحہ: ۱۱۳۔ مرتبہ نائب حسین نقوی۔ نقوش پریس لاہور سنہ ۱۹۶۹ء

۴۔ ہماری انکھڑیاں کو یاد کر مستی کے عالم میں ۹ے

خواجہ میر درؔد کے مصرے دیکھیے :۔

۱۔ سو بار دیکھیاں ہیں تری بے وفائیاں

۲۔ دل کو لے جاتی ہیں معشوقوں کی خوشگلوبیاں

۳۔ زلفوں میں تو سدا سے یہ کج ادائیاں ہیں

۴۔ آنکھوں نے سیر یہ اور ہی آنکھیں دکھائیاں ہیں ۱۰ے

میرؔ کا مصرع ہے :۔

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں۔ ۱۱ے

سوداؔ کے مصرے دیکھیے :۔

۱۔ کٹتے ہیں کس طرح راتیں ہمیں یہ ہجر کی بڑیاں

۲۔ آجائیں نقدِ دل کو تو یوں بھی ہیں سستیاں

۳۔ سلامت ہو گئیں دل پر بہرہ کی ساعتیں کڑیاں ۱۲ے

اس کے علاوہ صفت موصوف کے سلسلے میں کوئی اور تغیر نظر سے نہیں گزرا۔ اس تغیر کی مثالیں بھی بہت وافر نہیں ملیں۔ بعد میں یہ قاعدہ متعین ہو گیا کہ موصوف اگر جمع مذکر ہو تو صفت کا صیغہ جمع لایا جائے لیکن اگر موصوف جمع مونث ہو تو صفت کا صیغہ واحد لایا جائے۔

۹ے شاہ حاتم ۔ شاہ حاتم حالات و کلام ۔ صفحات: ۱۷۲، ۱۵۱، ۱۵۵، ۱۴۴ ۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۴ء

۱۰ے خواجہ میر درد ۔ دیوانِ درد ۔ صفحات: ۹۸، ۹۶، ۶۷ ۔ مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی ۔ زرین آرٹ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۲ء

۱۱ے میر تقی میر ۔ کلیاتِ میر ۔ صفحہ: ۴۲ ۔ باہتمام کیسری داس ۔ مطبع نولکشور لکھنؤ ۔ سنہ ۱۹۴۱ء

۱۲ے مرزا رفیع سودا ۔ کلیاتِ سودا ۔ صفحات: ۶۴۶، ۶۵۲ ۔ مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔

جمع کا قاعدہ

یہاں اسم جمع سے بحث نہیں ہے کیوں کہ اسم جمع، بذاتِ خود واحد ہوتے ہوئے کسی شے یا اشخاص کے مجموعے پر دلالت کرتا ہے۔ لہذا یہاں صرف ان قاعدوں کا جائزہ لینا مقصود ہے جو واحد اسم کی جمع بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اردو میں اسم کی دو قسمیں ہیں واحد اور جمع۔ اصل کے اعتبار سے اسم کی دو حالتیں ہیں ایک فاعلی یا قایم، دوسرے غیر فاعلی یا محرف۔ فاعلی حالت میں اسم بغیر کسی حرفِ صلہ (سے، نے، کو وغیرہ) کے استعمال ہوتا ہے جیسے حامد آیا۔ سورج نکلا۔ محمود سبق پڑھتا ہے۔ اس کے سوا اسم کی تمام حالتیں "غیر فاعلی" کہلاتی ہیں۔ مثلاً حامد نے سبق پڑھا۔ اس مثال میں 'حامد' غیر فاعلی حالت میں ہے۔

اردو میں کچھ اسما ایسے ہیں جو فاعلی حالت میں افراد و جمعیت کے اعتبار سے ایک جیسے رہتے ہیں اور لفظی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا جیسے گھر گرا۔ گھر گرے۔ برتن ٹوٹا اور برتن ٹوٹے۔ آدمی آیا۔ آدمی آئے۔ ان مثالوں میں گھر، برتن، آدمی، جمع اور مفرد دونوں صورتوں میں ایک جیسے ہیں۔ یہ مذکر اسما ہیں جن کا آخری حرف، حرفِ صحیح ہے۔ غیر فاعلی حالت میں ان کی جمع آتی ہے جیسے گھروں کو گرایا۔ برتنوں سے کھایا۔ آدمیوں نے جانوروں کو بدھایا وغیرہ۔ ان اسما کو چھوڑ کر اردو میں دوسرے اسما تین طرح کے ہیں:-

۱۔ وہ مونث اسما جن کا آخری حرف کوئی حرفِ صحیح ہے۔ جیسے رات۔ عورت وغیرہ۔ فاعلی حالت میں ان کی جمع "یں" بڑھا کر بنائی جاتی ہے۔ عورت، عورتیں۔ رات، راتیں۔

۲۔ وہ مونث اسما جن کے آخر میں 'ی' ہے جیسے لڑکی۔ گھوڑی وغیرہ۔ ان کی جمع "ـاں" کے اضافے سے بنتی ہے۔ جیسے لڑکی، لڑکیاں۔ گھوڑی، گھوڑیاں۔

قدیم اردو میں قسم اول کی جمع بھی "ـاں" کے اضافے سے بنتی تھی۔ جیسے راتاں۔ باتاں۔ عورتاں۔ وغیرہ۔ اور ان تمام افعال، حروف اور صفات کی جمع بھی اسی نہج پر بنائی جاتی تھی جن کے آخر میں 'ی' ہے جیسے 'گی' سے گیاں۔ 'گی' سے گیاں، بھی سے بھیاں۔ چلی سے چلیاں۔ بھلی سے بھلیاں۔

۳۔ مذکر اسما جن کے آخر میں 'ا' یا 'ہ' ہے۔ جیسے گھوڑا۔ کتا۔ نامہ، بچہ وغیرہ۔ فاعلی حالت میں ان کی جمع یائے مجہول (ے) کے اضافے سے بنتی ہے۔ جیسے گھوڑا۔ گھوڑے۔ کتا، کتے۔ نامہ، نامے۔ بچہ، بچے۔

غیر فاعلی یعنی محرف حالت میں ان تمام اسماکی جمع "وں" بڑھا کر بنائی جاتی ہے۔ گھروں سے ۔ راتوں کو ۔ آدمیوں نے۔ لڑکیوں کا ۔ گھوڑوں پر وغیرہ ۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ اردو میں علامات و لاحقات جمع کل چار ہیں۔ تین فاعلی اور وہ یہ ہیں :۔ "ے ے" - "ـیں"۔ "ـ ان" (یا ـ یاں) اور ایک غیر فاعلی "ـ وں" (یا ـ یوں)۔ [1]

ملک حسن اختر نے جمع کے قاعدوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو میں جب حرف ربط ساتھ آئے تو 'واؤ نون' سے جمع بناتے ہیں اور جب اضافت استعمال ہو رہی ہو اور اسم مونث ہو تو 'ین' (ی ن) سے جمع بناتے ہیں۔ مگر عہد محمد شاہی میں "ان" ہی لگا دیتے تھے ۔ مثلاً" رقیباں۔ عندلیباں ۔ کہیں اسم مونث کی جمع 'ی ن' سے نہیں بلکہ 'ی ع ن' سے بنائی ہے جیسے بدستیئں۔ دھجیئں وغیرہ ۔ اسی طرح ضمیر، فعل اصلی اور فعل امدادی کی جمع بھی جائز تھی نیز جمع الجمع کے قاعدے کا بھی رواج تھا [2] لیکن ملک حسن اختر صاحب کا موضوع صرف عہد محمد شاہی تک محدود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قدیم اردو میں یہ قاعدے کسی تسلسل کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں یا نہیں؟

جمع بنانے کے لیے قدیم اردو بالخصوص دکنی میں یہ رواج تھا کہ اسم خواہ مذکر ہو یا مونث ، وہاں عام طور پر "ـ ان" کے اضافے سے جمع بنائی جاتی تھی۔ مثلاً مرداں ، عورتاں ، باتاں ، فرشتیاں ، بادشاہاں ، دلیاں ، صفتاں وغیرہ ۔ جب کہ موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ اسم کی حالت اور تذکیر و تانیث سے جمع میں فرق پڑتا ہے۔ دکنی اردو میں ہرچند کہ یہ قاعدہ بھی مفقود نظر نہیں آتا لیکن اس سلسلے میں کوئی معینہ قاعدہ ان کے یہاں نہیں ۔ چنانچہ اسم کے علاوہ حرف ، فعل اور صفت کی بھی جمع بنائی جاتی ہے ۔ مثلاً واحد مونث کے لیے حرف اضافت 'کی' ہے ۔ اگر مضاف الیہ جمع مونث ہو تو وہ اس کی مطابقت میں حرف اضافت کی بھی جمع بنا لیتی ہے ،'کی' کی جمع 'کیاں' دکنی میں عام ہے ۔ اسی طرح وہ بعض ایسے اسما کی بھی جمع بنا لیتی ہے جس کی جمع بنانے کا اب رواج نہیں مثلاً ایسی کی جمع ایسیاں ، جیسی کی جیسیاں ،

---

1 ۔ شوکت سبزواری ۔ اردو زبان کا ارتقا صفحات ۱۹۵-۱۹۷ ۔ دی ستی پریس ڈھاکہ ۔ ۱۹۵۶ء

نوٹ :۔ جس جملے میں فاعل پر علامت فاعل 'نے' کا اطلاق کرتے ہیں شوکت صاحب ایسے غیر فاعلی حالتوں میں شمار کرتے ہیں جبکہ ہم بعض دوسرے لسانیین کی تائید میں ایسے فاعلی حالت کہتے ہیں۔ کیونکہ اس پر فاعلی علامت داخل کی گئی ہوتی ہے۔

2 ۔ ملک حسن اختر ۔ شمالی ہند میں اردو شاعری (عہد محمد شاہی میں) مقالہ پی ایچ ڈی ۔ زیر نگرانی ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ پنجاب یونیورسٹی ۔

ویسی کی ویسیاں، تیسی کی تیسیاں۔ اتنی کی اتنیاں، جتنی کی جتنیاں، کتنی کی کتنیاں اور وتنی کی جمع وتنیاں دکنی میں عام مستعمل تھی۔ علامت مستقبل برائے واحد مونث 'گی' ہے اس کی جمع 'گیاں'، اپنی کی جمع اپنیاں، فعل کی جمع فعلاں اور تھی اور اتھی کی جمع 'تھیاں اور اتھیاں' بھی مستعمل رہی۔

فعل کے سلسلے میں موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ فاعل اگر جمع مونث ہے تو فعل اصلی واحد استعمال ہوتا ہے اور اس پر فعلِ امدادی جمع کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ لیکن دکنی میں فعل اصلی بھی فعلِ امدادی کے ساتھ جمع ہی استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً آتیاں تھیاں۔ جاتیاں تھیاں۔ کرتیاں تھیاں۔ کہتیاں تھیاں وغیرہ۔ تاہم موجودہ قاعدہ بھی مفقود نہیں تھا۔

ضمیر اضافی برائے واحد متکلم 'میری' کی جمع 'میریاں' بھی دیکھنے میں آتی ہے غالباً اسی اثر کے تحت شمالی ہند میں بھی 'ہماری' کی جمع 'ہماریاں' دیکھنے میں آتی ہے مثلاً میر کا مشہور شعر ہے:۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ

مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ضمائر اشارہ میں واحد غائب کے لیے 'اس' استعمال ہوتا ہے اس کی جمع 'ان' آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ 'انہوں' بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے اسے لاہور کی زبان لکھا ہے مثلاً انہوں کا بیٹا [۲]

اسی طرح ضمیر تنکیر 'تن' کی جمع 'تنھوں' بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ کا مصرع ہے: کہ ہوں نہ تنھوں میں تجھ لکھیا۔ 'سب' کی جمع 'سبھوں' اور 'لوگ' کی جمع 'لوگاں' اور 'لوگوں' بھی مستعمل تھی۔

دکنی جمع کے اثرات شمالی ہند کی ابتدائی دور کی شاعری پر بھی نظر آتے ہیں چنانچہ میر و سودا اور قائم تک جمع کی ایسی صورتیں مل جاتی ہیں جو دکنی سے مخصوص ہیں۔ جمع کے قواعد کی مثالیں دیکھنے کے لیے اول دکنی ہی کو لیں۔ دکنی اردو کی قدیم ترین دستیاب تصنیف 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے۔ اس کے چند مصرعے درجِ ذیل ہیں:۔

۱۔ جو سپر دیسیں تھے ڈرے وہ نڈراں۔

۲۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ جامع القواعد (حصۂ نحو) صفحہ: ۱۴۰۔ نیو حبیب پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۷۳ء

۲- ہمارے لکھیں سب فرشتے کہ جے

۳- ہماپڑے گھوڈیس چیلاں اٹھائیں

۴- پڑیں کھلبلی سندریاں رانیاں

۵- کہ ہوں نہ تنھوں ہیں تجھے لکھیا

۶- تل او پر سو پاں دالریاں چیریاں

۷- تری ایک میں جے لکھا کوں ہوئی . [۴]

قطب عالم گجراتی کا قول ہے: چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی۔ [۵]

شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (م ۹۰۲ھ) کے چند مصرعے حسب ذیل ہیں:-

۱- میں تو باندی ہیروا تیری تیں مجھ ہاتھوں دھریا

۲- تیں ہی میرا لار چلا یا کیوں نہ ہوا اداس

۳- رزاق سبھوں کیرا۔ [۶]

اِن کے نثری رسالے "شرح مرغوب القلوب" سے چند جملے ملاحظہ ہوں:-

۱- ویغمبر کے خدا کی آشنائی جے کوئی بوجھتا ہے انوکیاں توں رہ کر انوں تھے لوتوں سن ہور حب نکو اچہ (انچھ) [۷]

۲- ہور اس عالم میں خوبیاں دلوے گا، کہیا ہے اس کوں پچھانے لوگاں کوں ہور ہیر ہیز گاراں کوں۔

۳- چھوڑ دیو دشمناں کوں [۸]۔

---

[۴] فخر دین نظامی دکنی۔ کدم راؤ پدم راؤ۔ صفحہ: ۴۷ (تعیین ۸۲۵ھ و ۸۳۹ھ)۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۳ء

[۵] شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم۔ صفحہ: ۲۴ (بحوالہ قطب عالم گجراتی (م ۸۵۷ھ)۔ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۰ء

[۶] محی الدین قادری زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ صفحہ: ۲۵۔ نشاط پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۰ء

[۷] ایضاً صفحہ: ۲۵

[۸] مولوی عبدالحق۔ اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ صفحہ: ۵۶۔ انجمن پریس کراچی سنہ ۱۹۷۶ء

شاہ برہان الدین جانم کے کلام سے چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

۱- بھو دعات لوگی کریں بچار گر بن نہ پاویں سوے

۲- سادھوجن کی سیوا لیویں تو جیہ ہراپت ہوئے۔

۳- اس سوں جنتاں قایم سات۔

۴- نینوں مانہہ جوں کنکر ملے۔

۵- پلکیں میری آگ بلے کیوں

۶- ایساں جنتاں سوں ہے ذات [۹]

ان کا نثری رسالہ "کلمۃ الحقایق" ہے۔ مولوی عبدالحق نے "اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں اس سے جو نمونہ نقل کیا ہے اس کا ایک جملہ یہ بھی ہے :-

جدھاں کچ نہیں بھی تھا نہیں، دوجا شریک کوئی نہیں [۱۰]

شاہ وجیہہ الدین علوی کے فقرے ملاحظہ ہوں :-

۱- ولیوں کیاں صفتاں ہوتیاں ہیں۔

۲- جب ترقی پکڑ بن گے آپیں درس کہیں گے [۱۱]

ملاوجہی کی قطب مشتری (تصنیف ۱۰۱۸ھ) کے مصرعے دیکھیے :-

۱- کیا مومناں کا فراں مار مار

۲- خبر نیں ہے رستم کی ارواح کوں

۳- تو یاں نعمتاں غیب کیاں لیائے تھے

---

[۹] مولوی عبدالحق۔ اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ صفحات: ۵۸، ۵۷، ۳۵۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۶۸ء

[۱۰] ایضاً۔ صفحہ: ۶۶

[۱۱] ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادبِ اردو (جلد اول) صفحہ: ۱۰۱۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۴۔ بھریں چاند سیاں سندریاں اس ہنے

۵۔ تجے کوں اتیاں سیں خوشی آئی ایسے

۶۔ ہنجھ الیاں تجھے لاکھ باریاں امیں

۷۔ ستارے نین کیاں سب ریاں اس ہنے

۸۔ کہ لاکھاں تے چانداں کروڑاں تے سور

۹۔ اتھا حسن پوروان اتھیاں سندریاں

۱۰۔ کہ پانی کنارے کھڑیاں تھیاں پریاں ۱۲ ؎

"قطب مشتری" کی مندرجہ بالا مثالوں سے دکنی میں جمع کی قواعد کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یعنی اسم کے علاوہ، حرفِ اضافت، حرفِ تشبیہ، فعل اصلی و فعلِ امدادی، اسم عدد وغیرہ سبھی کی جمع بناڈالی ہے۔ ملا وجہی کی نثری تصنیف "سب رس" کے جملے بھی دیکھیے:۔

۱۔ وصل کی باتاں کا اس پر اثر چڑیا (چڑھیا) جو کچھ وہم کیا تھا سو اس کا ماں کے خیال میں پڑیا۔

۲۔ برے لوکاں شہر میں کوچے کوچے بھرے ہیں۔

۳۔ معشوقاں کے ناز اں کیا سمجھے۔ عاشقاں کے چھنداں کوں کیا جانے۔

۴۔ کس کس لذت بھرے درداں سوں انکھیاں میں پڑتا ہے بند ایک ایک۔

۵۔ نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر آسی۔

۶۔ ایک جھاڑ اسے کتیاں ڈالیاں سن۔ ہر ایک ڈال میں جنس جنس کے گن۔ ۱۳ ؎

قلی قطب شاہ کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ تم صالی کے گناہاں کا رحم کرتے ہیں گی۔

---

۱۲ ؎ ملا وجہی۔ قطب مشتری۔ صفحات: ۲۶، ۲۹، ۲۱، ۱۸، ۱۰، ۵، ۸۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۲ء

۱۳ ؎ ملا وجہی۔ سب رس (تصنیف ۱۰۴۵ھ) صفحات: ۱۴، ۱۹، ۵۲، ۵۱، ۵۸۔ انجمن پریس کراچی ۱۹۶۷ء

۲۔ خدایا رکھ جداں لگ ہیں ستارے

۳۔ اپن بخت میرے تھے کدہیں دل میں نہ کر غم

۴۔ موتیاں یاقوت کے گوگر ہیں انباراں لگے ۱۴

حسن شوقی کے بھی کچھ مصرعے یہاں نقل ہیں :۔

۱۔ خوش خرمی میں او بلتیاں چلیاں

۲۔ اکڑتیاں و بکھرتیاں اور جھلتیاں چلیاں

۳۔ کتیاں کوں کیا اپنیا لو لیا

۴۔ کہیں منصور ہو سرمست کہاویں آپ انا الحق

۵۔ سہریاں راکھے کیاں رانیاں مایلاں

۶۔ کہ بلقیس کے پانوں کیاں پایلاں ۱۵

"خاورنامہ" سے مثالیں دیکھیے :۔

۱۔ جو لوگاں تھے اس رکھ توں پہناں نگاہ

۲۔ ہر یک صورتاں میں تھے پردہ دھریا

۳۔ کدہیں خوب ہے ہور کدہیں ہے برا

۴۔ مگر عقل ہور معرفت سوں ابھیں

۵۔ اگر آگ پکڑے گی دنیا سبھیں

۶۔ اچھیں کیاں اگر تجھ کوں بھی خواہراں

۷۔ سُنے کیاں شمع جلتیاں تھیاں واں چہار

۱۴۔ قلی قطب شاہ - کلیاتِ قلی قطب شاہ - صفحات: ۲۱۴، ۳۸۲، ۲۳۵، ۴۰۰ - اعظم اسٹیم پریس دکن۔ سنہ ۱۹۴۰ء

۱۵۔ حسن شوقی - دیوانِ حسن شوقی - مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی - انجمن پریس کراچی - سنہ ۱۹۷۱ء

۸۔ پیغمبر نے جوش سوں ساریاں سوں ملے

۹۔ جو مانک نے اس ادمیاں کوں دیکھیا ۱۶؎

مثنوی "پھولبن" کے چند مصرعے حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ چمن کے جاں تلک پھولاں جو ہیں سب

۲۔ بندیاں نیناں پو دو ابرو کے محراب

۳۔ توں رکھ تازہ جتولیت کے مینہوں سوں

۴۔ نوازیاں پل میں تو افلاکیاں کوں

۵۔ کیا پھر کر مشرف خاکیاں کوں ۱۷؎

علی عادل شاہ ثانی شاہی کے کلام سے بھی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں :۔

۱۔ ابر شربت کے مشکاں کر درختاں تیں پلایا ہے

۲۔ کنول چندر کے اشکوں سوں چھپایا پنکھ میں اپنے

۳۔ بنور شہ کے صدر او پر سبھوں میں تو سہایا ہے ۱۸؎

"معراج العاشقین" کے چند جملے ہیں :۔

۱۔ حق کے باتاں نہ بولنا سو اچھے۔

۲۔ پیر کے صفتاں کوں اپنے صفتاں کوں مطالعہ کرنا سو۔

۳۔ دس سپارے بیس ہزار باتاں روح کے تعلق کہیاں۔

۴۔ تمام معراج کیاں نشانیاں دکھلائے۔

۱۶؎ کمال خان رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ (ترجمہ ۱۹۶۸ء) صفحات: ۳۸۳، ۸۲۱، ۴۲، ۵۲۶، ۱۲۰، ۸، ۶، ۵۔

۱۷؎ ابن نشاطی ۔ مثنوی پھولبن (تصنیف ۱۰۶۶ھ) صفحات: ۶، ۴، ۲، ۳۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۵ء

۱۸؎ علی عادل شاہ ثانی شاہی۔ کلیاتِ شاہی۔ صفحات: ۱۰۸، ۱۰۴۔ مسعود پرنٹنگ پریس۔ دہلی ۱۹۶۲ء

۵۔ اینتاں میریاں باتاں خوب سن۔ [19]

قاضی محمود بحری کے یہاں بھی یہی صورت ہے۔ چند مصرعے نقل ہیں:۔

۱۔ نگر بیچ باقی نگاراں جو تھیاں

۲۔ نگر ناز کیاں شہر یاراں جو تھیاں

۳۔ سو سب سرن کر تھیاں اتھیاں دیکھ اس

۴۔ الیں تیں بسرتیاں اتھیاں دیکھ اس [20]

ولی کے بھی چند مصرعے دیکھیے:—

۱۔ جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں

۲۔ بلبلیں گر یک نظر دیکھیں ترے مکھ کا چمن

۳۔ نہ لاویں پھر زباں اوپر بیاں خوباں ناں کا

۴۔ اگر تجھ حسنِ عالمگیر کوں دیکھیں سخن فہماں [21]

دکنی اردو کے نمونوں کے بعد اب شمالی ہند کے نمونے دیکھیے۔ امیر خسرو شمالی ہند کے قدیم شاعر ہیں جن کا ہندی/اردو کلام کم ہی دستیاب ہے لیکن جو کچھ دستیاب ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ان کا نہیں، ہم اس سے نمونے لینے اور نتائج کا استخراج کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ان کی ایک غزل میں "اں" اور "وں" دونوں طرح جمع بنائی گئی ہے۔ اس کے چند مصرعے دیکھیے:—

۱۔ کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

۲۔ سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

---

[19] منسوب بہ گیسو درازؒ۔ معراج العاشقین۔ صفحات: ۲۴، ۲۸، ۲۴، ۱۹۔ دکن دارالاشاعت کراچی۔ سنہ ۱۹۶۱ء

[20] قاضی محمود بحری۔ کلیاتِ بحری۔ صفحات: ۲۹۷، ۲۷۷۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۳۹ء

[21] ولی دکنی۔ کلیاتِ ولی۔ مرتبہ نورالحسن ہاشمی۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۵۴ء

۳- سپیت من کی ورائے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کی گتیاں ۲۲ـہ

پنڈت چندربھان برہمن ایک اور قدیم شاعر ہیں اور کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو میں غزل سب سے پہلے برہمن ہی نے لکھی ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے کلام سے درج ذیل مصرع بھی نقل کیا ہے :-

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں ۲۳ـہ

محمد افضل، افضل جھنجھانوی ایک اور قدیم شاعر ہیں ۔ افضل اور وجہی کا زمانہ ایک ہی ہیں ۔ افضل کی نظم "بارہ ماسہ" یا "بکٹ کہانی" بہت مشہور ہے ۔ اس کے چند مصرعے درج ذیل ہیں :-

۱۔ کہو کیسے جیوں میں پیا باج ناری

۲۔ جنھیں رووت گئی ہے عمر ساری

۳۔ مرم دل درد مندوں کا نہ جانے

۴۔ اپنا دکھڑا غریبوں کو نہ دیجے

۵۔ کریں عشرت پیا سنگ ناریاں سب ۲۴ـہ

اسمٰعیل امروہوی کے بھی چند مصرعے ملاحظہ ہوں :-

۱۔ گناہاں میں بھریا ہوں میں بے شمار

۲۔ سبھی عورتاں بولے سن یو بتیں ۔

۳۔ جتی بہشتی اُشتیاں جو ہیں گی تمام

۴۔ زرو جوہراں سے بھری ہے (یہ) تمام

۵۔ کھاویں گے بہوت وے خوش ہوئے کر

۲۲ـہ ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) صفحات: ۲۸، ۳۱ ۔ زرین آرٹ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۷۵ء

۲۳ـہ ایضاً صفحہ: ۲۷

۲۴ـہ ایضاً ۔ صفحات: ۶۵، ۶۶

۶۔ محمدؐ سبھوں پر کیا نا سردار ۲۵

فائز دہلوی کے چند مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ بھواں تیری شمشیر زلفاں کمند

۲۔ عاشقاں کا ہوا ہے دل غربال

۳۔ سبن پر کرتے لاگا ترک تازی ۲۶

شاہ مبارک آبرو کے بعض کچھ مصرعے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ کہتا تہارے درد سوں ہجراں کے مرگیا

۲۔ تجھ لباں کی ہیں کو خوں خواری

۳۔ تجھ او پر خون بے گناہوں کا

۴۔ اس سے سنگیں دلاں کا شوق نہ کر ۲۷

محمد شاکر ناجی کے مصرعے دیکھیے :۔

۱۔ موزوں قد اس کا چشم کی میزاں میں جب تُلا

۲۔ جورو یا درد کے انجھواں سے یوسف ۔ ۲۸

غلام مصطفیٰ یکرنگ کا مصرع ہے :۔

اس کو مت جانو میاں اوروں کی طرح ۲۹

---

۲۵ اسمٰعیل امروہوی۔ اردو کی دو قدیم مثنویاں۔ صفحات: ۱۹۸، ۱۸۱، ۱۴۸، ۱۳۶، ۱۱۳۔ نقوش پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۹ء
۲۶ فائز دہلوی۔ دیوانِ فائز۔ صفحات: ۱۹۸، ۱۸۱۔ محمدن پریس۔ دہلی۔ سنہ ۱۹۴۶ء
۲۷ شاہ مبارک آبرو۔ دیوانِ آبرو۔ صفحات: ۷۳، ۷۲، ۱۶۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔ یونین پرنٹنگ پریس۔ دہلی۔

۲۸ محمد حسین آزاد ۔ آبِ حیات ۔ صفحات: ۱۰۳، ۱۰۴۔ ناشر شیخ مبارک علی۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۵۰ء

۲۹ ایضاً صفحہ: ۱۰۷

شاہ حاتم کے مصرعے ملاحظہ ہوں :-

۱- دل کو مارا چشم نے ابرو کی تلواروں سے آج

۲- مجھ کو مخالفوں کی بدی سے نہیں ہے خوف

۳- کسی کی زلف کے سودا میں آج چشموں سے

۴- تو پہلے اس کو سبھوں سے جدا کرے معشوق ۳۰ے

۵- جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں

۶- تب سے جہاں میں لوٹے دعویں مچائیاں ہیں

۷- تم کیوں بڑھائیاں ہیں اور کیوں گھٹائیاں ہیں ۳۱ے

عبدالحیٔ تاباںؔ کے بھی چند مصرعے درج ذیل ہیں :-

۱- ہوا ہوں گم میں لشکر میں پری رویاں کے ہی ظالم

۲- کہاں ڈھونڈوں کسے پوچھوں نہیں پایا نشاں اپنا

۳- ملیح ہو خیر سے جا ہم سے رکھائیاں ہیں - ۳۲ے

مرزا مظہر جانجاناں کے مصرعے ملاحظہ ہوں :-

۱- جھکی ہے فوجِ گل اور عندلیباں کی بہار آئی

۲- رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی ۳۳ے

انعام اللہ یقینؔ کے مصرعے بھی درج کیے جاتے ہیں :-

۳۰ے شاہ ظہورالدین حاتمؔ - دیوان زادہ - صفحات : ۲۷ ، ۱۲۷ ، ۸۱ ، ۳۲ - جدید اردو ٹائپ پریس لاہور سنہ ۱۹۷۵ء

۳۱ے شاہ ظہورالدین حاتمؔ - شاہ حاتم حالات و کلام - صفحات : ۱۴۵-۱۴۴ - جدید اردو ٹائپ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۴ء

۳۲ے میر عبدالحیٔ تاباںؔ - دیوانِ تاباںؔ - صفحات : ۱۹۱ - ۲ - ۲ - مرتبہ مولوی عبدالحق - انجمن ترقیٔ اردو ہند - دکن - سنہ ۱۹۳۵ء

۳۳ے ثناء الحق ایم اے - میر و سودا کا دور - صفحات : ۲۰۷ - ۲۱۰ - جاوید پریس - کراچی - سنہ ۱۹۵۹ء

شاہ حاتم کے مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ دل کو مارا چشم نے ابرو کی تلواروں سے آج

۲۔ مجھ کو مخالفوں کی بدی سے نہیں ہے خوف

۳۔ کسی کی زلف کے سودا میں آج چھٹوں سے

۴۔ تو پہلے اس کو سبھوں سے جدا کرے معشوق ۳۰

۵۔ جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں

۶۔ تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں

۷۔ تم کیوں بڑھائیاں ہیں اور کیوں گھٹائیاں ہیں ۳۱

عبدالحئی تاباں کے بھی چند مصرعے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ہوا ہوں گم میں لشکر میں مری رویاں کے ہی ظالم

۲۔ کہاں ڈھونڈوں کسے پوچھوں نہیں پایا نشاں اپنا

۳۔ ملتے ہو غیر سے جا ہم سے رکھائیاں ہیں۔ ۳۲

مرزا مظہر جانجاناں کے مصرعے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ جھلی ہے فوج گل اور عندلیباں کی بہار آئی

۲۔ رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی ۳۳

انعام اللہ یقین کے مصرعے بھی درج کیے جاتے ہیں:۔

۳۰۔ شاہ ظہور الدین حاتم۔ دیوان زادہ۔ صفحات: ۲۷، ۱۲۷، ۸۱، ۳۲۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۷۵ء

۳۱۔ شاہ ظہور الدین حاتم۔ شاہ حاتم حالات و کلام۔ صفحات: ۱۴۵، ۱۴۴۔ جدید اردو ٹائپ پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۴ء

۳۲۔ میر عبدالحئی تاباں۔ دیوان تاباں۔ صفحات: ۱۹۸۔ ۲-۲۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ دکن۔ سنہ ۱۹۳۵ء

۳۳۔ ثناء الحق ایم اے۔ میر و سودا کا دور۔ صفحات: ۲۰۷۔ ۲۱۰۔ جاوید پریس۔ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۹ء

۱۔ طرز ہیں سخن کے اس کی تم نے اُڑائیاں ہیں

۲۔ تری آنکھوں کی کیفیت کو مینا نے سے کیا نسبت

۳۔ نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

۴۔ بندہ جو تو بتاں کا ہوا کیا خدا نہ تھا ۳۴

گویا کے مصرعے ہیں :۔

۱۔ روتے ہیں پھر دیکھ کر شہائے ہجراں کی طرف

۲۔ پھر لوٹیں زلفوں کا سودا سلسلہ جنباں ہوا ۳۵

شمالی ہند کی قدیم نثری تصنیف "کربل کتھا" کے چند جملے دیکھیے :۔

۱۔ شاہزادوں نے کیا واویلا ، اس تاکید سے کچھ بھی نہیں بولا دیا۔ (ہلایا)۔

۲۔ کہتیاں اے کاش ماں ہماری فاطمہؓ الزہرا جیوتی ہوتی۔

۳۔ یا مدینہ میں دادا کی قبر پر ہوتیاں تا دردِ دل اپنا اوس قبر سے کہتیاں۔

۴۔ نہ جانوں کہ ظالمانِ امت تم سے کیا کریں۔

۵۔ مہذب کیا ہوا اخبارات شہاداتِ ریحانتین گلستانِ مصطفوی کی ہے اور مرتب کیا ہوا آثاراتِ حکایاتِ قرۃ العینین درستانِ مرتضوی کی ہے ، موسوم بہ کربل کتھا۔

۶۔ جس میں احوال ہمارے اور مناقب اور احادیث ہماری بیان کرتے ہوئیں۔

۷۔ اے باپ یتیموں کے اور اے پناہ بے کسوں اور غریبوں اور بے چاریوں کے ، ہم بغیر تیرے کیوں کر جیوں گیاں اور بغیر تیرے دیدار کے کیونکر زندگی کریں گیاں۔ ۳۶

---

۳۴ ثناء الحق ایم اے۔ میر و سودا کا دور۔ صفحات: ۲۲۵ - ۲۲۳ - ۲۱۴ - جاوید پریس کراچی سنہ ۱۹۶۵ء

۳۵ گویا ۔ دیوانِ گویا ۔ صفحہ : ۱۴۵ ۔ مطبع نامی منشی نولکشور۔

۳۶ فضل علی فضلی ۔ کربل کتھا۔ صفحات : ۸۹ ، ۵۱ ، ۳۷ ، ۶۷ ، ۸۹ ، ۶۷ ۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین۔ دیال پرنٹنگ پریس دہلی سنہ ۱۹۶۵ء

درد کے مصرعے ہیں :-

۱۔ سو بار دیکھیاں ہیں تری بے وفائیاں

۲۔ آنکھ پہ پر نظر ہیں سبھوں کے جو اں ہنوز

۳۔ اپنی آنکھوں اسے میں دیکھوں ۔

۴۔ درد اپنے ساتھ آنکھیں دل کو بھی لے ڈوبیاں ۲۷

میر کے مصرعے دیکھیے :-

۱۔ ہے اس کی حرفِ زیر لبی کا سبھوں میں ذکر

۲۔ وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں

۳۔ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

۴۔ ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں

۵۔ ہر کنھوں نے ہیں اس ڈھب سے زباں بازی کی

۶۔ آنکھوں پہر لگا ہی کھڑے ہے تمہارے ساتھ

۷۔ کچھ ان دنوں میں غیر بہت یار ہو گیا

۸۔ راتوں کے تئیں معیتیں گزریں ۔

۹۔ کرتے ہیں دعوائے خوش چشمی آہوانِ دشت

۱۰۔ آتش کس کس جگہ لگائی ہیں ۔

ع وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں ❊ اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں ۲۸

سودا کے بھی کچھ مصرعے درج کیے جاتے ہیں :-

---

۲۷ خواجہ میر درد - دیوانِ درد - صفحات: ۵۹، ۷۵، ۸۰، ۶۷ - زرین آرٹ پریس - لاہور ۱۹۶۲ء

۲۸ میر تقی میر - کلیاتِ میر - صفحات: ۹۱۸، ۱۶، ۹۵۷، ۱۶، ۲۴، ۲۵، ۱۶ - مطبع نولکشور لکھنؤ - ۱۹۴۱ء

۱۔ ملیے اگر بتاں سے ہے لطف زندگی کا

۲۔ سودا مرا آج تیری آنکھیں بھرائیاں ہیں

۳۔ کٹتے ہیں کس طرح راتیں ہمیں یہ ہجر کی بٹریاں

۴۔ لکیریں انگلیوں کی گھس گئیں گنتے سوئے گھڑیاں

۵۔ کن نے چمن میں آن کے آنکھیں لڑائیاں ۳۹

مثنوی "سحر البیان" کے مصرعے ہیں:۔

۱۔ ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں

۲۔ پھریں اپنے جوبن پہ اتراتیاں

۳۔ سبھوں نے لیا پتلیوں پر اٹھا ۴۰

میر شیر علی افسوس کی "باغ اردو" کا جملہ ہے:۔

خلافِ رائے عقلمندوں کا ہے کہ اس امید میں اور اس بیم میں اپنے تئیں ڈالیے ۴۱

افسوس کی "آرائشِ محفل" کے بھی چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ سبھوں نے مارے شرم کے اپنی آنکھیں موندلیں۔

۲۔ دکھ بھرتی ہیں اگرچہ نوجوانیں ہی کیوں نہوں۔

۳۔ جنگلوں میں بھی بیشتر سبزہ ڈھڑھا، درخت سہاؤنے سہاؤنے ہزار ہا ۴۲

میر امن کی "باغ و بہار" کے جملے دیکھیے!۔

۳۹۔ مرزا رفیع سودا۔ کلیاتِ سودا۔ صفحات: ۲۷، ۶۵۲، ۹۶، ۶۲۔ زرین آرٹ پریس لاہور

۴۰۔ میر حسن۔ سحر البیان۔ صفحات: ۲۰، ۲۰، ۲۰۔ ناجی پریس لاہور۔ سنہ ۱۹۶۳ء

۴۱۔ میر شیر علی افسوس۔ باغ اردو۔ صفحہ: ۲۰۔ زرین آرٹ پریس۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۶۳ء

۴۲۔ میر شیر علی افسوس۔ آرائشِ محفل۔ صفحات: ۲۲۵، ۶۵، ۲۵۵۔ زرین آرٹ پریس لاہور سنہ ۱۹۶۳ء

۱۔ سبھوں نے کہا آمنا یہی بات ہے۔

۲۔ جلادوں نے وو نہیں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں۔ [۲۳]

میر امن کی "گنجِ خوبی" سے مثالیں دیکھیے :۔

۱۔ اور تھوڑے فائدے کی خاطر سینکڑوں جان کا نقصان کرتا۔

۲۔ اور طاعت پالنوں کی یہ ہے کہ مسجدوں اور معبدوں میں جاوے اور اولیاؤں کے مزاروں کی زیارت کرے۔

۳۔ حویلیاں اور جھونپڑیاں رعیتوں کی اپنے نوکروں کے اترنے اور رہنے سے محفوظ رکھے۔ [۲۴]

سید انشاء اللہ خاں انشا کے مصرعے ہیں :۔

۱۔ سبھوں کے طعنے جدا ناصحوں کے پند جدا

۲۔ کیا شہر ہے یہ دیکھو برسوں جنوں کی خاطر

۳۔ سو بار ٹھنڈی سانسیں گو لب تک آئیاں ہیں

۴۔ درگاہوں بیچ جا جا راتیں جگائیاں ہیں [۲۵]

انشا کی نثری تصنیف "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" سے دو جملے ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ جیتے رہتے اونھیں سبھوں کا آسرا اور ان کے گھرانے کا رکھتا ہوں بتیسوں گھڑی۔

۲۔ ان بول کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے کس کس روپ کے پھول اگلتا ہوں [۲۶]

مرزا جان طپش کے مصرعے ہیں :۔

۱۔ فرقت میں جن کی ہم نے یہ حالتیں سہیں ہیں

---

[۲۳] میر امن ۔ باغ و بہار ۔ صفحات : ۱۰۲ ۔ ۳۳ ۔ حمایت الاسلام پریس لاہور ۔ سنہ ۱۹۶۸ء

[۲۴] میر امن ۔ گنجِ خوبی ۔ صفحات : ۲۰ ۔ ۱۸ (ترجمۂ اخلاقِ محسنی مُلّا حسین واعظ کاشفی) ۔ ادبی پرنٹنگ پریس بمبئی سنہ ۱۹۶۶ء

[۲۵] سید انشاء اللہ خاں انشا ۔ کلیاتِ انشا ۔ صفحات : ۲۵۴ ۔ ۲۵۲ ۔ ۲۵۴ ۔ ۳۹ ۔ ریڈنگ پرنٹنگ پریس لاہور۔

[۲۶] انشا ۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی ۔ صفحات : ۴۷ ۔ ۴۵ ۔ انجمن پریس کراچی ۔ سنہ ۱۹۷۵ء

جمع
صفحہ ١٧

۲ - خونناب دل کی لہر تو جوئیں کئی بہیں ہیں۔ ٤٧

قائم کے مصرعے ہیں :-

١ - لے چکے دل تو بتاں ان سے سر ا تنا تو کہو — ١٠٩

۲ - مل کے ہاتھوں میں نہ اس حسن کی بے آب کریں — ١٠٠

٣ - نہ لٹ دھوئیں کی ہے ایسی نہ زلف سنبل کی — ٩٣

٤ - نہ جانے جاتے ہیں جوں شعلہ ہم کدھر قائم ٤٨ — "

دیوانِ میر حسن کے دو مصرعے دیکھیے :-

١ - عجب لکھا انہوں کا جنھیں جواب لکھا

۲ - انہوں کے تو لینے میں اتنا عبث ٤٩

میر انیس کا مصرع ہے :-

بچوں سے مرے ہووے تو ہو پیاس کی بیداد ٥٠ — ١٠٩

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں بھی جہاں موجودہ قاعدے کے مطابق جمع بنائی جاتی تھی وہاں دکنی قاعدے کے مطابق جمع بنانے کی مثالیں بھی موجود ہیں تاہم اس قدر بے قاعدگی شمالی ہند میں دیکھنے میں نہیں آتی چنانچہ یہاں 'تھی' کی جمع تھیاں، 'گی' کی جمع گیاں، 'کی' کی جمع کیاں، اور ایسی جیسی، اتنی، کتنی، سب اور لوگ کی جمع ایسیاں، جیسیاں، اتنیاں، کتنیاں، سبھوں اور لوگاں وغیرہ عام طور پر نہیں۔ سبھوں البتہ کہیں کہیں استعمال ہوا ہے۔ جمع الجمع کی مثالیں البتہ مل جاتی ہیں اور کہیں کہیں جمع کے عربی فارسی قاعدے بھی برتے گئے ہیں۔

---

٤٧ ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ داستانِ زبانِ اردو۔ صفحات: ١٦٩ - ١٧٠ (بحوالہ مرزا جان طپش)

٤٨ قائم - اردوئے معلیٰ قائم نمبر - صفحات: ٩٣ - ١٠٠ - ١٠٩ - مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔

٤٩ میر حسن - دیوانِ میر حسن - صفحات: ٨ - ٣٠ - مطبع منشی نولکشور - لکھنؤ۔

٥٠ میر انیس - مراثیٔ انیس - صفحات: ١٠٩ - علمی پرنٹنگ پریس - لاہور۔ سنہ ١٩٥٩ء

اسی ذیل میں عدد و معدود کی مطابقت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں موجودہ قاعدہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ عدد جمع ہو تو معدود واحد استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے کثرت مراد لی جاتی ہے۔ اقبال کا مشہور مصرع ہے :۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے۔ ۵۰

یہی قاعدہ شمالی ہند میں بھی تھا۔ ایک مصرع دیکھیے :۔

ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے۔ ۵۱

انشا کی "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" کا جملہ ہے :۔

جیتے رہتے اولیں سبھوں کا اسرار کھتا ہوں ہتیوں گھڑی۔ ۵۲

میراتن کی "گنجِ خوبی" کے جملے دیکھیے :۔

۱۔ اور تھوڑے فائدے کی خاطر سینکڑوں جان کا نقصان کرتا۔

۲۔ اور نشان ثبات کا دو چیز ہیں۔

۳۔ ان دونوں بل میں سے کونسا بل اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ۵۳

کبھی عدد واحد کے ساتھ معدود جمع بھی لایا جاتا ہے مثلاً "گنجِ خوبی" ہی کے دو جملے دیکھیے :۔

۱۔ ایک امرا اس گھڑی حاضر تھا۔

۲۔ ایک اصحاب نے حضرت رسالت پناہ سے سوال کیا ۵۴

دکنی میں بھی یہ قاعدہ موجود رہا ہے مثلاً شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری کا یہ فقرہ :۔

اس چار رباتاں کا بند ہے۔ ۵۵

---

۵۰ – علامہ اقبال۔ ضربِ کلیم۔ غلام علی پبلشرز۔ لاہور۔ سنہ ۱۹۷۶ء

۵۱ – آتش (خواجہ حیدر علی)۔ کلیاتِ آتش۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مطبع عالیہ لاہور۔ سنہ ۱۹۷۲ء

۵۲ – سید انشاء اللہ خان انشا۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی۔ صفحہ ؟۔ انجمن پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۷۵ء

۵۳، ۵۴ – میراتن۔ گنجِ خوبی۔ صفحات: ۲۰ - ۵۵۔ ادبی پرنٹنگ پریس۔ بمبئی۔ سنہ ۱۹۶۶ء

۵۵ – ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ صفحہ ۲۵۔ نشاط پریس کراچی۔ سنہ ۱۹۶۰ء

لاحقہ "ان" سے جمع بنانے کے سلسلے میں شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ جمع کا یہ قاعدہ پنجابی، سندھی، مارواڑی، مشرقی ہندی میں بھی ہے اور اس لحاظ سے قدیم ہے کہ اس کا جوڑ سنسکرت لاحقۂ جمع (بے جنس) "آنِ" (اا ج مکسور) سے لگایا جا سکتا ہے لیکن اردو کے گہرے تاریخی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'ان' کی جمع اردو میں 'وں' کی جمع سے زیادہ قدیم نہیں۔

قدیم اردو اور پنجابی میں اسمائے عام یعنی ضمائر، اشارات، موصولات، کنایات، حروفِ استفہام کے جمع کے صیغے بول چال اور نثر کی زبان میں اس وقت استعمال ہوتے تھے جب کثرت پر زور دیا جاتا تھا۔ یا مجموعہ اشیا اور جمعیتِ افراد کا اظہار مقصود ہوا کرتا تھا۔ یہ طریقہ قدیم سے ان زبانوں میں رائج چلا آتا تھا۔ اردو میں چار (جمع) کی جمع چاروں، سب (سبھو، جمع) کی جمع سبھوں، لوگ (جمع) کی جمع لوگوں رائج رہی، اس کے علاوہ دوسری جمع کے یہ صیغے بھی مستعمل رہے، اُنہوں (اُن، جمع کی جمع)، اِنہوں (جمع اِن)، جنہوں (جن کی جمع) کنھوں (کن کی جمع)۔ مزید برآں سبھوں، متھوں وغیرہ (لیکن یہ اب متروک ہیں)۔ انہوں، انہوں، جنہوں، کنہوں، یہ صیغے قدیم اردو میں اس طرح مستعمل تھے انہوں کا، جنہوں سے، انہوں کو، کنھوں سے وغیرہ۔ اب یہ استعمال روزمرہ کے خلاف ہے۔ آج یہ صیغے حروف 'نے' کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ سے، کو، کا، پر وغیرہ کے ساتھ ان کا استعمال صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ صیغے 'وں' پر ختم ہوتے ہیں۔ ان پر 'نے'، بڑھا کر، اُنہے، جنہے کہیں تو اشتباہ ہوتا ہے اس کے علاوہ دو نونوں کا اجتماع ناگوار ہوتا ہے۔ کو، کا، وغیرہ حروفِ مغیرہ ان کلمات پر اضافہ کر کے جن کو یا جن کا یا جن سے، ان کو، ان کا، ان سے، کہنے میں کوئی قباحت نہ تھی اس لیے 'نے' کے ساتھ قدیم جمع کے صیغے برقرار رہے۔ کو، کا، وغیرہ حروف کے ساتھ ان میں تخفیف کر لی گئی۔ بہر حال ان صیغوں کی یہ بناوٹ بڑی پرانی ہے اور اغلب یہ ہے کہ جس زمانے میں ان پر 'وں' بڑھایا گیا اردو اور پنجابی میں 'ان' زیادہ کرنے کا رواج نہ تھا لہٰذا ان پر 'ان' نہیں بڑھا۔ یہ اپنی قدیم شکل ہی میں رائج رہے۔ شوکت صاحب کے خیال میں 'ان' سے جمع بنانے کا قاعدہ فارسی کے اثر سے اردو میں آیا۔ اول اول اردو میں یہ عربی فارسی الفاظ تک محدود رہا۔ اہلِ دکن نے غالباً استعمال کے زیرِ اثر اس قاعدے کو عام کر دیا اور ہندی لفظوں پر بھی یہ عمل کرنے لگے۔ پہاڑ کی جمع پہاڑان اور بات کی جمع باتاں بنانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ افعالِ اصلی، افعالِ معاون، حروف، صفات سبھی پر یہ قاعدہ لاگو کر دیا۔ اس ابتری و ناہمواری کو دور کرنے کے لیے اردو نے اختصار پسندی کے تحت یہ اصول قائم کر دیے: 'اں'، 'ی' پر ختم ہونے والے مونث اسما کے ساتھ مخصوص ہوا۔ باقی مونث اسمائی قائم حالت میں 'یں' سے جمع بنی اور مذکر اسمائی مختوم 'ے' سے۔ بشرطیکہ وہ الف پر ختم ہوں۔ مغیرہ حالت میں تمام اسمائی جمع، خواہ مذکر ہوں یا مونث، الف پر ختم ہوتے ہوں یا 'ے'، پر، 'وں' کے اضافے سے جمع بنائی گئی۔ اب یہ قاعدہ کلیہ

مباحث کا خلاصہ

زیرِ نظر مقالے "اردو صرف و نحو کے تغیرات" کے مطالعے سے جو نتائج سامنے آئے ان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔
اسم کے سلسلے میں اول اسم خاص کا ذکر آتا ہے۔ اسم خاص میں اسم ذات، کنیت، لقب، عرف، تخلص سب شامل ہیں۔ اس تعلق سے بہت زیادہ تغیرات دیکھنے میں نہیں آئے۔ عرف اور لقب کچھ اس قسم کے نظر سے گزرے جیسے نواب شجاع الدولہ بہادر کے بیٹے کا نام نواب امین الدولہ معین الملک تھا لیکن وہ "مرزا مینڈھو" کے نام سے مشہور تھے۔

تذکرۂ "خوش معرکۂ زیبا" میں ایک شاعر مرزا حکیم فضل اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا عرف "مرزا بنیا" تھا۔ ایک اور شاعر احمد حسن خاں جوش کا بھی ذکر کیا گیا ہے ان کا عرف "اچھے میاں" تھا۔ اسی طرح میر تقی میر کے صاحبزادے عسکری کا عرف "میر کلو" تھا۔

تذکرۂ "سراپا سخن" میں سید ابو تراب (خلف سید اکرام علی) کا تذکرہ ملتا ہے ان کا عرف "ننھو صاحب" تھا۔ اسی طرح کچھ اور تخلص اور عرف بھی ملتے ہیں مثال کے طور پر "خواجہ سہنیگا" اور "ججگو" وغیرہ۔

بعض ناموں اور عرفوں میں ہندیت بھی پائی جاتی ہے مثلاً "منشی ننھکّن" ان کا تعلق ٹونک سے تھا۔ پورا نام منشی ننھکّن لال اور تخلص "بہجت" تھا۔ تذکرۂ "بہارِ سخن" میں "ہرن مار" اور "تکہ غنی" جیسے عرف و لقب بھی نظر سے گزرے۔

میر نے اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں ایک شاعر "میاں صلاح الدین" کا تذکرہ کیا ہے ان کا تخلص "پاک باز" اور عرف "مکھّن" تھا۔ دکن کے صوفی بزرگوں میں بھی اس قسم کے لقب اور عرف ملتے ہیں مثلاً محبوب عالم، عرف "شیخ جیون"۔ ایک بزرگ "شیخ بہاء الدین" باجن کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کا تخلص بھی "باجن" ہے۔
اس رجحان کا اثر بعض عربی فارسی ناموں پر بھی نظر آتا ہے، ان پر بھی اسی طرح نون کا اضافہ کر دیا گیا ہے جیسے "قطبن" جو بھاشا کے سربرآوردہ شاعر تھے۔

بعض اسما کو جو مذکر تھے، نون بڑھا کر مونث بنانے کا رجحان بھی ملتا ہے مثلاً امیر سے امیرن۔ کریم سے کریمن۔ نجیب سے نجیبن، نذیر سے نذیرن اور ظہور سے ظہورن وغیرہ۔ شمالی ہند میں یہ رجحان عام تھا چنانچہ سید انشاء اللہ

نے اسمائے مذکر و مونث کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی مشہور فارسی تصنیف "دریائے لطافت" میں لکھا ہے کہ :۔

"وبعضی اسما مشترک بُوَد مانند قطبن و مرادن و جمیت کہ اصل آں در مذکر قطب الدین و مراد علی و جمیت خاں و در مونث قطبی بیگم و بی مراد و بی جمیت باشد۔ و امیر بخش و پیر بخش و لونر بخش و کریم بخش و حسن بخش و حسین بخش و مرتضٰی بخش وغیر آں ہمہ مشترک در مذکر و مونث است۔ و ترخیم آں اگر با واؤ مجہول بُوَد دلالت کنند بر تانیث چوں امیرو۔ و بغیر واؤ برائے مذکر آید مثل امیر وغیر آں۔ و در مذکر و مونث پیر بخش الف مقابل واؤ مجہول باشد مانند پیرُو، و پیرا، و در لونر بخش قاعدۂ پیر بخش جاری است لیکن در امیر بخش و لونر بخش واؤ مونث بالون ہم مبدل شود چوں اَمیرَنْ و لُوزَنْ و پیرَنْ صحت ندارد و مسموع ہم نیست و از کریم بخش کریمو و کریمن، بیشتر شنیدہ می شود۔ و از امام بخش امامو با واؤ مجہول بیشتر و امامن کم۔ و از حسن بخش در مذکر حسّو با واؤ معروف مشہور و حسّو با واؤ مجہول در مونث ناشنیدہ۔ و از حسین بخش حسینی با یا، معروف مشترک در مذکر و مونث۔ و از مرتضٰی بخش ترخیم بخاطر نیست۔ و ایں اسما مخصوص بزنان کسبی باشد نہ نام زبانِ شرفا۔ و کنیزو کنیزان ایشاں کہ صنو بر و یاسمن و گل اندام و رائے بیل و موگرا و چنبیلی و سیوتی و موتیا و نرگس و سوسن و ہمیشہ بہار و جمع دولت باشد۔ لقب سوائے نام حسن نیست مثل ملّو و چھبیا و بنو و ننھی وغیر آں زیرا کہ زنانِ شرفا و کسبی ہر دو دخترانِ خود را بایں لقب خوانند و در رفتہ رفتہ قاعدہ نیست کہ دخترانِ خود را موسوم بظہور النساء و نور النساء سازند و آنہا را ظہورن و نورن شہرت دہند۔" (دریائے لطافت۔ صفحہ ۱۲۸-۱۲۷)

اس اقتباس سے وہ قاعدے واضح ہیں جو شمال ہند میں اسمائے مذکر و مونث کے ساتھ روا تھے۔

فارسی اور عربی انداز کے عرف و لقب بھی قدیم اردو میں دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً شیخ عین الدین "گنج العلم"، شاہ میراں جی "شمس العشاق"، شیخ بہاء الدین برناوی "خاتم السالکین"، ملک خوشنود "قطبِ عالم" اور "شاہ عالم" وغیرہ۔

تخلص کے سلسلے میں بھی اکثر فارسی و عربی انداز نظر آتا ہے جیسے ایاغی (محمد امین)۔ شغلی۔ ابنِ نشاطی۔ ضعیفی داؤدی۔ وجہی وغیرہ۔ بعد میں اس قسم کے اسما تخلص کے طور پر اپنائے گئے جن میں کسی صفت کو تخلص کے طور پر اپنایا گیا تھا جیسے آبرو۔ آرزو۔ ناجی۔ مومن، شیفتہ، آزردہ، غالب، آزاد، ذوق وغیرہ۔ دکنی شعرا میں وجدی، شفیق، نصرتی، شوقی وغیرہ۔ یا بعض اسما پر یائے نسبتی کے اضافے سے تخلص اختیار کیے گئے مثلاً حالی، فانی، حسرتی، ذوقی وغیرہ۔

دورِ قدیم میں جہاں 'نون' کے لاحقے کے ساتھ نام، تخلص اور عرف نظر آتے ہیں وہاں ایسے تخلص اور عرف بھی نظر آتے ہیں جو فارسیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً جانم (جان سے) ایانم (ایان سے) بعد میں اضافت کے ساتھ ایسے القاب نظر آتے ہیں جیسے جانِ جاناں (مرزا مظہر) خانِ خاناں (عبدالرحیم یا ابراہیم) وغیرہ۔

اسم کیفیت کے سلسلے میں یہ چیز نظر سے گزری کہ اردوئے قدیم میں فعل سے اسم کیفیت بنالیتے تھے جیسے کرنا سے کرت، پھرنا سے پھرت، گرنا سے گرت، چلنا سے چلنت، کرنا سے کرن، بچارنا سے بچارن، گھمنا سے گھمن، ترنا سے ترن، اڑنا سے اڑن، مرنا سے مرن، دھرنا سے دھرن وغیرہ۔ ہاشمی دکنی کے یہاں بسرنا سے بسراٹ اور کھکھیانا سے کھکھیاٹ بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ صفت سے اسم کیفیت بنانے کے سلسلے میں ایسے تغیرات نظر سے گزرے مثلاً کڑوا سے کڑوائی اور کڑواس نرم سے نرمائی، غرور سے غروری اور مغروری (بمعنی غرور) نفنا سے نفس پن، بڑا سے بڑپن اور بڑپن وغیرہ۔ اسم پر لاحقہ "گی" بڑھا کر اسم کیفیت بنانے کی مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً حیران سے حیرانگی، پریشان سے پریشانگی وغیرہ۔ اب ان کی جگہ حیران اور پریشانی بولتے اور لکھتے ہیں۔

اسم فاعل، اردو میں، مصدر یا حاصل مصدر پر لاحقہ "والا" اضافہ کرنے سے بنتا ہے۔ قدیم اردو میں اس کی جگہ "ہار" اور "ہارا" اضافہ کرتے تھے۔ جیسے پالن ہار، کھیون ہار، کہن ہار، سنن ہار، بولنہارا وغیرہ۔ لیکن موجودہ قاعدہ بھی مفقود نہیں تھا۔ شمالی ہند میں "ہار" اور "ہارا" کے اضافے سے اسم فاعل بنانے کی مثالیں نہیں۔ اردوئے قدیم میں یہ قاعدہ دکنی سے مخصوص ہے شمالی ہند کی اردو میں صرف "والا" لگا کر اسم فاعل بنایا جاتا تھا۔

اس کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "والا" سنسکرت "پالک" کا بچہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "گوالا" سنسکرت میں "گوپالک" تھا۔ "پ" کا تبادل "و" سے بہت عام ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ "والا" اول اول "گوالا" سے تراشا گیا بعد میں بطور لاحقہ دوسرے اسما اور مصادر سے جوڑا جانے لگا۔

ہو سکتا ہے کہ "گوالا" "گئو والا" کی مخفف صورت ہو۔ (گئو پالک اور گئو والا یعنی گائیں پالنے یا چرانے والا)۔ اس لحاظ سے لاحقہ "والا" نسبتاً قدیم ہوگا اور اس طرح اسما پر جوڑا جاتا ہوگا جس طرح "گئو" یا "گو" پر لاحق کیا گیا ہے۔ چنانچہ "والا" کو "گوالا" سے تراشنا مناسب نہیں لگتا۔

لاحقہ "دھار" کو سنسکرت "دھارک" (رکھنے والا) سے مشتق بتاتے ہیں۔ کیلاگ کا کہنا ہے کہ ہردائی کی نظم "راسو"

کی پہلی سطر میں استعمال ہونے والا "دھارن دھاریم" کی ہندی "دھارن ہارا" ہے۔

ڈاکٹر ٹریپ نے "ٹھار" کو سنسکرت "ٹھار" سے نکالا ہے جب کہ شوکت صاحب کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ "ٹھار" کو فارسی "تار" سنسکرت "ترِ" سے ماخوذ مانا جائے۔ اس لیے کہ "ت" کا "تھ" سے بدل جانا آسان ہے اور پھر "تھ" کا "ہ" ہو جانا بھی معمولی بات ہے۔ ہندی "کرتار" بھی "تار" لگا کر بنایا گیا تھا۔

اردو میں اسم موصول "جو" ہے۔ قدیم اردو میں اس کی جگہ "جے" استعمال ہوتا تھا تاہم "جو" بھی مفقود نہیں تھا۔ "جو" غیر فاعلی صورت میں واحد کے لیے "جس" اور جمع کے لیے "جن" ہو جاتا ہے اور مفعولی صورت میں جیسے "جس کو" اور "جنھیں"۔ "جس" کے جواب میں "تس" بولا جاتا ہے جمع کے لیے "تن" "تنھن" اور "تنھوں" بھی قدیم اردو میں رائج تھا۔ تنھن اور تنھوں کی مثال دکنی سے مخصوص ہے شمالی ہند میں نہیں ملتی۔

"جو" سنسکرت यः کا چربہ ہے۔ سنسکرت میں کہیں کہیں اور پراکرت میں عام طور سے ये بولا جاتا تھا۔ य کا ج سے تبادل ایک عام بات ہے۔ "جے" "جو" کی جمع تھی جو پہلے مستعمل تھی اب متروک ہے۔ "جو" کی غیر فاعلی حالت "جس" سنسکرت کی اضافی حالت "یسیہ" سے ماخوذ ہے۔ پراکرت میں اس کا روپ "جس" تھا۔ "جن" "جنھوں" کا مخفف ہے۔ "جنھوں" اصل میں "جنھونم" تھا یہ صیغہ "تھونم" پر قیاس کر کے بنایا گیا تھا۔

اسم موصول کے جواب میں جو ضمیر آتی ہے وہ "سو" اور "تو" ہے۔ یہ سنسکرت त یا सः سے ماخوذ ہے۔ "تو" کی غیر فاعلی حالت "تس" ہے۔ شوکت صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے تمام تغیرات اور ان کی تاریخ بالکل "جو" کی طرح ہے۔ تو، تس، تن - تنھیں - تنھوں۔

اسم اشارہ قریب کے لیے قدیم اردو میں "یہ" کے علاوہ اے، یے، ایہہ اور یو بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ مثالیں ہیں کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں بھی یہ استعمال مل جاتا ہے۔ ان کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ اسم اشارہ قریب "یہ" مرکب حرف اشارہ ए سے ماخوذ ہے۔ اس کی "ہ" "ش" کا بدل ہے۔ سنسکرت میں یہ صیغہ एष تھا۔ اردو کا عام رجحان ہے کہ کلمات کے شروع میں جو ए اور ऐ آتے ہیں ان کا अ گر جاتا ہے اور इ کی جگہ "ی" اور उ کی جگہ "و" رہ جاتا ہے۔ مشرقی زبانوں میں بقول گریرسن अ کبھی نہیں گرتا۔ بہاری اور مشرقی ہندی میں "وہ" کو "اوہ" اور "یہ" کو "ایہہ" کہتے ہیں۔ اس رجحان میں راجستھانی اور برج اردو کے ساتھ ہیں۔ غالباً اردو کے اثر سے اردو

میں 'یو' اور 'وہی' ملتے ہیں۔ 'یہ' کے علاوہ اس کی مترادف لغات غیر زبانوں کے اثر سے اردو میں راہ پاگئی تھیں لہٰذا بعد میں متروک ہوگئیں صرف 'یہ' باقی رہا۔

اسم اشارہ بعید کے لیے 'وہ' کے علاوہ دکنی اور شمالی ہند کی قدیم اردو میں 'او' کا استعمال بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر چیٹرجی نے 'وہ' کو سنسکرت کے فرضی روپ अव (اَو) سے نکالا ہے اور اس کا جوڑ ایرانی 'او' سے لگایا ہے۔ ہری اودھ اسے سنسکرت असौ پراکرت अमु اور اپ بھرنش ओहु سے نکالتے ہیں۔ سکسینہ کا کہنا ہے کہ اسم اشارہ قریب "یہ" یا "یے" کی مثال پر "وہ" یا "وو" بعید کے لیے وضع کر لیا گیا۔ کیلاگ 'وہ' کا ماخذ "اوسَو" کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قدیم سنسکرت میں उ (اُ) ایک حرف تھا جو اشارۂ بعید کا کام دیتا تھا۔ لیکن شوکت سبزواری اسے "اوش" سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اس کے درمیانی حلقے یہ لکھے ہیں: اوش - اوس - اوہ - وہ یا اُہ۔ اُہ مشرقی زبانوں میں ہے۔

ضمیر شخصی واحد غائب کے لیے 'وہ' قدیم اردو میں بھی موجود تھا جمع کے لیے البتہ 'وے' استعمال ہوا ہے۔ اس کی مثالیں دکنی کے علاوہ شمالی ہند میں غالب تک کے یہاں موجود ہیں۔ 'وہ' بعض جگہ دو واؤ کے ساتھ "وو" لکھا ہوا ملتا ہے۔ شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ قدیم ہند آریائی یا ہند ایرانی میں اسم اشارہ بعید اور ضمیر غائب کے لیے الگ الگ صیغے تھے۔ اشارے کے لیے یہ، ئے، وے اور ضمیر کے لیے ش، س اور ت۔ یہ صیغے کچھ عرصے تک ایک دوسرے سے ممتاز رہے۔ اس کے بعد خلط ملط ہو کر ایک ہوگئے۔ چیٹرجی 'وہ' کو سنسکرت کے فرضی روپ अव سے نکالتے ہیں۔ ہری اودھ نے اسے سنسکرت असौ پراکرت अमु اور اپ بھرنش ओहु سے نکالا ہے۔ سکسینہ کے نزدیک اسم اشارہ قریب یہ یا یے کی مثال پر وہ یا وو (او) بعید کے لیے وضع کر لیا گیا جو اردو میں 'وہ' ہوگیا۔ یہی ضمیر شخصی واحد غائب کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا۔ اس سلسلے میں کیلاگ نے سنسکرت میں उत (اُو) کی نشاندہی کی ہے۔ نیز 'اُ' وہ کی جگہ اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی تک میں ملا ہے۔ یہ اُ، ضمہ یا واؤ کا قائم مقام ہے۔ اردو میں ضمیر غائب کی اصل یہی 'و' ہے اس لیے اس پر علامت جمع 'ے' اضافہ کر کے جمع غائب کے لیے 'وے' وضع کر لیا گیا۔ 'ے' لگا کر جمع بنانے کا قاعدہ ہند یورپی زبانوں میں قدیم سے تھا۔ اردو میں اب 'وے' متروک ہے۔ واحد و جمع غائب دونوں صیغوں میں 'وہ' ہی استعمال ہوتا ہے۔

ضمیر واحد حاضر کے لیے 'تو' کے ساتھ 'توں'، 'تے' اور 'تیں' قدیم اردو میں عام تھا جمع حاضر میں 'تم' کے ساتھ 'تمے'، 'تمیں'، 'تمن' اور 'تمنا' بھی دیکھنے میں آئے۔ 'تو' کی اصل سنسکرت 'توم' त्वम् ہے آخر سے غنہ گر گیا ہے۔ مارواڑی اور

قدیم اودھی میں اس کا روپ 'توں' تھا۔ نون غنہ 'م' کی یادگار ہے۔ پراکرت میں اس کی کئی شکلیں ہیں۔ شورسینی میں تم، مہاراشٹری میں تں، اردھ ماگدھی میں تے، تکی میں تہں، اپ بھرنش میں تہوں۔ یہ سب فاعلی حالتیں ہیں اور سنسکرت "توم" سے حاصل کی گئی ہیں۔ تقریباً یہ تمام صورتیں قدیم اردو میں استعمال ہوئی ہیں۔ بعد میں متروک ہو گئیں۔

'ہم' غالباً "تمھ" تھا۔ اس لیے کہ اس کی اصل "تُشم" (तुष्म) ہے جو "تُ" ضمیر واحد حاضر اور स्म "سم" الحاقی سے مرکب ہے۔ 'سم' متکلم میں بھی تھا وہاں "مہ" ہو گیا تھا یہاں "تمھ" ہوا۔ پراکرت میں اس کا روپ "تمھے" ہے۔ 'تم'، 'تمھے' سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ ہند ایرانی کے کسی ایسے روپ سے لیا گیا ہے جو قدیم فارسی "تُوم" سے ملتا جلتا تھا۔ پلیٹس "تم" کو "تمھوں" سے مختصر مانتے ہیں اور اس کی اصل پراکرت "تمھانم" بتاتے ہیں۔

اردو میں ضمیر واحد متکلم 'میں' اور جمع متکلم 'ہم' ہے۔ قدیم اردو میں اس کے ساتھ ساتھ 'میں' کے لیے 'ہوں' اور 'ہم' کی مترادف لغات کے طور پر 'ہمن'، 'ہمناں' اور 'ہموں' بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مقالے میں اس کی مثالیں پیش کر دی گئی ہیں۔ بعد میں یہ لغات ترک کر دی گئیں اور صرف اردو کی اصل لغات 'میں' اور 'ہم' برقرار رہیں۔

اس کے ماخذ کے سلسلے میں شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ 'میں' سنسکرت मया (مجھ سے یا مجھ نے) سے بنا ہے۔ پراکرت میں اس کے دو روپ تھے मए (مئے) اور मइ (مئی)۔ یہ اپ بھرنش میں मइँ (میئں) تھا۔ غنہ کی وجہ چیٹرجی نے یہ بتائی ہے کہ मया کو فاعلی حالت سمجھ کر اس میں سنسکرت علامت آلہ "ین" اضافہ کر دی گئی۔ گویا اپ بھرنش मइँ سنسکرت کے ایک فرضی روپ मयेन (مین) سے تراشا گیا ہے۔

ھورنلے 'میں' کو माहिं (ممیں) کا مخفف سمجھتے ہیں۔ جو म اور हिं سے مرکب ہے۔ म (ضمیر متکلم) پر اپ بھرنش لاحقہ اضافت (جمع کے لیے) हिं جوڑ دیا گیا۔ شوکت صاحب کا خیال ہے کہ 'میں' کو سنسکرت वयम اور پالی मयं (میں) سے نکالا جائے تو بہتر ہے۔

'ہم' کا ماخذ ان کے نزدیک 'اہم' ہے۔ اس کے شروع سے 'أ' گر گیا ہے۔ مصری اودھ نے اس سلسلے میں کسی عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ 'اہم' سے 'ہم' اسی طرح وجود میں آیا جیسے 'اھے' سے 'ہے'۔ دونوں جگہ شروع سے الف گر
شیام سندر کا بیان ہے کہ مارکنڈے نے اپنی کتاب "پراکرت سروسو" میں 'اسمد' (میں) کی جگہ 'ہم' ایک لغت دیا ہے اور اسے مفرد بتایا ہے۔ شوکت صاحب کے خیال میں یہی 'ہم' ہماری زبان کا 'ہم' ہے۔ شیام سندر کا کہنا ہے کہ مفرد کا جمع کے لیے استعما

ایک طرح کی ناہمواری ہے۔ مگر اب بول چال میں یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

بھنڈارکر، چٹرجی، دھیریندر ورما اور جان بیمز وغیرہ نے "ہم" کو پراکرت अस्मो दे یا अस्मे سے مشتق مانا ہے۔ پہلا فاعلی حالت میں ہے، دوسرا اضافی حالت میں۔ پہلے کا ماخذ ایک قدیم ہند ایرانی لغت "اسمے"[*] ہے جو ویدک زمانے کی یادگار ہے۔ دوسرا سنسکرت "اسمابھی" سے ڈھالا گیا ہے۔ اسمابھی۔ امہے بھی۔ امہے ہی۔ امہے ہی یہ اس کے مختلف روپ ہیں۔ شروع سے 'أ' گرا اور 'مہ' میں قلب ہوا تو "ھمے" اور اس سے "ہم" وجود میں آیا۔

'وہ' غیر فاعلی صورت میں، واحد کے لیے "اس" اور جمع کے لیے 'ان' ہو جاتا ہے۔ قدیم اردو میں اس کے ساتھ انہوں، اون، اُنہہ، اونو اور اُنن دیکھنے میں آتے ہیں۔ اُنو اور اُنّو بتشدید بھی مستعمل تھے۔

"اُن" کے ماخذ کے سلسلے میں شوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ "اُن" میں 'ن'، جمع کا ہے جو لاحقۂ اضافت "نام" नाम سے لیا گیا ہے۔ پراکرت میں اس کا روپ णां تھا۔ اس کے ارتقائی حلقے یہ ہیں:—

अवणां - अउणां - उणां - اون - اُن -

ضمیر واحد متکلم 'میں'، ہے اس کی مفعولی صورت 'مجھے' اور 'مجھ کو' ہے۔ 'مجھے' کے ساتھ ساتھ صرف 'مجھ' بھی استعمال ہوا۔ لیکن اس پر اکثر علامتِ مفعول 'کو' اضافہ نہیں کرتے تھے۔ اس کا اصل مجھ، مجھ، مںجھ، منجھ ہوتا تھا۔ سورطے نے 'مجھ' کو اضافی بتایا ہے اور اسے سنسکرت मदीयम (مدییم) سے ماخوذ مانا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ قدیم اردو میں اضافی 'میرا' کی جگہ 'مجھ' بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ مشہور ماہرِ لسانیات لاسن نے 'مجھ' کو سنسکرت کی فرضی اضافی ضمیر "مہیہ" سے مشتق بتایا ہے۔ جب کہ شوکت صاحب کے نزدیک اردو "مجھ" سنسکرت میں "مہیم" تھا۔ جو پراکرت میں "مجھ" ہوا، اور "تجھ" کی تقلید میں ے اس پر بعد میں بڑھا دیا گیا۔

"مہیم" کے مقابلے میں 'مجھ' کو "مدمیم" سے اخذ کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے کیونکہ "دھ" کے "جھ" سے بدل جانے کی مثالیں دیکھی گئی ہیں۔ اسی طرح 'م' کے غنہ سے بدل جانے کی بھی علمائے لسانیات نے تائید کی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ "مدمیم" سے "مجھیں" اور پھر غنہ گر جانے اور تشدید میں تخفیف کے باعث "مجھے" بنا ہو۔ 'مجھے' اور 'مجھ' اب بھی مستعمل ہیں۔ فرق یہ ہے کہ "مجھ" پر علامتِ مفعول 'کو' اضافہ کی جاتی ہے جب کہ "مجھے" بغیر کسی علامت کے مفعول معنے دیتا ہے۔

ضمیر جمع متکلم 'ہم' کی مفعولی صورت "ہمیں" ہے۔ قدیم اردو میں اس کے پہلو بہ پہلو "ہمن" اور "ہمناں" بھی استعمال ہوئے ہیں۔ شمالی ہند میں یہ استعمال اسمٰعیل امروہوی اور فائز کے یہاں تک ملتا ہے پھر متروک ہو جاتا ہے اور صرف "ہمیں" برقرار رہتا ہے۔

"ہمیں" پراکرت اہمے ہی अम्हे हि سے مشتق ہے۔ جو سنسکرت 'اسمابھی' अस्माभि سے ڈھلا ہے۔ جس کے درمیانی حلقے یہ ہیں:۔ اسمابھی - اہمے بھی - اہمے ہی - اہمے ہی۔ شروع سے 'ا' گرا اور 'ہ' "ہمے" میں قلب ہوا تو "ہمے" وجود میں آیا۔ شوکت صاحب نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اردو مفعولی ضمیر "ہمیں" کی اصل سنسکرت "اسمے" یا پراکرت "اہمے" ہے۔ "ہمیں" کا غنہ म (م) علامتِ مفعول کا بقیہ ہے۔ پراکرت میں فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں 'اہمے' استعمال ہوتا تھا اور اپ بھرنش میں अम्हइं (امہیں)۔ ماگدھی میں اس کا روپ 'اشمے' تھا۔

اضافی حالت میں واحد کے لیے 'میرا' اور جمع کے لیے 'ہمارا' ہی استعمال ہوئے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں 'میری' کی جمع 'میریاں' اور 'ہماری' کی 'ہماریاں' بھی دیکھنے میں آئی۔ ایک آدھ جگہ "ہماں" برائے 'ہماری' بھی استعمال ہوا ہے۔ بعد میں یہ بے قاعدگی ختم ہوگئی صرف 'میرا' اور 'ہمارا' آج تک مستعمل ہیں۔

سکسینہ نے 'میرا' کا ماخذ "موکیر" بتایا ہے۔ شوکت سبزواری کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو غیر فاعلی حالت 'مے' کا استعمال صرف اضافی حالت میں ہوا ہے۔ جیسے میرا، میری - میرے۔ بقیہ حالات میں "مجھ" آتا ہے۔ 'مے' براہِ راست سنسکرت मे سے ماخوذ ہے جو اضافی حالت میں ہے۔ اردو میں اس کی یہ حالت فراموش کر کے نئے سرے سے اس پر علامتِ اضافت 'را' بڑھا دی گئی۔ اسی طرح "اَمْھَ" پر علامتِ اضافت 'را' بڑھا کر 'امھارا' اور پھر "ہمارا" بنا۔ قدیم اردو میں 'ہماں' کا استعمال بھی ملتا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ کا مصرع ہے:۔

بتاوے ہماں کے نہ لنگ بلاؤ۔ اور امیر خسرو کا ایک مصرع حامد حسن قادری نے "داستانِ تاریخِ اردو" میں اس طرح نقل کیا ہے:۔ آئی آئی ہماں پیاری آئی۔

ضمیر واحد غائب 'وہ' کی مغیرہ صورت 'اس' اور 'اُسے' ہے۔ قدیم اردو میں یہ استعمال اسی طرح رہا سوائے املائی فرق کے یعنی ایک واؤ زاید کے ساتھ 'اوس' اور 'اوسے' لکھتے تھے۔ اُس کے مقام پر کہیں کہیں "وس" بھی دیکھنے میں آیا۔

"اُس" کو 'او' کی اضافی حالت بتایا جاتا ہے۔ یہ اصل میں "اَوشیہ" تھا۔ پراکرت میں 'اَوش' ہوا اور پھر "اُس"۔ شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ "اُس" 'وہ' کے درمیانی حلقوں میں سے ایک حلقہ ہے جس میں 'س'، ضمیر "سہ" کی یادگار ہے۔ نیز "اُس" پر 'ے' بڑھاکر "اُسے" بنالیا گیا۔ 'وہ' کے درمیانی حلقے یہ ہیں:۔ اوش۔ اوس۔ اوہ۔ وہ یا اُہ۔ قدیم اردو میں "اُس" کی جگہ اُہ اور 'اُ' بھی استعمال ہوا ہے اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی کا مصرعہ ہے: اُ تھا ملک خیبر بڑے بھار کا۔ (اُ تھا یعنی وہ تھا)۔

'وہ' کے درمیانی حلقوں میں سے دوسرے نمبر پر 'اوس' موجود ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ 'وہ' کا ماخذ (ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے ایک دور میں دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے "اوس" مغیرہ حالت کے لیے اور 'وہ' ضمیر شخصی واحد غائب کے لیے استعمال ہونے لگا۔ او، اُہ اور 'وہ' اسم اشارہ بعید کے لیے بھی استعمال ہوا۔ لہٰذا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ 'وہ' کا ماخذ "اوش" ہو اور 'اوس' کا ماخذ 'اَش' کیونکہ "اَ" (اَوْ) سنسکرت میں ایک حرف उ تھا جو اشارہ بعید کا کام دیتا تھا۔ یہ کیلاگ کی رائے ہے اور صحت سے زیادہ قریب اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ "اوس" بھی کسی کی جانب اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ماضی مطلق بنانے کے لیے اردو کا موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ عام طور پر مادۂ فعل پر الف کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً کھیل سے کھیلا۔ اس قاعدے کے ساتھ اردو میں یہ تغیر دیکھنے میں آیا کہ مادۂ فعل پر الف کی جگہ 'یا' کا اضافہ کیا گیا ہے جیسے کھیل سے کھیلیا۔ لکھ سے لکھیا۔ پڑھ سے پڑھیا، نکل سے نکلیا وغیرہ۔ دوسرا رجحان یہ نظر آتا ہے کہ جب مادۂ فعل الف یا واؤ پر ختم ہو رہا ہو تو 'یا' کے بجائے 'ئیا' کا اضافہ کرتے تھے جیسے آ سے آئیا۔ کھو سے کھوئیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور رجحان یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ 'کرنا' سے 'کیا' کے ساتھ ساتھ 'کیتا' اور 'کینا' بنایا گیا ہے۔ 'کیتا' تانیث کی صورت میں بدل کر 'کیتی'، اور جمع کی صورت میں 'کیتے' ہو جاتا تھا۔ شمالی ہند میں اسمٰعیل امروہوی کے بعد یہ تغیرات متروک ہو جاتے ہیں اور صرف ماضی مطلق بنانے کا موجودہ قاعدہ مروج رہتا ہے۔

ماضی مطلق بنانے کے سلسلے میں مادۂ فعل پر 'ا' کی جگہ 'یا' کا اضافہ دکنی کا خاصہ ہے۔ لاحقہ "ا" سے قبل وہاں ایک خفیف التلفظ 'ی' ہوتی تھی۔ جیسے لکھیا، پڑھیا۔ یہ 'ی' موجودہ زبانوں کے ایک رجحان کے زیر اثر اضافہ کی گئی تھی۔ سنسکرت وغیرہ جو کلمے کے وسط یا آخر میں آتے ہیں پراکرت میں اکثر حذف ہو جاتے تھے لیکن ان کی

حرکات باقی رہ جاتی تھیں۔ پراکرت میں یہ حرکتیں اپنی حالت پر رہیں۔ بول چال کی زبانوں میں دو حرکتوں کا اجتماع ثقیل سمجھا گیا اس لیے یا تو ان حرکات کو سابق حرکت میں مدغم کر دیا گیا یا ان کے درمیان 'ی' یا 'و' اور داخل کر دیے گئے۔ مثلاً "تیلا" سنسکرت میں "تیلکہ" تھا۔ 'ک' گر جانے سے "تیل ے ا" باقی رہا۔ اردو میں 'ل' کے ے اور آخری ے کے اجتماع کو ثقیل سمجھ کر مدغم کر دیا گیا اس طرح "تیلا" بنا۔

ڈاکٹر وہبر کا بیان ہے کہ جین پراکرت میں وقفیہ گرتے نہ تھے بلکہ ایک خفیف التلفظ 'ی' سے بدل جاتے تھے۔ بھنڈارکر نے اس کی تائید ہیم چندر کے بیان کردہ ایک اصول سے کی ہے کہ حروفِ صحیح گرنے کے بعد جو ऋ باقی رہ جاتا ہے وہ ایک خفیف 'ی' کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ دکنی اردو میں اسم مفعول (یا ماضی) سے بعد میں تخفیف کر دی گئی۔ "کیتا" کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ یہ "کرتہ" سے ڈھالا گیا ہے۔

ماضی معطوفہ، مادے کے آخر میں 'کر' یا 'کے' اضافہ کرنے سے بنتا ہے۔ صاحب جلوۂ خضر، صفیر بلگرامی کا کہنا ہے کہ اردو میں ماضی معطوفہ اور امر میں فرق نہ تھا اور یہ کہ ناسخ نے امر پر 'کر' بڑھا کر ماضی معطوفہ بنائی۔ لیکن قدیم اردو کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناسخ سے قبل بھی ماضی معطوفہ کا وجود تھا جو موجودہ قاعدے کے مطابق مادے پر 'کر' یا 'کے' اضافہ کر کے بنائی جاتی تھی۔ قدیم اردو سے اس کی مثالیں پیش کر دی گئی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں اس کا ذکر ہوتا تھا اور کبھی 'کر' محذوف ہوتا تھا۔ ناسخ نے یہ کیا کہ 'کر' اور 'کے' لگانے کی تاکید کی۔

ماضی معطوفہ کے ماخذ کے بارے میں شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ یہ اول اول سنسکرت کے نیچ پر فعل کے آخر میں 'ی' لگا کر بنائی گئی۔ چنانچہ برج اور قدیم ہندی میں ماضی معطوفہ کی جو مثالیں ملتی ہیں ان کے آخر میں ئے یا زیر (ـِ) ہے۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ سنسکرت य کا بقیہ ہے۔ جیسے گول را آجتی (گر کر راجا کو جیت کر) سنی لاگر (کاغذ یعنی خط سن کر)۔ یہ کسرہ، کثرتِ استعمال سے اردو میں مٹ مٹا گیا اور خالص مادہ، مدتوں بطورِ ماضی معطوفہ استعمال ہوتا رہا۔ جب مادے اور ماضی معطوفہ میں کوئی فرق نہ رہا اور ایک کا دوسرے سے اشتباہ ہونے لگا تو تمیز و تفریق کے خیال سے غالباً بہت بعد میں 'کر' جو خود ماضی معطوفہ ہے مادہ پر اضافہ کر دیا گیا۔ پڑھ کر۔ اٹھ کر۔ وغیرہ۔ بعد میں یہ آخری زیر بھی گر گیا اور 'کر' کی ترکیب سے ماضی معطوفہ بنائی گئی۔ کچھ

عرصے بعد توضیح و تعیین کے لیے پھر ایک لاحقے کی ضرورت پڑی۔ اس مرتبہ 'کے' اس پر اضافہ ہوا۔ چل کر پی کر کے وغیرہ۔ 'کر' اور 'کے' اردو میں ساتھ ساتھ آئے۔ چنانچہ الگ الگ ان میں سے ہر ایک آج فعل کے ساتھ مستعمل ہے۔

'کے' کو پلیٹس نے پراکرت इक्क سے ماخوذ بتایا ہے۔ ان کے نزدیک इक्क اول 'ج' یا 'چ' بنا بعد میں 'ک' سے بدل گیا۔ بیمز اسے 'کر' کا ایک روپ بتاتے ہیں۔ جس کے درمیانی حلقے یہ ہیں:۔ کر۔ کَ۔ کے ← بھنڈارکر کا کہنا ہے کہ 'کے' سورسینی میں किअ تھا۔ اس سے کیئے، کِئے اور پھر 'کے' بنا۔ شوکت سبزواری نے اس کی تائید کی ہے۔ ولنر کا خیال ہے کہ 'کے' "کرتے" سے وضع کیا گیا تھا۔ "کرتے" پراکرت میں اول कअए ہوا اور بعد میں 'کے'۔

فعلِ امر کا قاعدہ یہ ہے کہ مصدر سے علامتِ مصدر گرا کر امر واحد حاضر حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً کرنا سے کر۔ جمع حاضر کریئے اور کیجیے۔ یہ استعمال احتراماً ہوتا ہے ویسے 'کر' سے جمع حاضر 'کرو' بنتا ہے۔ کیجیو، بھیجیو وغیرہ بھی قدیم اردو میں استعمال ہوتے رہے، شوکت صاحب کے خیال میں یہ دعائیہ صورتیں ہیں۔ بعد میں یہ استعمال متروک ہو گیا۔

شوکت سبزواری کی رائے میں امر کے دونوں صیغے (واحد و جمع) سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ واحد حاضر 'کر' سنسکرت صیغۂ امر حاضر کے مطابق ہے البتہ 'کرو' سنسکرت کے صیغۂ جمع حاضر سے ذرا مختلف ہے۔ بھنڈارکر کے نزدیک یہ صیغہ اپ بھرنش कर हु (کرہُ یا کرھو) سے لیا گیا ہے۔ کرہُ۔ کرُ۔ کرو۔ بھنڈارکر کا دعویٰ ہے کہ اپ بھرنش اور قدیم ہندی دونوں میں اس کا روپ "کرھو" ہے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے تلسی داس کا مصرعہ: "پاروتی بھم جائی تم پریم پریکشا لیہو" نقل کیا ہے۔ چند کے یہاں بھی اس کا روپ یہی ہے جیسے تم لیہو، تم لیہو (تم پکڑو۔ تم پکڑو)۔

قدیم ہندی میں امر حاضر کے آخر میں इ بھی تھی۔ جیسے کرِ۔ ڈھرِ۔ تلسی داس کا مصرعہ ہے:۔ ڈھرِ بیٹھ روپ اودھ پُر جاءِ (یعنی لڑکے کا روپ بنا کر اودھ شہر میں جاؤ)۔ جاءِ کی اصل سنسکرت "یاسِ" بتائی ہے۔ اس کے درمیانی حلقے یہ ہیں:۔ یاسِ۔ یاہِ۔ جاہِ۔ جاءِ۔

کریئے اور کیجیے، سنسکرت "کریات" سے لیے گئے ہیں۔ سنسکرت میں 'یا' لاحقہ دعا ہے۔ یہ پالی میں 'य्य' تھا اور پراکرت میں 'ज्ज' ہوا۔ کیجیے میں 'ج'، 'ی' کا بدل ہے۔ "کریئے" میں 'ی' اپنی حالت پر قایم ہے اور کیجیے میں 'ج' سے بدل گئی ہے۔ کیجیے اصل میں "کیجے" تھا۔ ڈاکٹر چٹرجی کے نزدیک 'کریئے' اور 'کیجیے' سنسکرت فعلِ دعائی پر خبری 'ए' 'ए' - ای - ی - لگا کر بنائے گئے ہیں۔ چٹرجی 'کریو' اور 'دیجیو' کو بھی سنسکرت "کریات" اور "دیات" ہی سے مشتق بتاتے ہیں۔ کریئے اور دیجیے پر خبری علامت 'ی' اضافہ کی گئی تھی اور 'کریو' اور 'دیجیو' پر اخری علامت 'ئو' بڑھائی گئی۔

"مضارع" وہ فعل ہے جو حال اور مستقبل دونوں پر محیط ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں حالِ مطلق وہ فعل ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کام زمانۂ موجودہ میں ہوا لیکن اس میں وقت کا صحیح تعین نہیں ہوتا کہ کام ختم ہوئے کتنی دیر ہوئی جیسے آتا ہے۔ جاتا ہے یہ حالیہ ناتمام کے آگے ہے، ہیں، ہوں وغیرہ لگا کر بنایا جاتا ہے۔ جب کہ مضارع کا قاعدہ یہ ہے کہ مادۂ فعل کے آگے واؤ اور یائے مجہول بڑھا کر بناتے ہیں جیسے آوے۔ جاوے۔ کھاوے۔ مضارع کو مستقبل سے مخصوص کرنا ہو تو اس پر علامتِ مستقبل 'گا' بڑھا دیتے ہیں۔ آوے، جاوے کا استعمال قدیم اردو میں ہوتا تھا اب متروک ہے۔ قدیم اردو میں آوے جاوے کا درمیانی واؤ حذف کر کے صرف آئے، جائے بھی استعمال ہوا ہے۔ علامتِ مستقبل کے طور پر لاحقہ 'سی' اضافہ کرنے کی مثالیں بھی قدیم اردو میں دستیاب ہیں لیکن یہ استعمال صرف دکنی میں ملتا ہے بعد میں یہ استعمال متروک ہو گیا۔

مضارع کے ماخذ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قدیم ہند ایرانی گردانوں کا بقیہ ہے۔ یہ سنسکرت فعلِ حال سے ماخوذ ہے اور پراکرت و اپ بھرنش عہد سے گزرتا ہوا اردو میں آیا ہے۔ بیمز کا خیال ہے کہ مثلاً اپ بھرنش "چلوں" سنسکرت صیغۂ جمع متکلم "چلامہ" سے متاثر ہوا ہے۔ چلامہ - چلامو - چلاؤں - چلؤں - چلوں۔ اور اردو چلے سنسکرت چلاتی سے چلادی - چلائیں - چلئیں - چلیں بنا۔

اردو مستقبل کے صیغے وہی ہیں جو مضارع کے ہیں۔ ان پر گا، گے اور گی بڑھا دیے گئے ہیں۔ لسانیین کا خیال ہے کہ اردو مستقبل کے صیغے سنسکرت فعلِ حال سے بحثِ صوتی کے زیرِ اثر بنے تھے۔ "چلشیتی" پراکرت میں "چلیس سئی" ہوا اس سے اپ بھرنش چلسئی یا چلیئی اور پھر "چلے" بنا۔ بعد میں مضارع سے تمیز کرنے کے لیے "گا" علامتِ استقبال

اس پر اور اضافہ کر دی گئی۔

علامتِ استقبال کے سلسلے میں "سی" کا ذکر کرتے ہوئے شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ مضارع پر "گا" لگا کر مستقبل بنانے کے علاوہ قدیم اردو میں پراکرت کا تالیفی فعلِ مستقبل بھی تھا۔ لیکن لاحقہ استقبال "س" کو "گا" کی طرح کلمے سے الگ کر کے کسی قدر تحلیلی بنا لیا گیا تھا۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش زبانوں میں فاعلی لاحقے "سی"، "سس" یا "س" کے بعد جوڑے جاتے تھے اور مادہ بدستور ایک حالت پر قایم رہتا تھا۔ مگر اردو میں اصل مادے کو گردانا جاتا تھا اور اس پر "س" اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ عام اور مطرد نہ تھا۔ اپ بھرنش کی طرح "س" کے بعد بھی فاعلی لاحقہ دیکھا گیا ہے گویا مادے کے علاوہ لاحقے میں بھی صیغوں کے مطابق تبدیلیاں آتی تھیں۔ شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ یہ استعمال گجراتی اور دکنی میں تھا۔ شمالی ہند میں اس کی جگہ "گا" مستعمل تھا۔ بینا کہتا ہے کہ یہ روپ دکنی میں گجراتی سے آیا ہوگا۔ قدیم اردو کے مطالعے سے شوکت صاحب کی رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن اس پر یہ اضافہ اور کر لیا جائے کہ قدیم اردو کے دکنی دور میں "گا" کا استعمال بھی موجود رہا ہے۔ "سی" کا استعمال کم ہی ہوا ہے۔ غالباً گجراتی سے کچھ عرصے کے لیے دکنی میں آگیا بعد میں متروک ہو گیا۔

فعلِ معاون کے طور پر ہے، ہیں، تھا، تھی وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ دکنی میں ان کے ساتھ ساتھ اچھے، اچھیں، اچھے، اچھیں، اچھا، اچھی، اچھے، اچھیا اور رہیا وغیرہ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ "گا" اور "گی" میں کوئی تغیر سوائے اس کے نظر نہیں آتا کہ بعض جگہ "گی" کی جمع "گیاں" بھی استعمال ہوئی ہے۔ لیکن یہ دکنی سے مخصوص ہے شمالی ہند میں اس کا استعمال نہیں ملتا۔ بعد میں یہ مترادف لغات متروک ہو جاتی ہیں صرف ہے، ہیں، تھا، تھی، تھے، گا اور گی برقرار رہتے ہیں۔

"ہے"، سنسکرت "اَسْتی" (ہونا) سے فعلِ حال کا صیغہ واحد غائب ہے۔ یہ اصل میں "اَستِیْ" تھا۔ اَستی۔ اَسِتی۔ اَہے۔ اَہے اور پھر "ہے" بنا۔ ڈاکٹر چٹرجی کا کہنا ہے کہ "اَس" سے فعلِ حال "اَستی" ہے جس سے پراکرت "اَتھی" بنا۔ یہ ادبی پراکرت میں مستعمل تھا۔ "اَستی" سنسکرت میں اور "اَتھی" پراکرت میں کوئی صیغہ نہیں۔ لہٰذا اردو "ہے" اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ کچھ علما نے "ہے" کو سنسکرت "بھو" (فارسی بو) سے نکالا ہے۔ ان کے نزدیک "ہے" اصل میں "بھوتی" تھا۔ اس کے مختلف مدارج یہ ہیں:۔ بھوئی۔ ہوئی۔ ہے۔ لیکن شوکت صاحب اس سے متفق نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہے" اور "ہوئی" اردو میں جدا جدا صیغے ہیں۔ "ہے" کھڑی کا ہے اور "ہوئی" برج اور اودھی کا۔ صوتی اعتبار سے بھی یہ مختلف صیغے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے ایک، دوسرے سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ "ہے"

دراصل 'بھو' اور 'اس' کے علاوہ ایک اور مادے 'دھے' سے وضع ہوا ہے۔ اس کے دو روپ ہیں 'دھو' اور 'دھے'۔ یہ دونوں روپ پالی میں تھے اور 'بھو'، 'آس'، کے ساتھ ان کی پوری گردان کی جاتی تھی۔ 'دھو'، 'بھو' سے ماخوذ نہیں بلکہ ایک آزاد مادہ ہے اور 'بھو' جتنا قدیم ہے۔ کسی زمانے میں یہ سنسکرت میں بھی تھا۔ 'بھو' سے غالباً بھئے اور بھئیں نکلا ہے یہ قدیم اردو کے دکنی دور میں کہیں کہیں استعمال ہوا ہے۔

"تھا" کا ماخذ دھیریندر ورما اور شیام سندر کے نزدیک سنسکرت "ستھا" ہے۔ بعض دوسرے علمائے لسانیات کے خیال میں یہ سنسکرت مادہ "اس" کے صیغۂ جمع حاضر "ستھ" (تم ہو) کی پیداوار ہے۔ اس اشتقاق پر شیام سندر کو یہ اعتراض ہے کہ اردو "تھا" ماضی کا صیغہ ہے اور سنسکرت وہ "ستھ" سے، جو فعلِ حال جمع کا صیغہ ہے، کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اسے "ستھا" کے صیغۂ واحد غائب (ماضی معروف) "استھات" (وہ ٹھہرا) سے مشتق ماننا چاہئے۔ شوکت سبزواری کے خیال میں "تھا" دراصل "ہوتھا" سے ماخوذ ہے۔ "ہو" بحثِ صوتی کی نذر ہوا، "تھا" بچ رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ "اتھا" کا الف، 'ہ' کا قائم مقام ہے۔ دہلی کے قریب بعض دیہات میں "تھا" کی جگہ "ہا" آج بھی بولا جاتا ہے جیسے گیا ہا (گیا تھا)۔ یہ 'ہا'، 'تھا' کا ایک روپ ہے اور اسی سے بگڑ کر بنا ہے۔ 'سی' کے بارے میں شوکت سبزواری کی رائے یہ ہے کہ یہ غالباً 'اسیت' سے ڈھالا گیا ہے۔

بیمز نے 'تھا' کو [illegible] سے مختصر مانا ہے جو سنسکرت اسم مفعول ستھتھہ کا ایک روپ ہے جس کے تغیرات یہ ہیں:۔ ستھتھہ - تھاہ - تھا - تھیا - "تاریخِ فیروز شاہی" میں سندھیوں کا ایک جملہ نقل ہے اس میں "تھیا" استعمال ہوا ہے۔ جملہ یہ ہے:۔ برکتِ شیخ تھیا ایک موا ایک تھا (رہا تھا)۔

"گا" کے باب میں لسانیین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جدید لاحقہ ہے اور اردو میں مستقبل کے صیغے ادا کرنے کے لیے حسبِ قاعدہ 'گم' (جانا) سے وضع کیا گیا تھا۔ سنسکرت فعلِ مستقبل "داسیتی" (وہ دے گا) کی تحلیل لغوی اس طور پر کی گئی ہے۔ دا (دینا) سی (علامتِ استقبال) تی (وہ - ضمیر واحد غائب)۔ 'گا' اصل میں گتہ (گیا ہوا) تھا۔ یہ مصدر 'گم' (جانا) کا اسم مفعول ہے۔ گتہ - گاہ - گا - یہ اس کی کڑیاں ہیں۔ قدیم اردو میں 'گا' بغیر کسی تغیر کے اسی طرح استعمال ہوا ہے لہٰذا غیر ضروری طوالت کے خیال سے مثالیں حذف کر دی گئی ہیں۔

علامتِ فاعل 'نے' کے سلسلے میں جارج گریئرسن کا کہنا ہے کہ 'نے' کے استعمال کے قواعد سب سے پہلے

میں مرتب ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے ایک مقام پر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "نے" فاعلی علامت کے طور پر قدیم ہندی میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ دکنی "نے" کے استعمال میں بالکل بے قاعدہ ہے۔ وہاں یہ فاعلی اور مفعولی دونوں کے لیے آتا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا کہنا ہے کہ قدیم ہندی تو کیا اردو ادب میں بھی اس کا وجود نہیں۔

لسانیین کی مندرجہ بالا آرا کو مدِنظر رکھتے ہوئے قدیم اردو کا مطالعہ کیا گیا تو یہ واضح ہوا کہ نہ صرف شمالی ہند کی قدیم اردو میں بلکہ دکنی میں بھی "نے" کا وجود نہایت تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ دکنی و شمالی ہند کی قدیم اردو میں اس کا استعمال بطورِ علامتِ فاعلی ہی ہوا ہے، بطورِ علامتِ مفعول نہیں۔ اس سلسلے میں کوئی تغیر سوائے اس کے دیکھنے میں نہیں آتا کہ دکنی میں بعض اوقات ایسے موقعوں پر بھی "نے" استعمال کر لیا جاتا تھا جہاں اس کی موجودگی کے بغیر فاعلی مفہوم واضح ہوتا تھا۔ اسی طرح شمالی ہند کی اردو اور دکنی میں اس کا حذف بھی جائز تھا۔ بعد میں یہ بے قاعدگی رفع ہوگئی اور فاعل پر علامتِ فاعل کا التزام کیا جانے لگا۔

"نے" کے ماخذ کے سلسلے میں شوکت سبزواری نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "نے" کی اصلی علامت آلہ ने ہے ان کا کہنا ہے کہ اردو کا "نے" اور اس کا بطورِ مجہول استعمال براہِ راست سنسکرت سے لیا گیا ہے۔ سنسکرت کی اس آلی علامت کا استعمال اپ بھرنش کے آخری دور تک رہا۔ اس سلسلے میں بھنڈارکر کا کہنا ہے کہ "نے" دوہری علامت ہے۔ اول "ین" سے "ن" تراشا گیا اور بعد میں اپ بھرنش "ہِیں" جو خود "ین" سے نکالا گیا تھا اس پر اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح "نے" تیار ہوا۔ شیام سندر داس اور ہری اودھ "نے" کو "ین" کا مقلوب بتاتے ہیں۔ شوکت سبزواری نے شیام سندر داس اور ہری اودھ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔

مجہوری "سے" کے سلسلے میں ڈاکٹر زور نے "ہندوستانی لسانیات" میں لکھا ہے کہ "سے" کا استعمال صرف سوا سو برس ہی سے رائج ہے۔ اس سے قبل یہ لفظ "سیں" یا "سوں" کی شکل میں رائج تھا چنانچہ ولی اور اس کے معاصرین کے یہاں "سیں" اور "سوں" ہی نظر آئے گا۔ ولی سے پچاس سال پہلے یہ لفظ "ستے" اور "ستیں" کی شکل میں رائج تھا۔ چنانچہ قطب شاہی سلطنت کے عہدِ آخر کے شاعروں کا کلام اس کا شاہد ہے۔ غلام علی کی نظم پدماوت میں لفظ "ستے" ملتا ہے۔ اس سے پچاس سال قبل اس لفظ میں "س" کی آواز موجود نہیں تھی۔ اس زمانے کے گولکنڈہ کے بسنے والے "مجھ سے کہا" کی جگہ "مجھ تے کہا" کہتے چنانچہ محمد قلی اور اس کے درباری شعرا کے کلام میں لفظ "تے" ہی نظر سے گزرتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے پہلے یہ ا

'تے'، کی شکل میں رائج تھا۔ وجہی اور اس سے قبل کی تمام تحریروں میں بھی 'تے' ہی ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ لفظ 'سے'، کی صوتی شکل مختلف زمانوں اور مقامات پر بدلتی گئی اور جو لفظ دراصل پہلے 'تیں' یا 'تے' تھا وہ تھے، ستے، ستیں، سوں اور سیں ہوتا ہوا آخر کار 'سے' بن گیا۔

محی الدین زورؔ کی مندرجہ بالا رائے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قدیم اردو کا مطالعہ کیا گیا تو یہ واضح ہوا کہ یہ تجزیہ حقیقت سے بعید ہے۔ ولیؔ اور ان کے معاصر قاضی محمود بحریؔ کے یہاں سیں اور سوں کے علاوہ ستی، سیتی اور تے بھی استعمال ہوا ہے نیز 'سے'، کا استعمال بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ زورؔ کا کہنا ہے کہ غلام علی کے یہاں صرف 'ستے'، ملتا ہے حالانکہ ان کے یہاں 'سوں'، کا استعمال بھی ہوا ہے۔ قلی قطب شاہ اور ان کے معاصرین کے یہاں بھی صرف 'تھے'، ہی مستعمل نہ تھا بلکہ سوں، تے اور سیتی بھی استعمال ہوا ہے۔ جہاں تک 'تے'، کی موجودگی کا تعلق ہے اسے صرف وجہی سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ وجہی اور اس کے قریبی عہد میں 'تے'، کے علاوہ جو دوسری لغات مستعمل رہیں وہ یہ ہیں:۔ سوں۔ ستی۔ سیتی اور تھے۔ جب کہ خود ملا وجہی کی قطب مشتری اور سب رس میں وہ تمام لغات استعمال ہوئی ہیں جو دوسرے تمام لوگوں کے یہاں موجود ہیں 'تھے'، بھی ان کے یہاں استعمال ہوا ہے۔ وجہی سے قبل بزرگوں اور صوفیوں شاہ برہان الدین جانمؔ، شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجراتی، شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری، شیخ بہاء الدین باجنؔ وغیرہ کے یہاں تھی، سوں، تے سبھی استعمال ہوئے ہیں اور ان تمام لغات کے پہلو بہ پہلو "سے" بھی موجود و مستعمل رہا ہے۔ اسی طرح باقی تمام دکنی شعرا و اُدبا کے یہاں بھی دیگر لغات کے ساتھ "سے" کا وجود ملتا ہے۔ اس سلسلے میں مقالے میں تائیدی لسانی شہادتیں پیش کر دی گئی ہیں۔ اس مطالعے سے یہ مفروضہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے کہ 'سے'، کی شکل بقول زورؔ صرف سوا سو سال سے رائج ہے۔ اور یہ کہ 'سے'، ان دیگر لغات سے ڈھل کر بنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصدری 'سے'، اردو میں ٹھیک اسی وقت سے موجود ہے جب سے اردو کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کی اردو میں بھی اور دکنی اردو میں بھی۔ ایسی صورت میں 'سے'، کو دوسری لغات سے ماخوذ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ دوسری لغات پاس پڑوس کی بولیوں اور زبانوں کے اثرات سے اردو میں در آئیں اور وقت گزرنے کے ساتھ متروک ہوتی گئیں۔ 'سے'، اردو کی اپنی لغت ہے، بالکل ابتدا ہی سے استعمال ہوتی رہی اور آج بھی اسی اصل شکل میں موجود ہے جب کہ دوسری تمام لغات اردو زبان سے خارج کر دی گئیں۔

دکنی کے اثر سے یہ مترادف لغات شمالی ہند کی اردو میں بھی راہ پا گئیں۔ چنانچہ شاہ نجم الدین مبارک آبرو، سراج الدین علی خان آرزو، ظہور الدین حاتم، فائز، تاباں، اسمٰعیل امروہوی، محمد افضل جھنجھانوی، مفتی اور چندر بھان برہمن وغیرہ کے یہاں سیں، سیتی، تے، تھے، سوں، ستے، ستی اور سے وغیرہ کا استعمال ملتا ہے۔ سودا کے عہد تک سیتی اور ستی رائج تھا۔ 'سے' کی قدامت کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ اکبر کے عہد میں گنگ کوی نے "چند چھند برنن کی مہیما" لکھی جو کھڑی بولی (ہندی، اردو) میں لکھی گئی۔ اس میں 'سے'، اپنی موجودہ شکل میں استعمال ہوا ہے۔ امیر خسرو کے ہندی (اردو) کلام میں بھی اس کا استعمال ملتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں پرتھی راج کے لکھے ہوئے ایک پروانے میں بھی (جس کا نمونہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو" میں دیا ہے) 'سے'، کے استعمال کا سراغ ملتا ہے۔

شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ 'تے'، پنجابی یا برج سے سولہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ دکنی اردو میں آیا۔ وہ 'تیں'، پنجابی یا گجراتی سے۔ ہماری زبان کا اصل کلمہ 'سے' یا 'سیں' ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 'سے' یا 'سیں' کی اصل सम (سَمّ) ہے۔ جو سنسکرت متعلق فعل समं سے ماخوذ ہے۔ اس کا ایک روپ 'سن' सन بھی تھا۔ 'سم' یا 'سن' کے معنے 'ساتھ' کے ہیں۔ اول اول 'سے'، اردو میں یہی معنے دیتا تھا۔

علامتِ مفعول 'کو' کے سلسلے میں بعض لسانیین اس مغالطے میں ہیں کہ قدیم اردو میں فاعل اور مفعول دونوں کے لیے علامتِ مفعول کی جگہ علامتِ فاعل ہی مستعمل تھی۔ لیکن مقالے میں قدیم اردو سے جو لسانی شواہد درج کیے گئے ہیں ان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ فاعلی علامت کے طور پر 'نے'، مستعمل تھا اور مفعولی علامت کے طور پر 'کو'۔ مزید برآں اردو میں 'کو'، کا وجود اسی قدر قدیم ہے جتنا 'نے' کا وجود۔ 'نے' اور 'سے'، کی طرح یہ بھی اردو کی اپنی چیز ہے اور قدیم سے آج تک اسی صورت میں مستعمل ہے۔

'کو' کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے بیمز اور ہورنلے نے اسے "ککشم" سے ماخوذ بتایا ہے۔ ڈاکٹر ٹرمپ نے "کرتے" سے اور مولوی عبدالحق نے "کاکھشے" سے۔ شیام سندر داس کے نزدیک یہ "اکھاکم" سے ماخوذ ہے جو اکھاکم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ "آکم" یا "کم" صورت بدل کر 'کو' ہو گیا۔ 'م' عام طور پر غنہ سے بدل جاتا ہے غالباً یہی سبب ہے کہ قدیم اردو میں 'کو' غنہ کے اضافے کے ساتھ "کوں" لکھا ہوا ملتا ہے بعد میں یہ غنہ گر گیا 'کو' رہ

"میں" حروفِ ربط میں سے ایک حرف ہے اور ظرفی حالت پر دلالت کرتا ہے۔ دکنی میں اس کے علاوہ بہت سی دوسری لغات بھی مستعمل تھیں مثلاً ماں، مانہہ، منہہ، مینے، مینں، موں، مانہیں، ماہیں، مانجھ وغیرہ۔ ان میں سے مانہہ، میں، ماں، ماہیں، موں اور مانجھ، ہریانی میں بھی مستعمل رہیں۔ برج بھاشا میں مدھے اور مدھیہ استعمال ہوئی ہیں۔ قنوجی میں مدھے - مدھیہ - مدھیہ اور مدھے کا سراغ ملتا ہے۔ جب کہ ہندی یا اردو میں مدھے استعمال ہوا ہے۔

دکنی میں مذکورہ بالا تمام لغات کا استعمال ملتا ہے البتہ بحری اور ولی کے دور تک آتے آتے ان لغات کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی ہے چنانچہ بحری اور ولی کے یہاں مینے، مینں اور میں استعمال ہوا ہے۔ شمالی ہند میں امیر خسرو اور کبیرداس وغیرہ کے یہاں صرف "میں" کا استعمال ملتا ہے البتہ اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں میں "میں" کے علاوہ مینے، مینں اور موں بھی استعمال ہوا ہے۔ افضل جھنجھانوی اور فائز دہلوی کے یہاں "میں" کے علاوہ "مینں" بھی ملتا ہے۔ "پرتھی راج راسا" میں مدھ، ماں اور ماہی کا استعمال "میں" کے پہلو بہ پہلو ہوا ہے۔ شیام سندر داس نے "پرتھی راج راسا" میں "مجھ" کی نشاندہی بھی کی ہے۔ پرتھی راج کے پروانے میں "میں" کا استعمال ملتا ہے۔ نام دیو جی کے نام سے جو شبد گرو گرنتھ اور اردو میں درج ہیں ان میں "میں" کے علاوہ "من" کا استعمال بھی ملتا ہے۔ اسی کتاب میں بھگت کبیر جی کے نام سے جو شبد نقل ہیں ان میں "ماہیں" اور "ماہی" کا استعمال بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ سہیل بخاری کا کہنا ہے کہ اردو کے پورے جملے اور فقرے ہمیں پہلی بار بھگتوں کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان میں مرہٹی شاعر گیانیشور کو اردو کا پہلا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ گیانیشور کے یہاں "میں" بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ہی سطر میں "موں" بھی پہلو بہ پہلو استعمال ہوا ہے۔ گیانیشور کی چھوٹی بہن مکتابائی مرہٹی بولی کی شاعرہ تھی۔ اس کا جنم شک سمبت ۱۲۰۱ مطابق سنہ ۱۲۷۹ عیسوی بتایا گیا ہے۔ اس کے شعروں میں کھڑی بولی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کے کلام میں بھی "میں" کا استعمال موجود ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "ھمیر راسو" سے ایک نمونہ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں نقل کیا ہے۔ "ھمیر راسو" شارنگ دھر سے منسوب ہے اور ہندی ادبیات کے ویرگاتھا (گاتھا سے مراد ہیروکرت ہوتی تھی) عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نمونہ سنہ ۱۳۱۴ عیسوی کا ہے۔ اس میں "مانہہ" استعمال ہوا ہے۔ لیکن پرتھی راج کے پروانے اور "پرتھی راج راسا" میں جو اس سے زیادہ قدیم ہیں، ظرفی "میں" موجود ہے۔

اس مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ظرفی "میں" بالکل ابتدا ہی سے اردو میں اپنی موجودہ صورت میں مستعمل رہا ہے البتہ اس

اس کے ساتھ ساتھ دوسری لغات بھی برابر استعمال ہوتی رہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ دوسری لغات 'میں' کا ماخذ نہیں اگر ایسا ہوتا تو 'میں' اردو کے دستیاب نمونوں میں زمانۂ قدیم سے نہ ملتا بلکہ بعد میں وجود میں آتا۔ یہ دوسری لغات 'میں' سے ماخوذ اس لیے نہیں کہی جا سکتیں کہ اگر ایسا ہوتا تو ماخذ کو مٹ جانا چاہیے تھا اور صرف اس کے نکھرے ہوئے روپ کو آخر میں برقرار رہنا چاہیے تھا۔ لیکن ابتداء سے اب تک 'میں' کا استعمال ملنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اردو کی اپنی چیز ہے اور اس زبان میں جس پر اردو کی بنیاد ہے یہ موجود تھا۔ لہٰذا یہ آج تک برقرار ہے۔ جب کہ دوسری لغات بتدریج متروک ہو گئیں۔ کیونکہ وہ پاس پڑوس کی زبانوں کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔

بیمز، ہورنلے اور بھنڈارکر نے 'میں' کو سنسکرت "مدھیے" سے نکالا ہے اور اس کے ارتقائی مراحل یہ لکھے ہیں: مدھیے۔ مجھّے۔ ماجھے۔ ماھے۔ ماہیں۔ ماہیں۔ میں۔ وہٹنے نے اپنی تصنیف سنسکرت گرامر میں ظرفی حالت کے سلسلے میں Made ahin (مدَاہِم) اور e'mam (امِّم یا اِمام) کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ Made ahin رگ وید میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی ایک صورت انہوں نے Madhyam (مدھیم) بھی لکھی ہے۔

"مدھیم" کے بارے میں آر ایل ٹرنر نے لکھا ہے کہ مہابھارت میں یہ بیچ یا درمیان Among کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی چند اور لغات بھی انہوں نے قدیم کتب کے حوالے سے نقل کی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) Madhye (مَدھیَہ) رگ وید میں۔

(۲) Madhyena (مَدھیِنا) شاستر ابر ہمنا میں۔

(۳) Madhye (مدھیے) منو کا دھرم شاستر میں۔

یہ تینوں لغات اپنے معنوں میں استعمال ہوئی ہیں جن میں ظرفی 'میں' استعمال ہوتا ہے۔ کیلاگ نے لکھا ہے کہ 'میں' اور وہ تمام لغات جن میں 'نون' ہے 'مدھیے' سے ماخوذ نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک ان سب کا ماخذ "مدھیم" ہے۔ کیونکہ م عام طور پر غنہ سے بدل جاتا ہے۔

حروف ربط میں سے ایک حرف 'تک' بھی ہے۔ دکنی میں اس کے علاوہ لگ، لگوں اور لگن بھی استعمال ہوا ہے۔ "لگن" بالخصوص ملا وجہی نے "سب رس" میں استعمال کیا ہے۔ 'لگ' کو بعض اوقات صرف ایک کشش کے ساتھ "لک" لکھا گیا ہے۔ اس پر بطور سابقہ اب، تب، جب وغیرہ لگا کر اب لگ، جب لگ، تب لگ وغیرہ لکھتے تھے اور اس کی مختلف صورت

تلک اور جلک بھی مستعمل تھی۔ شمالی ہند میں اسمٰعیل امروہوی، فائز، تاباں اور فضلی کی "کربل کتھا" میں بھی 'لگ' کا استعمال ملتا ہے۔ "لگن" البتہ استعمال نہیں ہوا۔ قدیم اردو میں ان دیگر لغات کے پہلو بہ پہلو 'تک' اور 'تلک' کا استعمال بالکل ابتدا ہی سے ملتا ہے۔ بعد میں دیگر لغات متروک ہو جاتی ہیں اور حرف 'تک' اور 'تلک' باقی رہتا ہے جو اب بھی مستعمل ہے۔ شمالی ہند میں 'لگ' کا استعمال دکنی اثر سے آیا۔ دکن میں یہ لغات غالباً آس پاس کی بولیوں سے آئی ہوں گی۔

'تک' کے ماخذ سے بحث کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ لگ، تلک، تک، تینوں معنی اور اصلیت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان میں اصل اور بنیادی حصہ 'لگ' ہے۔ جو سنسکرت "لگن" سے ماخوذ ہے۔ "لگن" سب رس میں استعمال ہوا ہے۔

ظرفیت کے لیے 'میں' کے علاوہ 'میں' اور 'پہ' بھی استعمال ہوتا ہے۔ دکنی اور شمالی ہندی اردو میں اس کا استعمال تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ البتہ دکنی میں اس کے ساتھ ساتھ کہیں 'پر' بھی 'میں' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بھنڈارکر نے 'پہ' کا ماخذ "پارشو" بتایا ہے اور اس کے مدارج یہ بیان کیے ہیں: پارشو- پاس- پاہ- پہ۔ ہورنلے 'پر' کا ماخذ 'پرے' کو قرار دیتے ہیں۔ جو سنسکرت میں 'پرے' اور اپ بھرنش میں 'پر' تھا۔ شوکت صاحب اس خیال سے متفق نہیں۔ بیمز، اودھ اور کیلاگ کی رائے میں 'پر' سنسکرت उपरि (اُپَرِی) سے مخرج ہے۔ اُپری- اُوپر- پر۔ آر ایل ٹرنر کی رائے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی "قواعد اردو" میں اسی خیال سے اتفاق کیا ہے۔ اُپری کی 'ی'، تخفیف و تسہیل کی نذر ہو گئی تو 'اُپر' باقی رہا۔ دستیاب ادب کے قدیم نمونوں میں بھی "اُپر" استعمال ہوا ہے اب بھی ہوتا ہے۔ 'اُپر' میں الف کا پیش (ضمہ) اشباع کی وجہ سے 'و' سے بدل گیا تو 'اوپر' ہوا جو مخفف صورت میں 'پر' ہے۔ جو آج بھی مستعمل ہے۔

حروفِ اضافت اردو میں واحد مذکر کے لیے 'کا'، مونث کے لیے 'کی'، جمع اور امالے کی صورت میں بدل کر 'کے' ہو جاتا ہے۔ قدیم ادب میں یہ استعمال اسی طرح موجود ہے۔ ان کی مترادف لغات کے طور پر 'کیرا'، 'کیری' اور 'کیرے' بھی استعمال ہوئے ہیں۔ خواجہ فریدؒ گنج شکر کے ایک قول "پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے" میں بھی 'کا' موجودہ صورت میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ان کے اس مصرع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا: "اساکیری یہی سو ریت"

گویا 'کا' اور 'کیری' (مذکر کیرا) یکساں قدیم ہیں۔

لسانیین کا خیال ہے کہ پراکرت میں "کیر کو" اور "کیر ــ و" بطور لاحقۂ اضافت استعمال ہوئے ہیں اور اردو "کا"
کی طرح تذکیر و تانیث کے اعتبار سے ان میں تبدیلیاں بھی آئی ہیں۔ "کیر ــ و" سے "کیرو" اور "کیرے" سے "کیری"
وجود میں آئے۔ یہ روپ چند بردائی کے "راسو" میں ہے۔ تلسی داس کے یہاں "کر" اور "کر" استعمال ہوئے ہیں۔
شوکت سبزواری کے خیال میں یہ ہی کیر اور کیری سے وجود میں آئے۔ ان کا آخری روپ "ک" ہے جو جائسی کے
یہاں استعمال ہوا ہے۔ اس لاحقے کے مختلف سلسلے وار تغیرات یہ بتائے گئے ہیں:-

کیر کو - کیر ــ و - کیرو - کیر - کر - ک - کا

شوکت صاحب کے خیال میں اردو میں علامتِ اضافت "ک" ہے جس کی تین حالتیں ہیں۔ "کا" واحد مذکر کے لیے
"کی" واحد مونث کے لیے، "کے" جمع مذکر کے لیے۔ لسانیین کے نزدیک "کا" سنسکرت "کاریہ" سے ماخوذ ہے۔
شوکت سبزواری بھی اسی خیال کے موئید ہیں۔

"نے" کے نحوی استعمالات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ "نے" اردو میں فاعل کی علامت ہے۔ قدیم اردو ادب
میں بھی یہ اپنی معنوں میں تسلسل کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ "نے" حروفِ عاملہ میں سے ایک حرف بھی ہے۔ اس کا اثر
یہ ہوتا ہے کہ جس جملے میں فاعل پر "نے" داخل کیا جائے اس میں فعل کا تعلق فاعل سے منقطع ہو کر مفعول کے ساتھ
قایم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم اردو میں یہ تغیر دیکھنے میں آتا ہے کہ (۱) فاعل پر بعض جگہ "نے" داخل نہیں کیا
جاتا جب کہ اس کا استعمال ہونا چاہئے تھا (یعنی "نے" محذوف ہوتا ہے)۔ (۲) فاعل پر بعض جگہ ایسے موقعوں پر "نے"
داخل کر دیا جاتا ہے جہاں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (۳) تیسرے یہ کہ فاعل پر "نے" آجانے کے باوجود فعل کا تعلق
فاعل سے منقطع ہو کر مفعول کے ساتھ قایم نہیں ہوتا بلکہ بدستور فاعل کے ساتھ قایم رہتا ہے اور فعل تذکیر و تانیث ا
واحد و جمع کے اعتبار سے فاعل سے مطابقت رکھتا نظر آتا ہے۔ استعمال ہند میں البتہ یہ تغیرات نظر نہیں آتے۔

فعل و فاعل کی مطابقت کے سلسلے میں اردو کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جب فاعل پر "نے" آتا ہے تو فعل کا تعلق
فاعل سے منقطع کر کے مفعول کے ساتھ قایم کر دیتا ہے اور فعل تذکیر و تانیث و وحدت و جمعیت کے اعتبار سے اس کی مطابقت کرتا
ہے۔ اردوئے قدیم میں یہ صورت نہیں تھی اور فعل کا تعلق "نے" کے آجانے کے باوجود بدستور فاعل کے ساتھ قایم رہتا
تھا اور ہر اعتبار سے فعل، فاعل ہی کی مطابقت کرتا تھا۔ نیز اردو کا موجودہ قاعدہ یہ ہے کہ فاعل اگر جمع مونث ہو

فعل اصلی واحد ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کے ساتھ فعلِ امدادی جمع لاتے ہیں۔ لیکن قدیم اردو میں اس کے برعکس فاعل اگر جمع مونث ہو تو فعلِ اصلی بھی جمع لایا جاتا تھا۔ دکنی میں اس کی مثالیں عام ہیں البتہ شمالی ہند میں یہ تغیر صرف ابتدائی دور میں کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔

مضاف اور مضاف الیہ کا عام قاعدہ یہ ہے کہ مضاف الیہ، مضاف پر مقدم ہوا کرتا ہے لیکن اس کے برعکس بھی روا ہے۔ قدیم اردو میں بھی یہ استعمال اسی طور پر ہے سوائے اس کے، کہ حروفِ اضافت کا، کی، کے، کے پہلو پہلو ان کی مترادف لغات کیرا، کیری اور کیرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ قاعدہ یہ بھی ہے کہ مضاف الیہ اگر جمع مونث ہو تو حرفِ اضافت واحد ہی استعمال ہوتا ہے لیکن قدیم اردو، بالخصوص دکنی میں یہ تغیر نظر سے گزرتا ہے کہ مضاف الیہ جمع مونث ہو تو اس کی مطابقت میں حرفِ اضافت بھی جمع مونث لایا جاتا تھا۔

صفت موصوف کا عام نحوی قاعدہ یہ ہے کہ صفت کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت، موصوف کے مطابق ہوتی ہے۔ مگر جب موصوف جمع مونث ہو تو صفت واحد آتی ہے۔ پنڈت کیفی نے اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو میں جب موصوف مونث اور جمع ہو تو صفت کا کلمہ وہی رہے گا جو مفرد مونث کے لیے ہے۔ جب کہ مذکر کی صورت میں صفت کا کلمہ بھی جمع بن جاتا ہے۔ قدیم اردو بالخصوص دکنی میں یہی قاعدہ موصوف جمع مونث پر بھی روا تھا۔ چنانچہ اگر موصوف جمع مونث ہوتا تو اس کی مطابقت میں صفت بھی جمع مونث لائی جاتی تھی۔ شمالی ہند میں بھی میر و مرزا کے عہد تک اس استعمال کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ تاہم قدیم اردو میں موجودہ قاعدہ بھی مفقود نہیں تھا۔

جمع کے قاعدے کے تحت اسم جمع سے بحث نہیں کی گئی ہے کیونکہ اسم جمع، بذاتِ خود واحد ہوتے ہوئے کسی شے یا اشخاص کے مجموعے پر دلالت کرتا ہے۔ لہذا مقالے میں صرف ان قاعدوں کا جایزہ لیا گیا ہے جو واحد اسم کی جمع بنانے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

اردو میں اسم کی دو قسمیں ہیں واحد اور جمع۔ اصل کے اعتبار سے اسم کی دو حالتیں ہیں ایک فاعلی یا قایم اور دوسری غیر فاعلی یا محرف۔ دونوں حالتوں میں جمع کے قاعدے بدل جاتے ہیں۔ کسی اسم کی جمع بنانے کے قاعدے حسبِ ذیل ہیں:

(۱) وہ مونث اسما جن کا آخری حرف، حرفِ صحیح ہو جیسے رات۔ بات۔ عورت وغیرہ۔ فاعلی حالت میں ان کی جمع "یں" بڑھا

کر بنائی جاتی ہے۔ جیسے رات، راتیں۔ بات، باتیں۔ عورت، عورتیں۔

(۲) وہ مونث اسماجن کے آخر میں "ی" ہے جیسے لڑکی، گھوڑی وغیرہ۔ ان کی جمع "ان" کے اضافے سے بنتی ہے جیسے لڑکی سے لڑکیاں۔ گھوڑی سے گھوڑیاں وغیرہ۔

(۳) مذکر اسماجن کے آخر میں "ا" یا "ہ" ہے جیسے گھوڑا، کتا، نامہ، بچہ وغیرہ۔ فاعلی حالت میں ان کی جمع یائے مجہول (ے) کے اضافے سے بنتی ہے۔ جیسے گھوڑا، گھوڑے۔ کتا، کتے۔ نامہ، نامے۔ بچہ، بچے وغیرہ۔

غیر فاعلی حالت میں مندرجہ بالا تمام قسم کے اسما کی جمع "وں" کے اضافے سے بنائی جاتی ہے مثلاً راتوں کو۔ باتوں میں لڑکیوں کی۔ گھوڑیوں نے۔ کتوں، ناموں، بچوں وغیرہ۔

قدیم اردو میں قسم اول کی جمع بھی "ان" کے اضافے سے بنتی تھی۔ جیسے راتاں۔ باتاں۔ عورتاں۔ نیز ان تمام افعال، حروف اور صفات وغیرہ کی جمع بھی اسی نہج پر بنائی جاتی تھی جن کے آخر میں "ی" ہے۔ جیسے کرتی سے کرتیاں بہتی سے بہتیاں۔ سہتی، سہتیاں۔ تھی، تھیاں۔ چلی، چلیاں۔ بھلی، بھلیاں۔ لڑکی، لڑکیاں۔ گی سے گیاں۔ اچھی سے اچھیاں۔ کی سے کیاں۔ رنگ برنگی سے رنگ برنگیاں۔

جمع کا یہ قاعدہ پنجابی، سندھی، مارواڑی، مشرقی ہندی میں بھی ہے اور اس لحاظ سے قدیم ہے کہ اس کا جوڑ سنسکرت لاحقۂ جمع (بےجنس) "انِ" مکسور سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن شوکت سبزواری کا کہنا ہے کہ اردو کے گہرے تاریخی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ان" کی جمع اردو میں "وں" کی جمع سے زیادہ قدیم نہیں۔

قدیم اردو کے مطالعے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، مقالے میں مثالیں درج کی جا چکی ہیں۔ چنانچہ ان کی جمع انوں جن کی جنوں، سب کی سبوں، تن کی تنوں وغیرہ بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ ہم کی جمع ہموں اور تم کی تموں بھی نظر آتی ہے۔

"ان" سے جمع بنانے کے قاعدے کا ذکر کرتے ہوئے شوکت سبزواری نے "داستانِ زبانِ اردو" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ قاعدہ اردو کا قدیمی قاعدہ نہیں۔ بعد کی پیداوار ہے۔ فارسی سے یہ اردو میں آیا۔ اہلِ اردو نے اسے اول اول عربی فارسی الفاظ تک محدود رکھا، اہلِ دکن نے غالباً راجستھانی کے زیرِ اثر اس قاعدے کو عام کر دیا۔ وہ ہندی لفظوں پر بھی یہ عمل کرنے لگے اور پہاڑ کی جمع پہاڑاں اور بات کی باتاں بنانے لگے۔ اردو میں "ان" کے عام طور سے رواج پا جانے کے بعد جمع کے قاعدوں میں ناہمواری اور ایک طرح کی ابتری رونما ہوئی۔ کہیں "وں" سے جمع بنائی گئی،

کہیں "اں" سے، کہیں "یں" سے اور کہیں حرف "ے" سے۔ یہ زبان کی سادگی اور اصول پسند مزاج کے خلاف تھا۔ اردو نے ان میں کاٹ چھانٹ کی۔ چنانچہ "اں" "ی" پر ختم ہونے والے مونث اسما کے ساتھ مخصوص ہوا۔ باقی مونث اسما کی قایم حالت میں "یں" سے جمع بنی اور مذکر اسما کی محض "ے" سے۔ بشرطیکہ وہ الف پر ختم ہوں۔ غیرہ صورت میں تمام اسما، مذکر ہوں یا مونث، الف پر ختم ہوتے ہوں یا "ی" پر "وں" کے اضافے سے جمع بنائے گئے۔ اب یہ اردو کا قاعدہ کلیہ ہے۔

"اردو صرف و نحو کے تغیرات" کا تاریخی ترتیب کے ساتھ یہ مطالعہ واضح کرتا ہے کہ زبان اپنے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے سادہ، آسان، مختصر اور منضبط ہوتی گئی۔ جہاں ایک لفظ کی کئی کئی مترادف لغات مستعمل تھیں وہاں ان فالتو اور غیر زبانوں سے راہ پا جانے والی لغات کو چھانٹ دیا گیا اور صرف ایک لغت کو جو اپنی زبان سے متعلق تھی، برقرار رکھا۔

حروف و افعال کے استعمال کے سلسلے میں جو ابتری و بے ربطی تھی (مثلاً "نے" کے استعمال، افعال کی جمع بر تناؤ وغیرہ) اسے اصول و قواعد کے تحت منضبط کیا گیا۔ "نے" کو بعض اوقات محذوف کر دیا جاتا تھا اس کا استعمال لازم قرار دیا گیا۔ افعال میں جمع مونث کے صیغے کو ترک کر دیا گیا۔ ماضی مطلق میں "کر" اور "کے" کہیں مذکور ہوتا تھا کہیں محذوف، اس کے استعمال کو لازم قرار دیا گیا۔ ماضی مطلق میں دکنی ایک یائے زائد استعمال کرتی تھی اسے گرا دیا گیا اور مادہ فعل پر حرف الف کے اضافے سے ماضی مطلق بنانے کا قاعدہ برقرار رکھا گیا۔ مضارع میں ایک واؤ زائد مستعمل تھا اسے گرا دیا گیا صرف "ے"، "جائے" کو قایم رکھا گیا۔

ضمائر شخصی میں بھی تراش خراش کا یہ عمل ہوا۔ چنانچہ ضمیر جمع غائب کے صیغے میں "وے" (صیغہ جمع) کو متروک کر دیا اور صرف "وہ" کو دونوں (واحد و جمع غائب) صیغوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ متکلم و حاضر کے صیغوں میں واحد کے لیے "میں" اور جمع کے لیے "ہم" کو، حاضر میں واحد کے لیے "تو" اور جمع کے لیے "تم" کو برقرار رکھا۔ بقیہ لغات ہوں، ہمن، ہمناں، ہموں، تون، تیں، تمن، تمنا، تموں وغیرہ کو خارج کر دیا گیا۔ اختصار کا یہ عمل ضمائر کی غیر فاعلی حالتوں (اضافی، مفعولی، مجروری، ۲ ل وغیرہ) پر بھی کیا گیا چنانچہ ان کے صیغے بھی مختصر ہو گئے اور فالتو لغات متروک ہو گئیں۔

انشا کا کہنا ہے کہ فصحا کے نزدیک ضمائر کی میزان ۳۵ ہے۔ غیر فصیح ۳۶ بتاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ضمیر منفصل غائب فاعل کے لیے جمع میں 'وے' قرار دیتے ہیں۔ یہ 'وے' اب متروک ہے لہٰذا ضمائر کی تعداد پینتیس رہ جاتی ہے۔ جیسپرسن نے ایک مقام پر انگریزی ضمائر سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کچھ غیر آریائی اور غیر سامی زبانیں ایسی ہیں جو غائب کی ضمیروں میں بھی تذکیر و تانیث کا فرق نہیں کرتیں اور He اور SHE دونوں کے لیے ایک ضمیر استعمال کرتی ہیں۔ جیسپرسن نے اسے ان زبانوں کی شستگی اور شائستگی قرار دیا ہے۔ اس معیار سے دیکھیں تو اردو شائستگی میں ایک قدم آگے ہے کہ وہ غائب کی ضمیر میں جنس کے ساتھ ساتھ عدد کا فرق بھی روا نہیں رکھتی۔ مذکر و مونث واحد و جمع سب کے لیے 'وہ' استعمال کرتی ہے۔ حاضر اور متکلم کے صیغوں میں البتہ واحد و جمع کی تفریق ہوتی ہے لیکن جنس کی نہیں۔

صرفی تغیرات کے مقابلے میں زبان کے نحوی قاعدوں میں تغیر کم ہوا۔ قدیم اردو میں فاعل پر 'نے' آنے کے باوجود فعل بدستور فاعل ہی کی مطابقت کرتا تھا۔ بعد میں اس کا قاعدہ منضبط ہو گیا کہ 'نے' چونکہ حرفِ عاملہ بھی ہے لہٰذا اس کے اثر سے فعل کا تعلق فاعل سے منقطع ہو کر مفعول کے ساتھ قائم ہو جائے گا اور فعل اپنی وحدت و جمعیت اور تذکیر و تانیث کے اعتبار سے فاعل کے بجائے مفعول کی مطابقت کرے۔

صفت موصوف کے سلسلے میں ایک بے قاعدگی روا تھی کہ اگر موصوف جمع مونث ہوتا تو صفت کو بھی جمع مونث لایا جاتا، یہ استعمال ترک کر دیا گیا اور یہ اصول متعین کر دیا گیا کہ صفت میں جمع کا صیغہ صرف موصوف مذکر جمع کے لیے آئے گا۔ اگر موصوف جمع مونث ہو تو صفت واحد استعمال ہو گی۔

جمع کے قواعد میں ایک قسم کی برہمی اور ابتری پائی جاتی تھی اسے قاعدوں کے تحت منضبط کر لیا گیا اور بعض حروف اسما اور افعالِ معاون و افعالِ اصلی کی جمع کو متروک کر دیا گیا۔ چنانچہ کیاں، گیاں، تھیاں، اتھیاں، کرتیاں، رہتیاں، بیٹھیاں وغیرہ کو ترک کر دیا گیا۔ زبانِ اردو کے مخصوص رجحان اختصار پسندی کے تحت انہیں مختصر کر لیا گیا او فالتو سابقے و لاحقے اور حروفِ زائد چھانٹ دیے گئے۔ فاعل جمع مونث کی صورت میں فعلِ اصلی کی جمع کا چلن ترک کر دیا اور فعلِ اصلی واحد اور فعل معاون اس پر صیغۂ جمع اضافہ کر کے استعمال کرنے کا قاعدہ منضبط کیا گیا۔ اس طرح ہر اعتبار سے افعال، اسما، حروف، صیغے، ضمائر، مختصر سے مختصر، کم تر، سادہ اور آسان ہوتے گئے۔

جیسپرسن کا کہنا ہے کہ قریب قریب ہر زبان میں تبدیلی کا رخ سادگی اور آسانی کی طرف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

آریائی زبانوں کے قدیم ادوار کا جدید ادوار سے مقابلہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ زبان کے جدید ادوار کی صرفی شکلیں مختصر، کم تر (تعداد میں کم)، سادہ، باقاعدہ اور کسی قدر عام ہیں۔ اس کے مقابلے میں قدیم دور کے صیغے اور ان کی صورتیں طویل اور پیچیدہ، بے قاعدہ اور غیر متعین ہیں۔ یہ اصول تمام زبانوں میں تفاوتِ درجات کے ساتھ کارفرما رہا ہے۔

زبانوں کے ارتقائی مدارج کے جائزے کے بعد یسپرسن جس نتیجے پر پہنچا اسے سامنے رکھتے ہوئے اردو زبان کا، اس کے صرفی و نحوی تغیرات کے حوالے سے جائزہ لیں تو اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

کتابیات

نام مصنف	نام کتاب	مقام طباعت	سن طباعت
۱۔ فخرو بن نظامی مرتبہ (ڈاکٹر جمیل جالبی)	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	انجمن پریس، کراچی	سنہ ۱۹۷۳ء
۲۔ خواجہ گیسو درازؒ (منسوب) مرتبہ (تحسین سروری)	معراج العاشقین	دکن دارالاشاعت کراچی	سنہ ۱۹۶۱ء
۳۔ شمس اللہ قادری (مؤلف)	اردوئے قدیم	نولکشور پریس۔ لکھنؤ	سنہ ۱۹۳۰ء
۴۔ محی الدین قادری زورؔ	دکنی ادب کی تاریخ	نشاط پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۰ء
۵۔ قلی قطب شاہ مرتبہ (محی الدین زورؔ)	کلیاتِ قلی قطب شاہ	اعظم اسٹیم پریس۔ دکن	سنہ ۱۹۴۰ء
۶۔ مولوی عبدالحق	اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۷۷ء
۷۔ حسن شوقی مرتب (ڈاکٹر جمیل جالبی)	دیوانِ حسن شوقی	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۷۱ء
۸۔ مُلا وجہی مرتب (مولوی عبدالحق)	مثنوی قطب مشتری	انجمن ترقیٔ اردو۔ کراچی	سنہ ۱۹۵۳ء
۹۔ مُلا وجہی مرتب (مولوی عبدالحق)	سب رس	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۷۷ء
۱۰۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی مرتب (سید مبارز الدین رفعت)	کلیاتِ شاہی	مسعود پرنٹنگ پریس۔ دہلی	سنہ ۱۹۶۲ء

مصنف	کتاب	مطبع	سنہ
۱۱۔ کمال خاں رستمی بیجاپوری، مرتب (شیخ چاند ابن حسین)	خاور نامہ	ایجوکیشنل پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۸ء
۱۲۔ ابنِ نشاطی، مرتب (شیخ چاند ابن حسین)	مثنوی پھولبن	انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کراچی	سنہ ۱۹۵۵ء
۱۳۔ ملا نصرتی (مرتبہ مولوی عبدالحق)	مثنوی گلشنِ عشق	انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کراچی	سنہ ۱۹۵۲ء
۱۴۔ ملا نصرتی، مرتب (ڈاکٹر جمیل جالبی)	دیوانِ نصرتی	مطبعِ قوسین۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۲ء
۱۵۔ قاضی محمود بحری، مرتب (ڈاکٹر سید محمد حفیظ)	کلیاتِ بحری	نولکشور پریس۔ لکھنؤ	سنہ ۱۹۳۹ء
۱۶۔ ولی دکنی، مرتب (سید نورالحسن ہاشمی)	کلیاتِ ولی	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۵۴ء
۱۷۔ اسمٰعیل امروہوی، مرتب (نائب حسین نقوی)	اردو کی دو قدیم مثنویاں	نقوش پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۹ء
۱۸۔ فائز دہلوی، مرتب (سید مسعود حسن رضوی ادیب)	دیوانِ فائز	عمدہ پریس۔ دہلی	سنہ ۱۹۴۶ء
۱۹۔ میر عبدالحئی تاباں، مرتب (مولوی عبدالحق)	دیوانِ تاباں	انجمن ترقیٔ اردو ہند، دکن	سنہ ۱۹۳۵ء
۲۰۔ شاہ ظہورالدین حاتم، مرتب (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)	شاہ حاتم حالات وکلام	جدید اردو ٹائپ پریس لاہور	سنہ ۱۹۷۴ء
۲۱۔ شاہ ظہورالدین حاتم، مرتب (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)	دیوان زادہ	جدید اردو ٹائپ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۵ء

مصنف	کتاب	مطبع	سنہ
۲۲- اثر مرتب (مولوی عبدالحق)	دیوانِ اثر	انجمن ترقیٔ اردو-انڈیا	-
۲۳- میر تقی میر باہتمام (کیسری داس)	کلیاتِ میر	مطبع نولکشور - لکھنؤ	سنہ ۱۹۴۱ء
۲۴- مفضل علی مفضلی مرتب (مالک رام و مختار الدین)	کربل کتھا	دیال پرنٹنگ پریس دہلی	سنہ ۱۹۶۵ء
۲۵- میر حسن	مثنوی سحر البیان	نامی پریس - لاہور	سنہ ۱۹۶۳ء
۲۶- میر شیر علی افسوس مرتب (کارکنانِ مجلسِ ترقیٔ ادب)	باغِ اردو	زرین آرٹ پریس- لاہور	سنہ ۱۹۶۳ء
۲۷- میر شیر علی افسوس مرتب (کلب علی خاں فائق)	آرائشِ محفل	زرین آرٹ پریس- لاہور	سنہ ۱۹۶۳ء
۲۸- میر امن مرتب (سلیم اختر)	باغ و بہار	حمایت الاسلام پریس- لاہور	سنہ ۱۹۶۸ء
۲۹- مرزا رفیع سودا مرتب (ڈاکٹر شمس الدین صدیقی)	کلیاتِ سودا	زرین آرٹ پریس - لاہور	-
۳۰- سید فخر الحسن ہاشمی	دلی کا دبستانِ شاعری	سرفراز پریس - لکھنؤ	سنہ ۱۹۶۵ء
۳۱- سید انشاء اللہ خاں انشا مرتب (خلیل الرحمٰن داؤدی)	کلیاتِ انشا	ریڈنگ پرنٹنگ پریس- لاہور	-
۳۲- سید انشاء اللہ خاں انشا مرتب (مولوی عبدالحق)	کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی	انجمن پریس - کراچی	سنہ ۱۹۷۵ء

مصنف	کتاب	مطبع	سنہ
۳۳۔ شیخ صالح محمد عثمانی، مرتب (پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر)	جامع الحکایاتِ ہندی	زرین آرٹ پریس۔ لاہور۔	—
۳۴۔ شاہ نصیر، مرتب (ڈاکٹر تنویر احمد علوی)	کلیاتِ شاہ نصیر	زرین آرٹ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۱ء
۳۵۔ خواجہ میر درد، مرتب (خلیل الرحمن داؤدی)	دیوانِ درد	زرین آرٹ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۲ء
۳۶۔ سرسید احمد خان، مقدمہ (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)	اسبابِ بغاوتِ ہند	مشہور پریس کراچی۔	سنہ ۱۹۵۷ء
۳۷۔ شوکت سبزواری	اردو زبان کا ارتقا	دی سٹی پریس۔ ڈھاکہ	سنہ ۱۹۵۶ء
۳۸۔ شیخ محمد خاں جالندھری	مصباح القواعد (حصہ صرف)	دارالادب۔ کراچی	—
۳۹۔ شیخ محمد خاں جالندھری	مصباح القواعد (حصہ نحو)	دارالادب۔ کراچی	—
۴۰۔ مولوی عبدالحق	قواعدِ اردو	جی ایف پریس۔ لاہور۔	—
۴۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	جامع القواعد (حصہ صرف)		
۴۲۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں	جامع القواعد (حصہ نحو)	نیو حبیب پرنٹنگ پریس لاہور	سنہ ۱۹۷۳ء
۴۳۔ مرزا اسداللہ خاں غالب	دیوانِ غالب۔	سویرا آرٹ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۵ء
۴۴۔ حافظ محمود شیرانی	پنجاب میں اردو	اشرف پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۲ء
۴۵۔ شوکت سبزواری	داستانِ زبانِ اردو	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۰ء
۴۶۔ پروفیسر عبدالسلام	شعر الہند	نامی پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۵ء
۴۷۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ہندوستانی لسانیات	منصور پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۱ء
۴۸۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	انجمن حمایت الاسلام پریس لاہور	سنہ ۱۹۶۷ء
۴۹۔ عباداللہ گیانی	گروگرنتھ اور اردو	سویرا آرٹ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۶ء

مصنف	کتاب	ناشر	سنہ
۵۰۔ شوکت سبزواری	لسانی مسایل	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۲ء
۵۱۔ محمد حسین آزاد	آبِ حیات	ناشر شیخ مبارک علی۔ لاہور	سنہ ۱۹۵۰ء
۵۲۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان	مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو	مطبع عالیہ۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۶ء
۵۳۔ حافظ محمود شیرانی	مقالاتِ شیرانی (جلد اول)	شفیق پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۶ء
۵۴۔ حافظ محمود شیرانی	تنقید پرتھی راج راسا	انجمن ترقیٔ ہند۔ دہلی	سنہ ۱۹۴۳ء
۵۵۔ سہیل بخاری	اردو کی کہانی	منظور پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۵ء
۵۶۔ سُنیتی کمار چیٹرجی مترجم (عتیق احمد صدیقی)	ہند آریائی اور ہندی	لبرٹی آرٹ پریس۔ دہلی	—
۵۷۔ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ	اردو نثر کا آغاز و ارتقا	سندھ آفسٹ پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۷۸ء
۵۸۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان	علمی نقوش	نشاط پریس۔ کراچی	—
۵۹۔ بنجمن شلزے مرتب (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)	ہندوستانی گرائمر	زرین آرٹ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۷ء
۶۰۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	ادب و لسانیات	باب الاسلام پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۷۰ء
۶۱۔ شوکت سبزواری حواشی (سید قدرت نقوی)	اردو قواعد	حق آفسٹ پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۸۲ء
۶۲۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری	اردو لسانیات	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۶ء
۶۳۔ سراج الدین علیخان آرزو	نوادر الالفاظ	انجمن ترقیٔ اردو۔ کراچی	سنہ ۱۹۵۱ء
۶۴۔ مولوی عبدالحق	قدیم اردو	انجمن پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۱ء
۶۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی	نقوشِ سلیمانی	باب الاسلام پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۷ء
۶۶۔ ڈاکٹر محمد باقر	اردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں)	پنجابی ادبی اکیڈمی پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۲ء

۶۷۔ محمد یحییٰ تنہا	سیر المصنفین	عالمگیر الیکٹرک پریس۔ لاہور۔	
۶۸۔ حافظ محمود شیرانی	مقالاتِ شیرانی (جلد دوم)	شفیق پریس۔ لاہور۔	سنہ ۱۹۶۶ء
۶۹۔ عبدالقادر سروری	اردو مثنوی کا ارتقا	مطبع عہد آفرین۔ حیدرآباد دکن۔	
۷۰۔ حافظ محمود شیرانی	پنجاب میں اردو	مکتبہ معین الادب۔ لاہور۔	
۷۱۔ مولوی عبدالحق	مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر	مطبع انجمن ترقیٔ اردو۔ اورنگ آباد دکن	سنہ ۱۹۳۳ء
۷۲۔ ضیاء الدین برنی	تاریخِ فیروز شاہی	بدر رشید پرنٹنگ پریس لاہور	سنہ ۱۹۸۳ء
۷۳۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (مرتب)	دہلی اردو اخبار	جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی	سنہ ۱۹۷۲ء
۷۴۔ میرامن دہلوی	گنجِ خوبی (ترجمۂ اخلاقِ محسنی)	ادبی پرنٹنگ پریس۔ بمبئی	سنہ ۱۹۶۴ء
۷۵۔ سونیا چرنی کووا	اردو کے چیخے	دارالاشاعت ترقی۔ ماسکو	-
۷۶۔ حامد حسن قادری	داستانِ تاریخِ اردو	ایجوکیشنل پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۶۶ء
۷۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی	تاریخِ ادبِ اردو (جلد اول)	زرین آرٹ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۵ء
۷۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی	تاریخِ ادبِ اردو (جلد دوم حصہ دوم)	مجلسِ ترقیٔ ادب۔ لاہور۔	-
۷۹۔ شاہ مبارک آبرو (نجم الدین) (مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن)	دیوانِ آبرو۔	یونین پرنٹنگ پریس۔ دہلی	-
۸۰۔ میر انیس مرتب (نائب حسین نقوی)	مراثیٔ انیس	علمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور	سنہ ۱۹۵۹ء
۸۱۔ ثناء الحق ایم اے۔	میر و سودا کا دور	جاوید پریس۔ کراچی	سنہ ۱۹۵۹ء
۸۲۔ میر حسن حسن	دیوانِ میر حسن	مطبع منشی نولکشور۔ لکھنؤ	
۸۳۔ غلام ہمدانی مصحفی مرتب (ڈاکٹر نورالحسن نقوی)	کلیاتِ مصحفی	مطبعِ عالیہ۔ لاہور	سنہ ۱۹۶۸ء
۸۴۔ آتش خواجہ حیدر علی۔ مرتب (سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی)	کلیاتِ آتش	مطبعِ عالیہ۔ لاہور	سنہ ۱۹۷۳ء

۸۵۔ ڈاکٹر علامہ اقبال — ضربِ کلیم — غلام علی پبلشرز - لاہور — سنہ ۱۹۷۶ء

۸۶۔ سعادت یار خان ناصر (مرتب مشفق خواجہ) — تذکرہ خوش معرکۂ زیبا — مطبعِ عالیہ - لاہور — سنہ ۱۹۷۲ء

۸۷۔ محمد شرف الدین یکتا — تذکرہ بہارِ سخن — محبوب پریس - حیدرآباد — سنہ ۱۹۶۲ء

۸۸۔ میر تقی میر — نکات الشعراء — انجمن پریس - کراچی — سنہ ۱۹۷۹ء

۸۹۔ حبیب ضیا — دکنی زبان کی قواعد — باب الاسلام پریس کراچی — سنہ ۱۹۶۹ء

۹۰۔ خلیل صدیقی — زبان کا ارتقا — قلات پریس - کوئٹہ — سنہ ۱۹۷۷ء

۹۱۔ حسین بانو بیگم حسین — ناسخ اور ان کے تلامذہ — قلمی مقالہ برائے پی ایچ ڈی - سندھ یونیورسٹی - غیر مطبوعہ

۹۲۔ ملک حسن اختر — شمالی ہند میں اردو شاعری — قلمی مقالہ برائے پی ایچ ڈی - پنجاب یونیورسٹی - غیر مطبوعہ

۹۳۔ خواجہ احمد فاروقی — اردوئے معلیٰ (قدیم اردو نمبر) — یونین پرنٹنگ پریس - دہلی - —

۹۴۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل — معراج العاشقین کا مصنف — حیدرآباد - دکن — سنہ ۱۹۶۸ء

۹۵۔ پروفیسر احسان الزماں — رسالہ "اردو" نے علامتِ فاعل؟ — انجمن ترقیٔ اردو - کراچی - — جنوری سنہ ۱۹۵۲ء

۹۶۔ مرزا جان طپش — کلیاتِ طپش کا دیباچہ — رسالۂ اردو — اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء

۹۷۔ ڈاکٹر گلکرسٹ — قواعدِ زبانِ اردو موسوم بہ رسالۂ گلکرسٹ — زرین آرٹ پریس - لاہور — سنہ ۱۹۶۲ء

۹۸۔ مخدوم سید محمد حسینی شہباز گیسو دراز — شکار نامہ — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۶۹ - نیشنل میوزیم - کراچی — -

۹۹۔ شیخ وجیہہ الدین گجراتی — تاج الحقایق — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۷۱ نیشنل میوزیم - کراچی — -

۱۰۰۔ خواجہ گیسو دراز — رسالۂ تصوف — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۴۲ - نیشنل میوزیم - کراچی — -

۱۰۱۔ باقر آگاہ — عقایدِ مذہبِ امامیہ — مخطوطہ نمبر م ۱/۸۹ - نیشنل میوزیم - کراچی — -

۱۰۲۔ شہاب الدین قریشی — بھوگ بل — مخطوطہ نمبر م ۱/۸۹ - نیشنل میوزیم - کراچی — -

۱۰۳۔ خواجہ گیسو دراز سے منسوب — معراج العاشقین — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۹۸-۱۰ - نیشنل میوزیم - کراچی — -

۱۰۴۔ شیخ داؤد حقیقی ۔ ہدایاتِ ہندی — مخطوطہ نمبر م ۱/۴۲۔ نیشنل میوزیم کراچی۔ -

۱۰۵۔ شاہ محمد حق نما۔ خزانۂ معرفت — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۲۵۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی -

۱۰۶۔ یقینؔ دکھنی ۔ فقہ المبین — مخطوطہ نمبر م ۱/۴۲۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی -

۱۰۷۔ شاہ برہان — رموز الواصلین — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۲۵۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی -

۱۰۸۔ شاہ علی جیو — جواہر الاسرار — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۸۴۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی -

۱۰۹۔ شاہ برہان الدین جانمؔ — کلمۃ الحقایق — مخطوطہ نمبر م ۱/۱۵۶۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی -

۱۱۰۔ سید میراں شیخ داول — شرح تمہیدِ ہمدانی — مخطوطہ نمبر م ۳/۶۹۱۔ نیشنل میوزیم۔ کراچی -

۱۱۱۔ سید علی محمد — "ے" کے قواعد — مطبوعہ مطبعِ شوکت الاسلام ۔ بنگلور ۔ سنہ ۱۹۱۲ء

13- John. T. Platts. A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English.
Oxford Press. London.

4. Otto Jespersen. Language, its Nature, Development and Origin.
Eleventh Impression, Unwin Brothers Limited. Woking & London.

5. George Grierson. Linguistic Survey of India. Volume IX
Calcatta Superintendent Government Printing, India. 1916

6. R. L. Turner. A Comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages.

7. Leonard Bloomfield. Language. (Indian Edition). Shri Jeinendra Press,
Delhi. 1963.

8. William Dwight Whitney. Sanskrit Grammar. Oxford University Press. 1950.

۱۱۹۔ گویاؔ۔ — دیوانِ گویا — مطبع نامی منشی نولکشور۔

۱۲۰۔ انسر صدیقی امروہوی — مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی — انجمن پریس۔ کراچی۔ — ۱۹۸۲ء

۱۲۱۔ مولوی عبدالحق — نصرتی — ایجوکیشنل پریس۔ کراچی۔ — ۱۹۶۱ء

۱۲۲۔ محمد باقر شمس — لکھنؤ کی زبان — ضیا برقی پریس۔ کراچی

۱۲۳۔ سید محسن علی محسن، مرتب (ڈاکٹر اقتدا حسن) — تذکرہ سراپا سخن — مطبع عالیہ۔ لاہور — —

۱۲۴۔ مفتی صدرالدین آزردہ — تذکرۂ آزردہ — انجمن پریس۔ کراچی — ۱۹۷۴ء

۱۲۵۔ ولیؔ دکنی۔ مرتب (محمد خان اشرف) — دیوانِ ولی (انتخاب) — استقلال پریس لاہور۔ — ۱۹۶۸ء

۱۲۶۔ سید ہاشمی فرید آبادی (مرتب) — تلخیص الاردو — انجمن پریس۔ کراچی۔ — ۱۹۵۲ء

۱۲۷۔ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ، مرتب (غلام رسول مہر) — خطوطِ غالب — علمی پرنٹنگ پریس۔ لاہور — ۱۹۶۲ء

۱۲۸۔ خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتب) — مجموعۂ نثرِ غالب اردو — مطبع عالیہ۔ لاہور — ۱۹۶۷ء

۱۲۹۔ رتن ناتھ سرشار۔ — فسانۂ آزاد — شرکت پرنٹنگ پریس۔ لاہور — ۱۹۸۴ء

۱۳۰۔ سید محسن علی محسن۔ — تذکرہ سراپا سخن۔ — مطبع عالیہ۔ لاہور — —

۱۳۱۔ شوکت سبزواری۔ — اردو لسانیات — انجمن پریس۔ کراچی — ۱۹۶۶ء

۱۳۲۔ خلیل صدیقی — زبان کا ارتقا — تلارت پریس۔ کوئٹہ — ۱۹۷۷ء

۱۳۳۔ پنڈت دتاتریہ کیفی — کیفیہ — انجمن ترقی اردو۔ پاکستان۔ کراچی — ۱۹۵۰ء

۱۳۴۔ حکیم سید احمد علی یکتا — دستور الفصاحت — ہندوستان پریس۔ رامپور — ۱۹۴۳ء

۱۳۵۔ سید انشاء اللہ خان انشا — دریائے لطافت (فارسی) — دارالناظر پریس۔ لکھنؤ — —